

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

اکرمُ التّفاسیر

قَالَ اَلَمْ

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

16

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ

اکرمُ التّفاسیر

قَالَ اَلَمْ

الشیخ مولانا امیر محمد اکرم اعوان مدظلہ العالی

16

بے شمار لوگوں کی اصلاح کا سبب بننے والی حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کی سمجھنے میں انتہائی آسان، فرقہ پرستی سے پاک اور موجودہ زمانہ کے مطابق لکھی ہوئی قرآن اردو تفسیر وٹس ایپ پر فری حاصل کریں۔

یاد رکھیں گناہ جہالت کا پھل ہوتا ہے اور یہ بڑی شرم اور بدبختی کی بات ہے اگر ہم ساری زندگی میں اتنا بھی نہ جان سکیں کہ قرآن میں لکھا کیا ہے۔ لیکن اب آپ کے پاس آسان طریقہ موجود ہے۔ قرآن کی تفسیر ہر وقت آپ کی جیب میں ہوگی اور آپ کو جب بھی دن میں فارغ وقت جہاں بھی حاصل ہو آپ کچھ صفحے روزانہ پڑھتے رہیں اس طرح کچھ ہی وقت میں آپ پورے قرآن کی تفسیر سمجھ سکتے ہیں جس سے آپ کے ہزاروں عقائد و اعمال کی اصلاح ہو کر شریعت کے مطابق ہو جائیں گے اور آپ کی دنیا اور آخرت دونوں جہاں بہترین ہو جائیں گے۔ ہر پارہ کی علیحدہ علیحدہ تفسیر موجود ہے۔



www.QuranTafseer.net

0092 323 520 5255

اپنے وٹس ایپ سے اوپر دیئے گے نمبر پر میسج کریں کہ آپ کو لکھی ہوئی تفسیر چاہیے۔ جبکہ ویب سائیٹ سے بھی آپ یہی تفسیر آڈیو، وڈیو اور تحریر کردہ حاصل کرسکتے ہیں۔

اپنے دوستوں رشتہ داروں سے یہ پوسٹ شئیر کر کے ڈھیروں ثواب حاصل کریں

از دلِ خیزد بر دلِ ریزد

اکثر احباب سوچتے ہوں گے اسرار التنزیل کے ہوتے ہوئے اکرم التفاسیر کے لکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس بارے میں عرض کردوں کہ نہ تو خود ثنائی کی پہلے کوئی تمنا تھی نہ اب ہے اور نہ ان شاء اللہ آئندہ ہوگی۔ نہ ہی یہ خیال دل میں آیا کہ مجھے کوئی بڑا عالم یا مفتی یا مفسرِ قرآن کہے نہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر کبھی اپنا وقت قربان کیا۔ ہاں! یہ خواہش ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم اور استاد المکرم حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ علیہ صاحب کی خصوصی توجہ سے جو علوم ومعارف عطا فرمائے انہیں اللہ تعالیٰ کی مخلوق تک پہنچاؤں اور اپنا فریضہ ادا کروں۔

ایک اور بات جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو اپنے وقتِ نزول سے تا حال اور آئندہ تا قیامت بلکہ اس سے بھی آگے حساب وکتاب، جنت ودوزخ کی بات کرتا ہے اور تمام انسانیت کو راہنمائی اور ہدایت فراہم کرتا آیا ہے اور ان شاء اللہ کرتا رہے گا۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں، قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب ہے اب اس کے بعد نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ رسول اور نہ ہی کوئی کتاب یا صحیفہ اس لیے کہ تمام مخلوق کے مسائل کا حل اس میں موجود ہے۔ ہر زمانے کے لوگ اپنے اپنے حالات کے مطابق استفادہ کرتے آئے ہیں، آئندہ بھی کرتے رہیں گے اور یہ خصوصیت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے کلام ہی کی ہو سکتی ہے۔ پہلے وقتوں میں آج کی طرح نقل وحمل و رسل و رسائل کے مواقع اتنے نہیں تھے اس لیے ایک سے دوسری جگہ علوم وایجادات پہنچنے میں سالہا سال لگ جاتے تھے۔

زمانہ حال کی جدید ایجادات اور خصوصاً الیکٹرانک ایجادات نے تو پوری دنیا کو ایک گھر کی صورت میں یکجا کر دیا یعنی Global Village اور سالوں کی مسافت سمٹ کر سیکنڈ کے ہزارویں حصہ تک آ گئی ہے اس لیے زمانے اور وقت کی رفتار بھی اتنی ہی تیزی سے تبدیل ہو

رہی ہے۔ آنے والے وقتوں میں کیا کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی، ان کو دیکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی عظمت و کبریائی پر ایمان لانے والوں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ خصوصاً جدید علوم کے ماہرین اور سائنسدانوں کی کثیر تعداد اسلام کی حقانیت کا اعتراف کرتے ہوئے دائرہ اسلام میں داخل ہو رہی ہے اور یورپ میں تو بہت ہی اضافہ دیکھنے میں آیا ہے۔

بات کہاں سے کہاں تک چلی گئی! بات تو ہو رہی تھی اسرار التنزیل کے ہوتے ہوئے اکرم التفاسیر کے منظر عام پر آنے کی لہٰذا اسرار التنزیل کی اپنی ایک افادیت ہے۔ یہ 1971ء کی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا اللہ یار خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی معیت میں اپنے گھر کی حاضری کا شرف بخشا جس میں ساتھیوں کی کثیر تعداد بھی مقامِ ملتزم پر حاضر تھی۔ جس دربار سے کوئی خالی ہاتھ نہیں لوٹا' عطا و کرم کی اس بارش میں اہلِ بصیرت نے دیکھا کہ فہمِ قرآن کا پیغام قلب پر وجدان کی صورت میں نازل ہوا۔ اسی پیغام کو اہل دل کی امانت سمجھتے ہوئے سپردِ قلم کر دیا کہ شاید اپنے اہل تک پہنچ جائے۔

اسرار التنزیل کا انداز عام فہم اور اجمالی ہے جبکہ اکرم التفاسیر میں حالاتِ حاضرہ کے مطابق ذرا بحث کو وسیع کیا گیا ہے۔ یہ بات اہلِ علم پر عیاں ہے اور پڑھنے والوں کے لیے رشد و ہدایت کا موجب بنے گی۔ اللہ تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے' نجاتِ اخروی کا سبب بنائے اور رضائے الٰہی نصیب فرمائے (آمین)

تیرے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف

امیر محمد اکرم

مولانا محمد اکرم اعوان
شیخ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ
دارالعرفان منارہ ضلع چکوال

امیر المکرم بحیثیت مفکرِ قرآن

یہ اعجازِ قرآن ہے کہ بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور علوم میں ارتقاء کے باعث مفسرینِ کرام قرآنی علوم کی وہ جہتیں بھی آشکار کر رہے ہیں جو پہلے مفسرین کی نگاہوں سے اوجھل رہیں۔ اگر یہ قرآن و حدیث کی معین کردہ حدود کے اندر اور اللہ کے دین اور شریعت کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں تو یہ بھی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم کا ہی پرتو ہے جو بطور علم لدُنّی ان علمائے ربّانی کو عطا ہوئے۔ امیر المکرم کے خطابات سے ماخوذ اکرم التفاسیر بھی فی زمانہ حالات و واقعات اور علوم جدیدہ کا احاطہ کرتے ہوئے علم لدُنّی کی ایسی روشن مثال ہے جس میں نہ صرف علوم مصطفوی صلی اللہ علیہ وسلم کی ضیاء نظر آتی ہے بلکہ برکاتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم قلوب کو تحریک بخشتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔

قرآن کے مضامین میں اس قدر وسعت اور تنوع ہے کہ ان کی کسی فہرست کو حتمی قرار دینا ممکن ہی نہیں لیکن قرآن حکیم کا ہر مضمون ایک نظریہ اور فکر کی بات کرتا ہے۔ امیر المکرم سے یہ سوال کیا گیا کہ کیا وجہ ہے کہ قران میں کثرت سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا تذکرہ نظر آتا ہے۔ آپ نے جواب دیا کہ موسیٰ اور فرعون ہر زمانہ ہر دور اور ہر معاشرے کے دو مرکزی کردار بھی ہیں جن کے مابین حق و باطل کا معرکہ مسلسل بپا ہے اور قرآن میں جا بجا حضرت موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے حوالے سے حق و باطل کے اسی معرکے کا تذکرہ ہے۔ حق و باطل کا یہی معرکہ قرآن کا مرکزی مضمون ہے۔ گرانقدر علمی مباحث قرآن کی معروف تفاسیر کی زینت تو نظر آتے ہیں لیکن قرآن کے اس مرکزی مضمون یا بالفاظ دیگر ''فکرِ قرآنی'' پر بہت کم بات کی گئی۔

دشمنانِ اسلام آج کھل کر قرآن کی مخالفت پر تل گئے اور اس کے پیغام کو دبانے کے

لیے اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آئے ہیں لیکن کیا وہ قرآن کے عائلی قوانین سے خائف ہیں، قانون وراثت سے پریشان ہیں، جنت ودوزخ یا ثواب وعذاب سے گھبرا رہے ہیں؟ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کفار کا تو ان پر ایمان ہی نہیں۔ آج ساری کی ساری طاغوتی قوتیں اس قرآنی فکر سے لرزہ براندام ہیں جو دائمی غلبہ حق کی نوید دیتی ہے اور امیر المکرم اسی قرآنی فکر کے نقیب ہیں۔ اکرم التفاسیر میں آپ نے اسی فکرِ قرآنی کو اجاگر کیا ہے' جو اس تفسیر کا طرہ امتیاز ہے۔

امیر المکرم کفار کے لیے اللہ تعالیٰ کے اٹل قانون قُلْ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ کی روشنی میں طاغوتی قوتوں کو آگاہ کرتے ہیں کہ تمہارے لیے دائمی شکست کا فیصلہ فرما دیا گیا ہے اور ذلت ورسوائی تمہارا مقدر ہے۔ غلبۂ حق کو روکنا اب تمہارے بس کی بات نہیں۔ اپنے خطابات میں آپ بکھری ہوئی ملت کو دعوت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ آؤ پھر کسی یکتائی سے عہد غلامی کرلو۔ تمہاری ذمہ داری کوئی ایک معاشرہ، قوم یا ملک نہیں بلکہ پوری انسانیت ہے۔ قرآن نے انقلاب دشمن سازشوں سے آگاہ کرتے ہوئے یہود کی طویل فردِ جرم بیان کی ہے جس میں انبیاء علیہم السلام سمیت اہلِ حق کے قتل کے جرائم بھی ہیں۔ امیر المکرم نے قرآنی فرمودات کی روشنی میں عالمی حالات کا تجزیہ کرتے ہوئے عصرِ حاضر میں یہود کے سازشی کردار کو اس طرح بے نقاب کیا ہے کہ صیہونیت صرف عالمِ اسلام ہی کی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی دشمن نظر آتی ہے۔

یہ دور اسی فکرِ قرآنی کی پہچان کا دور ہے اور امیر المکرم نے بھرپور انداز میں اسے اجاگر کیا ہے۔ کفر اپنے لیے اس خطرے کو اس حد تک پہچان چکا ہے کہ عملی اقدام پر اتر آیا ہے لیکن حضرت امیر المکرم قرآن کی روشنی میں حالات وواقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے غزوۃ الہند کی نوید دے رہے ہیں۔ آپ سورۃ آل عمران کی آیت نمبر 12 کے ضمن میں فرماتے ہیں:

''کفار کے لیے یہ آیۂ کریمہ قیامت تک کے لیے نوید شکست ہے اور میں بڑی بے باکی سے کہتا ہوں، پورے یقین، پورے ایمان سے منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر بیٹھ کر کہہ رہا ہوں کہ دنیا کی کافر سپر طاقتیں پھر شکست سے دوچار ہوں گی اور ان شاء اللہ پھر غلبۂ اسلام ہوگا۔''

چونکہ تفسیر کا انداز بیانیہ ہے، تو امیر المکرم کے زوردار اندازِ بیان میں فکرِ قرآنی جب قاری تک پہنچتی ہے تو اس کے دل میں ایک تحریک بپا کر دیتی ہے، یہاں تک کہ اسے آنے والے انقلاب کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے۔

امیر المکرم نے فکرِ قرآنی کی بات کرتے ہوئے امت میں ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت پھیلائی گئی اس غلط فہمی کو بھی دور کرنے کی کوشش کی ہے کہ حالات کو بدلنے کے لیے کسی امام مہدی کا انتظار کیا جائے۔ یہ موہوم امید افیون سے کم نہیں جس نے امت کو سلا دیا کہ اب کفر سے نبٹنا ہمارے بس کی بات نہیں اور یہ کام امام مہدی ہی کریں گے۔ حضرت کے خطبات بے عملی کی اس کیفیت سے بیداری کا پیغام ہیں کہ اُمت پہ ابھی بے بسی کا دور نہیں آیا۔ ہر فرد ملت کے مقدر کا ستارہ ہے اور ہر فرد کو امام مہدی کا کردار ادا کرنا ہو گا۔ امیر المکرم امام مہدی کی آمد کی بجائے غلبۂ حق کو بہت قریب دیکھ رہے ہیں۔ یہی قرآنی فکر ہے جو ہر عہد میں حق و باطل کے معرکے کو مہمیز کرتی ہے، جو ہر دور میں خونِ مسلم کو گرم اور اُمتِ مسلمہ کو متحرک رکھتی ہے۔ امیر المکرم نے اکرم التفاسیر میں یہ فکر اس قدر نمایاں طور پر پیش کی ہے کہ وہ مفسرِ قرآن سے آگے مفکرِ قرآن نظر آتے ہیں اور یاد رہے! ہر انقلاب کے پیچھے کوئی مفکر ہوتا ہے۔

چھ جلدوں پر محیط تفسیر ''اسرار التنزیل'' کے حوالے سے امیر المکرم کی پہچان بطور مفسرِ قرآن تو مسلمہ ہے لیکن اب ''اکرم التفاسیر'' کی صورت آپ نے جس طرح قرآنی فکر کو اجاگر کیا ہے، آپ کا تعارف بطور ''مفکرِ قرآن'' حاوی نظر آتا ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مفکرِ قرآن امیر المکرم کو صحت اور عمر دراز عطا فرمائے کہ یہ بیانیہ تفسیر نہ صرف مکمل ہو بلکہ آپ انقلاب بپا ہوتا ہوا بھی دیکھیں۔

ابوالاحمدین

ابوالاحمدین

فہرست مندرجات

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

سُبْحٰنَکَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّکَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ (البقرۃ:32)

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا

عَلٰی حَبِیْبِکَ مَنْ زَانَتْ بِهِ الْعُصُرُوْا

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ
وَالصَّلٰوةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى حَبِيْبِهٖ
مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

پارہ 16 قال الم

سورۃ الکھف رکوع 10 آیات 75 تا 82

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۷۵﴾ قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ
شَيْءٍۭ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ﴿۷۶﴾ فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰۤى
اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۨاسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا
جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾
قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ
صَبْرًا ﴿۷۸﴾ اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِى الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ
اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾ وَاَمَّا الْغُلٰمُ
فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَاۤ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴿۸۰﴾ فَاَرَدْنَاۤ اَنْ
يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾ وَاَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ
لِغُلٰمَيْنِ يَتِيْمَيْنِ فِى الْمَدِيْنَةِ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ
فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ يَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ
وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ؕ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿۸۲﴾

انہوں (خضرؑ) نے کہا کیا میں نے آپ سے کہا نہیں تھا کہ یقیناً آپ سے میرے ساتھ ہرگز صبر نہ ہو سکے گا ﴿۷۵﴾ انہوں (موسیٰ علیہ السلام) نے فرمایا اگر اس کے بعد میں آپ سے کسی چیز کے بارے سوال کروں تو مجھے ساتھ نہ رکھیں بے شک آپ میری طرف سے عذر (کی انتہا) کو پہنچ چکے ہیں ﴿۷۶﴾ پھر دونوں چل دیے یہاں تک کہ جب گاؤں والوں کے پاس پہنچے تو ان لوگوں سے کھانا مانگا پس انہوں نے ان کی میزبانی (کھانا دینے) سے انکار کر دیا۔ پھر ان کو وہاں ایک دیوار ملی جو گرا چاہتی تھی تو اس (بزرگ) نے اسے (ہاتھ کے اشارے سے) سیدھا کر دیا۔ انہوں (موسیٰ علیہ السلام) نے فرمایا اگر آپ چاہتے تو اس پر کچھ اجرت ہی لے لیتے ﴿۷۷﴾ انہوں نے فرمایا یہ وقت میرے اور آپ کے درمیان جدائی کا ہے۔ جن باتوں پر آپ صبر نہ کر سکے میں جلد ہی آپ کو ان کا بھید بتائے دیتا ہوں ﴿۷۸﴾ وہ جو کشتی تھی سو غریب لوگوں کی تھی جو دریا میں محنت مزدوری کرتے تھے تو میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں اور ان لوگوں سے آگے (دوسرے کنارے پر) ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین رہا تھا ﴿۷۹﴾ اور رہا وہ لڑکا پس اس کے ماں باپ ایمان والے تھے تو ہمیں اندیشہ ہوا کہ (بڑا ہو کر) ان کو سرکشی اور کفر میں نہ ڈال دے ﴿۸۰﴾ تو ہم نے چاہا کہ ان کا پروردگار ان کو اس کی جگہ اور (بچہ) عطا کرے جو پاکیزگی (یعنی دین) میں اس سے بہتر اور (ماں باپ سے) محبت کرنے میں (اس سے) بڑھ کر ہو ﴿۸۱﴾ اور رہی وہ دیوار تو وہ شہر میں رہنے والے دو یتیم لڑکوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کا خزانہ دفن تھا اور ان کا باپ بہت نیک تھا۔ سو آپ کے پروردگار نے چاہا کہ وہ دونوں اپنی جوانی کو پہنچ جائیں اور اپنا خزانہ نکال لیں۔ آپ کے پروردگار کی مہربانی سے۔ اور میں نے یہ کام اپنی طرف سے نہیں کیے۔ یہ ان باتوں کی حقیقت ہے جن پر آپ صبر نہ کر سکے ﴿۸۲﴾

تفسیر ومعارف

موسیٰ علیہ السلام اور خضر رحمۃ اللہ علیہ کا مکالمہ جاری ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیا کہ آپ نے بچے کو قتل کر کے نہایت بے جا حرکت کی۔ اس سے پہلے کشتی میں دراڑ ڈال دی تھی تو خیر ہوئی کہ وہ کنارے تو لگ گئی، افراد تو بچ گئے لیکن یہ آپ نے کیا کیا؟ ایک معصوم بچے کو جو کھیل رہا تھا قتل کر دیا؟ کوئی بڑا ہوتا تو سمجھ آتی کہ اس نے کوئی جرم کیا ہوگا کہ آپ کے نزدیک واجب القتل ٹھہرا لیکن اس معصوم کی کیا خطا تھی کہ آپ نے اسے قتل کر دیا؟ آپ نے یقیناً بڑی عجیب حرکت کی۔

اس پر خضر رحمۃ اللہ علیہ نے عرض کی: قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكَ اِنَّكَ لَنۡ تَسۡتَطِيۡعَ مَعِىَ صَبۡرًا﴿۷۵﴾ کیا میں نے آپؑ سے عرض نہیں کیا تھا کہ آپؑ میرے ساتھ نہ رہیں، میرے کام آپؑ برداشت نہ کر پائیں گے، آپؑ سے صبر نہیں ہوگا تو موسیٰ علیہ السلام کو اپنا وعدہ یاد آ گیا کہ میں نے تو وعدہ کیا تھا کہ کچھ پوچھوں گا نہیں، دیکھتا جاؤں گا اور فرمایا، لیکن آپ کی باتیں بہت ہی عجیب وغریب ہیں۔

فرمانے لگے: قَالَ اِنۡ سَاَلۡتُكَ عَنۡ شَىۡءٍۢ بَعۡدَهَا فَلَا تُصٰحِبۡنِىۡ ۚ قَدۡ بَلَغۡتَ مِنۡ لَّدُنِّىۡ عُذۡرًا﴿۷۶﴾ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا، اب اگر میں کسی کام پر یا کسی بات پر گرفت کروں یا کسی قسم کا کوئی سوال کروں تو پھر آپ بے شک مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں۔ میری طرف سے عذر انتہا کو پہنچ چکے ہیں، میں بارہا معذرت کر چکا۔ اب اگر ایسا کروں تو آپ مجھے اپنے سے الگ کر دیجیے گا۔

فَانۡطَلَقَا۔۔۔ پھر دونوں آگے چل دیے۔ حَتّٰٓى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهۡلَ قَرۡيَةِ اۨسۡتَطۡعَمَاۤ اَهۡلَهَا فَاَبَوۡا اَنۡ يُّضَيِّفُوۡهُمَا۔۔۔ یہاں تک کہ ایک گاؤں میں پہنچ گئے۔ مفسرین نے اس کا نام غالباً انطاکیہ لکھا ہے۔ بہرحال انہیں بھوک لگ رہی تھی وہاں پہنچنے پر گاؤں والوں سے کھانا طلب کیا لیکن انہوں نے کھانا دینے سے انکار کر دیا۔ کیسا عجیب گاؤں تھا کہ دو مسافروں کو کھانا نہ کھلا سکے اور انکار کر دیا۔ اس ضمن میں مفسرین ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ عہدِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں قرآن کی یہ آیات سُن کر اس گاؤں کے وہ لوگ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد کے تھے، چل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ عالیہ میں پہنچے اور عرض کی کہ یہ بات قرآن میں آ گئی ہے کہ سارا گاؤں صرف دو مہمانوں کو کھانا نہ کھلا سکا اور کھانا دینے سے انکار کر دیا تو یہ ہمارے باپ دادا کی بدنامی ہے، توہین کا باعث ہے۔ قرآنِ حکیم تو قیامت تک رہے گا۔ قیامت تک لوگ یہی بات کرتے جائیں گے کہ وہ ایسا گاؤں تھا کہ دو مہمانوں کو کھانا دینے سے انکار کر دیا۔ قیامت تک لوگ قرآنِ حکیم کے یہ الفاظ: فَاَبَوۡا اَنۡ يُّضَيِّفُوۡهُمَا۔۔۔ پڑھیں گے اور ہمارے آباؤاجداد کی بدنامی ہوتی رہے گی تو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) احسان فرمائیں اور لفظ فَاَبَوۡا

میں سے نیچے والا ایک نقطہ اوپر لگا دیں اور اس کے ساتھ ایک نقطے کا اضافہ کر دیں تو پھر یہ لفظ اَتَوا بن جائے گا جس کا معنی ہوگا 'انہوں نے کھانا دیا' اس ایک نقطے سے ہماری بات بن جائے گی، ہماری عزت رہ جائے گی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ اللہ کا کلام ہے۔ اس میں کوئی نقطہ بڑھا سکتا ہے نہ گھٹا سکتا ہے، نہ اس کے معنی تبدیل ہو سکتے ہیں، نہ ایسا کرنے کی جرأت ہے۔ یہ جیسے نازل ہوا ہے ویسے ہی قیامت تک ان شآءاللہ پڑھا جائے گا چنانچہ یہ فَاَبَوا ہی رہا اور ہمیشہ ایسے ہی پڑھا جاتا رہے گا۔

ادھر گاؤں والوں کا یہ سلوک تھا اُدھر خضر رحمۃ اللہ علیہ خدمتِ خلق میں مصروف تھے: فَوَجَدَا فِيهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ۭ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿٧٧﴾ ایک مکان کی دیوار گرنے کے قریب تھی۔ خضرؑ نے اشارہ کیا اور کراماتی طور پر دیوار سیدھی کر دی تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پھر رہا نہ گیا۔ آپؑ نے فرمایا کہ ایک تو گاؤں والے ایسے ہیں کہ انہوں نے کھانا دینے سے انکار کر دیا اگر آپ کو ان کی دیواریں مرمت کرنے کا اتنا ہی شوق تھا تو اس پر اُن سے اجرت ہی لے لیتے، کھانا تو مل جاتا! آپ کو اس کام کی مزدوری، اجرت لینی چاہیے تھی۔

حضرت خضرؑ نے عرض کی: قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۔۔۔ حضرت! اب میرے اور آپؑ کے راستے الگ ہو رہے ہیں۔ آپؑ نے خود فرمایا تھا کہ اگر دوبارہ سوال کریں تو ہم جدا ہو جائیں گے تو وہ وقت آ گیا لیکن میں آپ کو ان باتوں کی وضاحت کر دیتا ہوں جو آپؑ برداشت نہ کر سکے تھے۔

تکوینی امور، رحمتِ الٰہی کے مظاہر:

اللہ کریم کا کرم ہر ایک پر ہے اور اس کی رحمت عام ہے۔ اس کے فیصلے اس کی رحمت کا مظہر ہیں۔ منجانب اللہ جو امور درپیش ہوتے ہیں بظاہر ہمیں دکھ دینے والے ہوتے ہیں درحقیقت وہ ہمارے لیے مفید ہوتے ہیں۔ تکوینی امور اللہ کی رحمت کے مختلف انداز ہیں۔

ارشاد باری ہے: سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ﴿٧٨﴾ خضرؑ نے عرض کی کہ میں ان امور کی وضاحت کر دیتا ہوں، ان کے پیچھے جو حقائق تھے وہ عرض کر دیتا ہوں: اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فَاَرَدْتُّ اَنْ اَعِيْبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمْ مَّلِكٌ يَّاْخُذُ كُلَّ سَفِيْنَةٍ غَصْبًا ﴿٧٩﴾ وہ کشتی جس میں ہم سوار ہوئے تھے اس کے مالک غریب لوگ تھے۔ یہ کشتی ہی اُن کا ذریعہ روزگار تھا، وہ اسی میں سواریوں کو بٹھا کر دریا کے پار لے جاتے۔ کبھی سواریاں کم مل جاتیں، کبھی زیادہ مل جاتیں اس طرح ان کا گزارہ مشکل سے ہو رہا تھا۔ میں نے اس کشتی کو عیب دار بنا دیا تا کہ اس کشتی سے وابستہ ان کا یہ روزگار قائم رہے۔ اس ملک کا بادشاہ

ظالم تھا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر بادشاہ کے لوگ کھڑے تھے۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ تمام کشتیاں ضبط کر لی جائیں۔ جو کشتی کنارے پر پہنچتی وہ چھین لیتے تھے۔ مجھے منجانب اللہ حکم ہوا کہ اس میں تھوڑا سا عیب ڈال دوں میں نے اس کشتی میں ایک دراڑ ڈال دی تاکہ جب بادشاہ کے لشکری اسے دیکھیں تو ٹوٹی ہوئی پرانی عیب دار کشتی سمجھ کر چھوڑ دیں اور ان لوگوں کا ذریعہ روزگار بچ جائے۔

دنیا عالمِ اسباب ہے۔ اللہ کریم اسباب پیدا فرماتے ہیں اور ان کے نتائج ہوتے ہیں۔ بعض اوقات منجانب اللہ پیش آنے والی باتیں بظاہر ہمیں مشکلات لگتی ہیں لیکن درحقیقت وہ ہمیں کسی بڑی مصیبت سے بچانے کا سبب ہوتی ہیں جس کو ہم سمجھ نہیں سکتے اور ساری زندگی اللہ سے گلہ کرتے رہتے ہیں۔ جیسے کشتی والوں کو تو پتا نہیں تھا کہ اللہ کریم کی کیا مصلحت ہے کہ ان کی کشتی میں دراڑ آ گئی اور اللہ کریم نے کشتی کی اسی دراڑ کو بادشاہ سے بچانے کا ذریعہ بنا دیا۔

دوسرا معاملہ بچے کا تھا: وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ﴿٨٠﴾ اس کے والدین نیکی کے راستے پر چل پڑے تھے، نیک اعمال کرنے لگ گئے تھے، نیک ہو گئے تھے۔ اس لڑکے کے بارے خدشہ تھا کہ یہ صرف خود ہی کافر نہیں ہو گا بلکہ انہیں بھی کفر میں لے ڈوبے گا تو اللہ نے مجھے حکم دیا کہ ان کے بیٹے کو قتل کر دوں۔

قدرت کس طرح سے بندوں پر کرم کرتی ہے۔ اللہ کریم کس طرح اپنے ایک ایک بندے کا خیال رکھتے ہیں یہ اسی رب کی شان ہے۔ اللہ سے توبہ کی جائے، رجوع الی اللہ کیا جائے تو کس طرح حالات بدلتے ہیں۔ یہ لڑکا انہی والدین کی اولاد تھا۔ اللہ کریم چاہتے تو اسے نیک ہی پیدا کرتے شاید اس وقت وہ نیک نہیں ہوں گے لیکن جب انہوں نے اللہ کی طرف رجوع کیا، توبہ کی، دین پر مکمل عمل شروع کر دیا تو اللہ نے ان سے وہ لڑکا لے لیا اور انہیں دوسری اولاد دے دی۔ مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ ان کے ہاں پھر ایک بیٹی پیدا ہوئی۔ وہ نیک تھی۔ اس کی شادی ایک نبیؑ سے ہوئی پھر اس کی اولاد سے نسلاً بعد نسل ستر انبیاء پیدا ہوئے۔ یعنی اس کی اولاد در اولاد میں انبیاء آتے رہے۔ اللہ کریم کس طرح کرم فرماتے ہیں۔ کہاں وہ لڑکا تھا جس سے خطرہ تھا کہ والدین کو بھی کفر میں غرق کر دے گا کہاں اس کے بدلے اللہ نے ایسی عظیم بیٹی دی جو ایک نبیؑ کی اہلیہ بنی پھر اس کی اولاد سے کئی نسلوں تک نبوت جاری رہی۔ اللہ کریم کے کرم کے کیا انداز ہیں یہ بات خضرؑ نے موسیٰ علیہ السلام کو عرض کر دی کہ تکوینی امور کے پیچھے اللہ کریم کی کیا مصلحت ہوتی ہے اور کس طرح نتائج مختلف ہوتے ہیں۔ ان والدین کے ہاں جب وہ بچہ ہوا تو شاید وہ نیکی کے اس مقام پر نہیں تھے، بچے میں وہ نیکی نہیں آئی لیکن جب انہوں نے توبہ کر لی تو اللہ نے وہ بچہ واپس لے لیا اور انہیں نیک بیٹی عطا کر دی۔

بیٹیاں، اللہ کی رحمت:

فرمایا: فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا ﴿٨١﴾ تو پروردگارِ عالم نے ان کے

لیے خیر کا ارادہ فرمایا اور انہیں اس سے بہتر اولاد دے دی جو نیک تھی، بہترین تھی اور ماں باپ سے محبت کرنے والی بھی تھی۔

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ ہم عموماً لڑکوں کو پسند کرتے ہیں جبکہ اللہ نے یہاں لڑکی دے کر اپنا احسان فرمایا کہ یہ ماں باپ سے بہت محبت کرنے والی ہے۔ دیکھا جائے تو بڑھاپے میں جو خدمت بیٹی کر سکتی ہے وہ بیٹے نہیں کر سکتے۔ بیٹا، چاہے فرمانبردار بھی ہو تو سارا دن کام پر ہوگا۔ ملازمت کرے گا، نوکری کرے گا، ملک میں ہوگا یا ملک سے باہر ہوگا، زیادہ سے زیادہ پیسے ہی بھیج سکے گا، بے چارہ اور کیا کرے گا! بچیاں چونکہ گھروں میں ہوتی ہیں تو ماں باپ کی دن بھر کی ضروریات کا خیال رکھ سکتی ہیں۔ وقت پر کھانا پینا، دوادارو، لباس تبدیل کروانا، غرضیکہ زیادہ خدمت بچیاں ہی کرتی ہیں۔ یہ قدرت کا ایسا نظام ہے کہ بچے اچھے بھی ہوں، صالح بھی ہوں تو ان کا کام ایسا ہے کہ انہیں گھر سے باہر رہنا پڑتا ہے، کمانے کے لیے زیادہ وقت گھر سے باہر رہتے ہیں اور بعض اوقات کمانے کے لیے دوسرے ملکوں میں چلے جاتے ہیں۔

فرمایا، اللہ نے ان والدین پر احسان فرمایا اور انہیں محبت کرنے والی، بہت خدمت کرنے والی بیٹی عطا کر دی۔ یقیناً بیٹیاں اللہ کی رحمت ہیں۔

نیک والدین اور بزرگوں کا فیضان جاری رہتا ہے:

اللہ کریم کی رحمت کا ایک اور انداز بیان ہوا: وَأَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلَامَيْنِ يَتِيمَيْنِ فِي الْمَدِينَةِ وَكَانَ تَحْتَهُ كَنزٌ لَّهُمَا وَكَانَ أَبُوهُمَا صَالِحًا ۚ فَأَرَادَ رَبُّكَ أَن يَبْلُغَا أَشُدَّهُمَا وَيَسْتَخْرِجَا كَنزَهُمَا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ ۔۔۔ فرمایا، جس گھر کی دیوار کو میں نے اللہ کے حکم سے مضبوط کر دیا تھا وہ گھر دو چھوٹے بچوں کا ہے جو یتیم ہیں۔ اس دیوار کے نیچے اُن کے والد نے ان کے لیے خزانہ رکھ دیا تھا۔ ان یتیم بچوں کا والد صالح مرد تھا۔ اللہ کا بہت نیک بندہ، ولی اللہ تھا، اسے اللہ کا قرب حاصل تھا۔ اس کے پاس جو سرمایہ تھا وہ اس نے اس دیوار کے نیچے دبا دیا تھا۔ اگر یہ دیوار گرتی تو خزانہ کُھل جاتا، لوگ اٹھا لے جاتے یا جن وارثوں کے زیر سایہ یہ یتیم پل رہے تھے وہی اٹھا لیتے لیکن آپ کے پروردگار نے یہ پسند فرمایا کہ جب یہ بچے جوان ہوں تو اپنا خزانہ خود نکالیں اور اپنی ضروریات پر استعمال کریں۔

اللہ کریم کا کرم ہے کہ جو لوگ اللہ کی اطاعت کرتے ہیں یا وہ لوگ جنہیں اللہ کا قرب نصیب ہوتا ہے جنہیں عرف عام میں ولی اللہ کہتے ہیں، ان کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بھی اللہ کریم ان کی اولادوں کو دنیوی فوائد پہنچاتا رہتا ہے۔ اگر وہ نیک ہوں تو اخروی فوائد دوسروں کی نسبت زیادہ حاصل کر لیتے ہیں گویا نیک والدین کا اور بزرگوں کا

فیضان جاری رہتا ہے اور پیچھے اولاد کو بھی پہنچتا ہے۔ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۔۔۔ یہ آپ کے پروردگار کی رحمت کے مختلف مظاہر ہیں، مختلف پہلو ہیں، مختلف انداز ہیں۔

وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِيْ ۭ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ؀ خضرؑ نے عرض کی، اے اللہ کے نبی! میں یہ بھی عرض کر دوں کہ یہ سب کچھ میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا۔ یہ میرا کام نہیں ہے کہ میں فیصلہ کروں کہ یہ بندہ نیک ہے یا بد ہے، یہ کشتی سلامت رہے یا پھٹ جائے، یہ دیوار گرے یا مضبوط کر دی جائے۔ یہ سب کچھ میرا کام نہیں اور نہ میں نے اپنی مرضی سے کیا ہے۔ اللہ نے حکم دیا کہ ایسا کر دو، اسی نے مجھے ایسا کرنے کی توفیق دی تو میں نے کر دیا۔ اللہ کریم کے نزدیک ان امور کے پس پردہ کیا حقائق تھے وہ میں نے آپ سے عرض کر دیے۔ یہ تینوں کام بظاہر عجیب لگے کہ ان کا نقصان ہوا لیکن وہ تینوں اُن کے فائدے اور بہتری کا سبب بنے اور یہ ہے آپ کے پروردگار کا کرم اور اُن باتوں کی حقیقت جن پر آپ صبر نہ کر سکے اور میری گرفت فرماتے رہے۔

بلاشبہ اللہ کریم کی رحمت عام ہے۔ ہم گناہ کر کے اپنے لیے مصیبتیں خود تلاش کرتے ہیں۔ ہم دن بھر خطائیں کرتے ہیں، اللہ کریم اپنے کرم سے ہمیں ان کے نتائج سے بچائے رکھتا ہے۔ اللہ کریم کا یہ کرم ہے کہ بہت سی خطائیں اپنی رحمت سے بخش دیتا ہے ورنہ ہر کام کا نتیجہ اگر سامنے آتا تو کب کے تباہ ہو چکے ہوتے۔ اس سارے قصے میں اللہ کریم کی عظمت، اس کی رحمت اور اس کے بے پایاں کرم کا بیان ہے کہ ہم غلطیاں بھی کرتے ہیں تو وہ کس طرح ہمارا تحفظ فرماتا ہے، ہماری حفاظت فرماتا ہے۔

انسان کا مزاج بھی عجیب ہے۔ ساٹھ برس بھی اللہ کی نعمتیں استعمال کرلے اور چھ گھنٹے بیمار ہو جائے تو ساٹھ برسوں کی صحت کا ملنا بھلا دیتا ہے اور ان چند گھنٹوں کی تکلیف اسے یاد رہتی ہے۔ ساری زندگی آرام سے کھاتا رہے اور کبھی غریبی آجائے تو اُسے وہ تنگی یاد رہتی ہے اور زندگی بھر اللہ کی جو نعمتیں استعمال کرتا رہا انہیں بھول جاتا ہے حالانکہ ہم پر جو مصیبتیں آتی ہیں، یہ ہم خود خریدتے ہیں۔ وہ تو ایسا کریم ہے کہ پھر حالات کو بدل کر ہمارے لیے آسانیاں پیدا فرما دیتا ہے۔ ہمارا خالق، ہمارا مالک، ہمارا رازق، ہمارا پروردگار، ہمارا ربّ اتنا کریم ہے تو ہم اس کا شکر ادا کیوں نہیں کرتے، ہم کیوں اس کی اطاعت میں زندگی بسر نہیں کرتے؟ ہمیں سوچنا چاہیے!

ہمیں یہ طے کر لینا چاہیے کہ اللہ نے جب مجھے زندگی دی ہے اور اس کے بارے فیصلے کرنے کا اختیار دیا ہے تو میں وہ فیصلہ کروں جو میرے پروردگار کی پسند کے مطابق ہو۔ میں اس کی اطاعت کروں۔ زندگی کی مہلت، فرصت کے لمحات کو اس کی یاد میں بسر کروں، اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت پر بسر کروں تاکہ میرے دونوں عالم روشن ہوتے جائیں۔

سورۃ الکھف رکوع 11 آیات 83 تا 101

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ ؕ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿۸۳﴾ اِنَّا
مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿۸۴﴾ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۵﴾ حَتّٰۤى
اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا
قَوْمًا ؕ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾
قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾
وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ الْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا
يُسْرًا ﴿۸۸﴾ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى
قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾ كَذٰلِكَ ؕ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ
خُبْرًا ﴿۹۱﴾ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾ حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا
قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾ قَالُوْا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ
وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤى اَنْ تَجْعَلَ
بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾ قَالَ مَا مَكَّنِّيْ فِيْهِ رَبِّيْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِيْ بِقُوَّةٍ
اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾ اٰتُوْنِيْ زُبَرَ الْحَدِيْدِ ؕ حَتّٰۤى اِذَا سَاوٰى بَيْنَ
الصَّدَفَيْنِ قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤى اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوْنِيْۤ اُفْرِغْ عَلَيْهِ
قِطْرًا ﴿۹۶﴾ فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ يَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾ قَالَ هٰذَا
رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّيْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّيْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّيْ حَقًّا ﴿۹۸﴾

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَّمُوْجُ فِيْ بَعْضٍ وَّنُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ
جَمْعًا﴿٩٩﴾ وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضَا﴿١٠٠﴾ الَّذِيْنَ كَانَتْ
اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا﴿١٠١﴾

اور آپ سے ذوالقرنین کے بارے سوال کرتے ہیں فرما دیجیے کہ میں ان کا کسی قدر حال تم کو پڑھ کر سناتا ہوں ﴿۸۳﴾ بے شک ہم نے ان کو زمین پر حکومت بخشی تھی اور ان کو ہر طرح کا سامان عطا فرمایا تھا ﴿۸۴﴾ تو انہوں نے سفر کا سامان کیا ﴿۸۵﴾ یہاں تک کہ جب سورج کے غروب ہونے کی جگہ (زمین کی مغربی حد) پر پہنچے تو انہوں نے اس (آفتاب) کو ایک سیاہ رنگ کے پانی میں ڈوبتا ہوا پایا اور اس کے پاس ایک قوم دیکھی ہم نے فرمایا (الہام کر کے) اے ذوالقرنین! تم یا (ان کو) سزا دو اور یا ان کے بارے نرمی کا رویہ اختیار کرو ﴿۸۶﴾ انہوں نے کہا جو ظلم (دعوت سے انکار) کرے گا تو اسے ہم سزا دیں گے پھر وہ اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا جائے گا تو وہ اسے بُرا عذاب دے گا ﴿۸۷﴾ اور جو ایمان لے آیا اور نیک کام کیے تو اس کو (آخرت میں بھی) بدلے میں بھلائی ملے گی اور ہم اپنے معاملے میں بھی اس سے نرم بات (مہربانی) کریں گے ﴿۸۸﴾ پھر ایک اور سامانِ سفر کیا ﴿۸۹﴾ یہاں تک کہ جب سورج کے طلوع ہونے کے مقام پر پہنچے (زمین کے دوسرے سرے پر) تو اس (سورج) کو ایسے لوگوں پر طلوع ہوتے پایا جن کے لیے ہم نے اس (سورج) کی طرف سے کوئی اوٹ نہیں بنائی تھی ﴿۹۰﴾ (حقیقت حال) یوں (تھی) اور جو کچھ اس کے پاس تھا بے شک ہم کو سب کی خبر تھی ﴿۹۱﴾ پھر ایک اور راہ پر ہو لیے ﴿۹۲﴾ یہاں تک کے جب وہ دو دیواروں (پہاڑوں) کے درمیان پہنچے تو دیکھا کہ ان کے اس طرف کچھ لوگ ہیں جو بات کو سمجھ ہی نہیں سکتے ﴿۹۳﴾ لوگوں نے عرض کیا اے ذوالقرنین! بے شک یاجوج اور ماجوج زمین میں فساد کرتے رہتے ہیں سو کیا بھلا ہم آپ کے لیے خرچ کا اہتمام کر

دیں کہ آپ ہمارے اور ان کے درمیان دیوار کھینچ دیں؟﴿۹۴﴾ فرمایا خرچ کا جو مقدور اس سلسلے میں میرے رب نے مجھے بخشا ہے بہت اچھا ہے سو تم مجھے قوت (بازو) سے مدد دو میں تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط آڑ بنا دوں گا﴿۹۵﴾ میرے پاس لوہے کی چادریں لاؤ یہاں تک کہ جب انہوں نے دونوں پہاڑوں کے درمیان (کا حصہ) برابر کر دیا فرمایا (اب اسے) دھونکو یہاں تک کہ جب اس کو آگ (کی مانند) کر دیا تو فرمایا میرے پاس پگھلا ہوا تانبا لاؤ کہ میں اس پر ڈال دوں﴿۹۶﴾ پھر یہ اس پر چڑھ نہ سکیں گے اور نہ اس میں نقب لگا سکیں گے﴿۹۷﴾ فرمایا یہ میرے پروردگار کی مہربانی ہے پس جب میرے پروردگار کا وعدہ آ پہنچے گا تو وہ اس کو (گرا کر) ہموار کر دے گا اور میرے پروردگار کا وعدہ سچا ہے﴿۹۸﴾ اور اس روز ہم ان کو چھوڑ دیں گے کہ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو جائیں اور صور پھونکا جائے گا تو ہم سب کو جمع کر لیں گے﴿۹۹﴾ اور اس روز ہم جہنم کو کافروں کے سامنے لائیں گے﴿۱۰۰﴾ جن کی آنکھیں میری یاد سے پردے میں (بند) تھیں اور وہ سننے کی طاقت نہیں رکھتے تھے﴿۱۰۱﴾

تفسیر و معارف

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِي الْقَرْنَيْنِ۔۔۔اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ذوالقرنین کے بارے سوال کرتے ہیں۔ وہ تین سوال جو مشرکینِ مکہ نے مدینہ کے علمائے یہود سے پوچھ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیے تھے ان میں سے روح اور اصحابِ کہف کے بارے سوالوں کے جواب گزر چکے۔ یہ تیسرا سوال ہے جس کا جواب ارشاد ہو رہا ہے۔

قرن صدی کو بھی کہتے ہیں۔ جس شخص کا اقتدار دو صدیوں پر محیط ہو، شہرت رہی ہو، کسی شعبہ کا معروف آدمی ہو جس نے دونوں صدیوں کو متاثر کیا ہو تو اُسے بھی ذوالقرنین کہا جا سکتا ہے۔ بعض علما نے کہا ہے کہ یہ سر پر دو چوٹیاں رکھا کرتے تھے اس حوالے سے انہیں ذوالقرنین کہتے ہیں۔ بعض حضرات نے کچھ اور تاویلیں کی ہیں۔ بہر حال صحت کے اعتبار سے یہ بات زیادہ قرینِ قیاس ہے کہ کوئی ایسا شخص جو دو صدیوں میں ہوا ہو یعنی پہلی صدی اس کی زندگی میں

ختم ہو گئی اور دوسری کی ابتدا ہو گئی اور اس نے دونوں صدیوں کو متاثر کیا ہو، اتنا مشہور اور عظیم انسان ہو تو اُسے ذوالقرنین کہا جاتا ہے۔ علما نے لکھا ہے کہ ان کا نام سکندر تھا۔ تاریخ عالم میں سکندر نام کے کئی معروف اشخاص گزرے ہیں۔ اپنے اپنے زمانے میں معروف لوگ تھے۔ سب سے آخر میں آنے والا مقدونیہ کا تھا جسے سکندرِ اعظم کہتے ہیں جس نے بے شمار فتوحات کیں۔ وہ مشرک تھا، آتش پرست تھا اور ظالم انسان تھا لہٰذا وہ ذوالقرنین نہیں ہو سکتا۔ یہ کوئی اور سکندر ہوئے ہیں۔ بعض علما نے لکھا ہے کہ اُن کا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا زمانہ ایک تھا۔ واللہ اعلم۔ اللہ بہتر جاننے والا ہے۔ یہ طے ہے کہ ان کے بارے بہت سی حکایات مشہور تھیں، مختلف قصے گھڑے ہوئے تھے، عجیب وغریب حکایات زبان زدِ عام تھیں۔ کچھ معلومات صحیح اور کچھ غلط تھیں لیکن جانتا ہر ایک تھا۔

فرمایا: قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿٨٣﴾ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) فرما دیجیے کہ میں ان کا کسی قدر حال تم لوگوں کو پڑھ کر سناتا ہوں یعنی وحیٔ الٰہی اللہ کریم کی طرف سے تمہیں سنا دیتا ہوں۔

قِصّۂ ذوالقرنین:

فرمایا: اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِي الْاَرْضِ وَاٰتَيْنٰهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿٨٤﴾ ہم نے انہیں زمین پر بہت طاقت بخشی تھی، حکومت واقتدار بخشا تھا۔ ان کی حکومت نری حکومت نہیں تھی بہت خوش حال حکومت تھی۔ ان کے پاس ہر قسم کے وسائل جمع تھے۔ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٥﴾ چنانچہ انہوں نے اپنے وسائل جمع کر کے ایک طرف سفر کرنا شروع کیا۔ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّوَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۔۔۔ حتیٰ کہ وہ مغرب کی طرف نکلے۔ شہروں پر شہر اور ملکوں پر ملک فتح کرتے چلے گئے یہاں تک کہ زمین کے مغربی سرے تک جا پہنچے جہاں آگے زمین نہیں تھی اور سورج کو سیاہ رنگ کے پانی میں ڈوبتا ہوا پایا یعنی آگے سمندر تھا اور اس سے پرے غروبِ آفتاب کا منظر تھا، زمین نہیں تھی۔ اللہ نے انہیں کس قدر وسائل عطا کیے کہ وہ سفر پر سفر اور فتوحات پر فتوحات کرتے زمین کے اگلے کنارے پہنچ گئے تو وہاں ایک قوم کو پایا۔

یہ بات طے ہے کہ ذوالقرنین کے نبیؑ ہونے پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ قرآنِ کریم میں ان کا تذکرہ بحیثیت نبی نہیں کیا گیا بلکہ ایک بڑے طاقتور حکمران کے طور پر کیا گیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس آیۂ مبارکہ میں پھر انہیں خطابِ الٰہی کیسے ہوا؟ آیۂ مبارکہ میں فرمایا گیا ہے: قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ ۔۔۔ ''ہم نے فرمایا، اے ذوالقرنین!'' تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں ہے کہ ایسا خطاب اولیاء اللہ کو بھی ہوتا ہے جسے الہام کہتے ہیں قرآنِ کریم

سے ثابت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ پر الہام ہوا، القا ہوا کہ اس بچے کو دریا میں ڈال دو، ہم اسے واپس کر دیں گے۔ اسے اپنا نبیؑ مبعوث کریں گے، اپنے رسولوں میں سے بنائیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے اس الہام پر عمل کیا، اپنے بچے کو دریا میں ڈال دیا اور دوسرے تیسرے دن ہی بچہ انہیں واپس بھی مل گیا۔ والدہ کی گود میں ہی پلے بڑھے۔ اللہ کے نبیؑ بھی مبعوث ہوئے۔ وحی سوائے نبی علیہ السلام کے کسی اور پر نازل نہیں ہوتی۔ الہام اور القاء اولیاء اللہ کو ہوتا ہے۔ یہاں اسی الہام کا ذکر ہے۔ فرمایا: قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ ۔۔۔ ہم نے الہام فرمایا کہ اے ذوالقرنین! اِمَّآ اَنْ تُعَذِّبَ وَاِمَّآ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ﴿۸۶﴾ یہ قوم جاہل ہے، اللہ کی عظمت سے ناآشنا ہے، دین کی، عاقبت کی انہیں کوئی خبر نہیں۔ اب یہ تم پر ہے کہ ان کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو، انہیں سزا دیتے ہو یا نرمی سے پیش آتے ہو۔ انہوں نے عرض کی: قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾ جو ظلم کریں گے یعنی شرک کریں گے۔ اللہ کو واحد و لاشریک نہیں مانیں گے، دعوتِ حق سے انکار کریں گے ہم اس قوم پر اللہ کی عظمت اور دعوتِ حق پیش کریں گے پھر جو انکار کریں گے انہیں سزا دیں گے۔ اور ہماری سزا کیا ہے، ہم تو دنیوی سزا ہی دیں گے لیکن واپس اللہ کی بارگاہ میں جانا ہے۔ وہاں شرک کا، کفر کا عذاب بے پناہ ہوگا۔ جو عذاب وہاں ملے گا، دنیا کا عذاب اس کے مقابل کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ دنیا میں قتل کی سزا میں قتل ہو جائیں گے لیکن اصل سزا تو مرنے کے بعد شروع ہوگی۔ وہ بہت بُرا عذاب ہوگا، بہت سخت، بہت دکھ دینے والا شدید عذاب ہوگا۔ اُن کا پروردگار جو ربّ العالمین ہے، اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے کہ جیسا عمل ہو اس پر ویسا اجر مرتب فرمائے۔ کوئی گندم بوتا ہے تو ربّ اس پر گندم کے دانے لگاتا ہے۔ کوئی جو بوتا ہے تو اس پر جو ہی لگتے ہیں۔ تقاضائے ربوبیت یہ ہے کہ ہر چیز کا انجام اس کی حقیقت، اس کی اصلیت اور اس کی فطرت کے مطابق ہو۔ کفر و شرک کا انجام عذابِ جہنم ہے۔ دنیوی عذاب کی اس کے سامنے کوئی حقیقت نہیں کہ دنیا عارضی ہے اس کی سزا بھی ختم ہو جاتی ہے۔ آخرت حقیقی ہے، دائمی ہے وہاں کی سزا بہت شدید ہے۔

ایمان کی دلیل:

فرمایا: وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۔۔۔ ''اور جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اعمال صالح کیے''۔ یہاں بھی ایمان کے ساتھ عملِ صالح کی قید لگائی گئی ہے۔ ایمان محض زبانی اقرار کا نام نہیں، دلی تصدیق ضروری ہے۔ دلی تصدیق ہو تو بندہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہے۔ ایمان کا دعویٰ زبانی کرنا اور عملاً

نافرمانی کرتے رہنا اس کا کوئی جوڑ نہیں۔ اللہ کی مرضی کہ وہ کسی کے زبانی ایمان پر بھی اسے معاف کر دے، یہ تو اس کا کرم ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایمان لانا ایک دعویٰ ہے، اعمال اس کے گواہ ہیں۔ جب ہم زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں تو ہمارے کردار کی اس پر گواہی ہونی چاہیے کہ بندہ مومن یہ اعمال اتباع رسالت میں کر رہا ہے۔ یہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اطاعت گزار ہے اس لیے اس کا ایمان پکا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم دوسروں کو ہی نہ دیکھتے رہیں بلکہ اپنا تجزیہ کریں کہ کیا میرا کردار میرے ایمان ویقین کے مطابق ہے؟

ایمان والوں کے لیے خوشخبری:

فرمایا: وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ِالْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿٨٨﴾ جو ایمان لائے گا اور اپنے ایمان کے مطابق اعمال کرے گا۔ جو ایمان لا کر اپنی اصلاح کرے گا، اپنا کردار درست کرے گا اس کو بدلے میں بھلائی ملے گی۔ دنیا اور آخرت دونوں میں اسے بہترین اجر ملے گا۔ دنیا میں بھی اللہ کریم اس پر احسان کریں گے اور آخرت میں اللہ کریم اس سے نرم بات کریں گے، اس پر مہربانی کریں گے۔ وہ عزت واحترام سے نوازا جائے گا۔ اللہ کریم تو حقیقی نعمتیں دینے والے ہیں۔ وہ ربِ کریم اسے حقیقی انعامات سے نوازے گا۔ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٩﴾ فرمایا، ذوالقرنین ادھر سے فارغ ہوئے تو سامانِ سفر درست کیا اور پھر ایک سمت کو چلنے کا ارادہ کیا۔ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿٩٠﴾ جب دوسرے کنارے پر پہنچے تو وہاں ایک عجیب قوم دیکھی۔ اللہ کریم فرما رہے ہیں وہ ایسی قوم تھی جنہیں ہم نے مکان بنانا بھی نہیں سکھائے تھے۔ وہ دھوپ، گرمی، سردی میں ایسے ہی رہتے تھے۔ ان کے پاس کوئی اوٹ نہیں تھی، مکان بنانے کا کوئی تصور نہیں تھا۔ كَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿٩١﴾ فرمایا، جو مال و دولت اور اسباب و وسائل ذوالقرنین کے پاس تھے ہمیں اس سب کی خبر تھی۔ ہم نے خود اسے عطا کیا، ہم سب جانتے ہیں۔ اللہ کریم حقیقتِ حال سے واقف ہیں اسی لیے وہ تم لوگوں کو حقیقت بتا رہے ہیں۔ باقی لوگوں کی گھڑی ہوئی کہانیاں ہیں ان میں حقیقت نہیں۔ ان گھڑی ہوئی کہانیوں کے برعکس حقیقتاً واقعہ اسی طرح تھا جیسے اللہ کریم ارشاد فرما رہے ہیں اور جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تلاوت کر کے سنا رہے ہیں۔ اس قوم کے ساتھ ذوالقرنین نے کیا، کیا؟ اس کے بارے میں قرآنِ کریم میں تذکرہ نہیں ہوا۔ ان سے پہلے جو قوم مغرب میں ملی تھی اس کا ذکر تو ہوا کہ انہیں دعوتِ حق دی گئی، ماننے والوں سے وعدہ ہوا کہ جو ایمان پر مریں گے وہ انعام پائیں گے جو کفر پر مریں گے وہ سزا پائیں گے۔ اس قوم کے بارے جو ہوا اس کا تذکرہ قرآنِ حکیم میں نہیں آیا۔ ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٩٢﴾ پھر رختِ سفر باندھا اور شمال کی جانب چل نکلے۔

یاجوج وماجوج:

فرمایا: حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾ حتیٰ کہ وہ انتہائی بلند پہاڑوں پر پہنچے جو شمال میں پائے جاتے ہیں۔ وہاں ایک وادی دیکھی جس کے دونوں جانب بہت ہی بلند پہاڑ تھے جن پر چڑھا نہیں جا سکتا تھا۔ ان پہاڑوں کے پیچھے ایک ایسی قوم دیکھی جو نہ بات سنتے اور نہ سمجھتے تھے۔ یہاں یاجوج ماجوج کا تذکرہ ہے کہ وہ انتہائی وحشی ہیں۔ ان میں اتنی درندگی ہے کہ ہر وقت مار دھاڑ میں لگے رہتے ہیں۔

اس وادی کے رہنے والوں نے شکایت کی: يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِنَّ يَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰٓى اَنْ تَجْعَلَ بَيْنَنَا وَبَيْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾ کہ اے ذوالقرنین! یاجوج ماجوج نے تو ہمیں تباہ کر دیا ہے۔ ہر وقت فساد بپا کیے رکھتے ہیں۔ ہم اپنی تہذیب وتمدن کے کوئی اسباب نہیں کر سکتے۔ یہ آئے روز آ جاتے ہیں اور شہر کی ہر چیز تاراج کر کے چلے جاتے ہیں۔ ہم رات دن اس فکر میں رہتے ہیں کہ اس مصیبت سے کیسے خلاصی ہو؟ ہم آپ کے لیے دولت جمع کرتے ہیں آپ اسے خرچ کر کے ان کے اور ہمارے درمیان دیوار بنا دیں جسے یہ عبور نہ کر سکیں اور اس دیوار کے پیچھے ہی رہ جائیں باقی وادی کے پہاڑ اتنے بلند ہیں کہ ان پر چڑھنا ممکن نہیں تو آپ ہمارے اور ان کے درمیان دیوار کھینچ دیں۔

یاجوج ماجوج کے بارے مفسرینِ کرام لکھتے ہیں کہ یہ نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ انسانوں میں سے ہیں لیکن جنگلوں اور ویرانوں میں جا کر یہ جاہل ہو گئے، ان میں درندگی آ گئی پھر ان کی شکل و صورت بھی بگڑ گئی، عجیب وغریب جانوروں جیسی ہو گئی۔ انسانوں میں سے ہونے کے باوجود یہ جانوروں سے بدتر ہیں توڑ پھوڑ، مار دھاڑ کرنے والی، لوٹ مار کرنے والی ظالم اور جاہل قوم ہیں شمالی بلند پہاڑوں کے درمیان ایک وادی ہے جس میں یہ رہتے ہیں۔

ذوالقرنین نے ان لوگوں کی شکایت سننے کے بعد کہا: قَالَ مَا مَكَّنِّىْ فِيْهِ رَبِّىْ خَيْرٌ فَاَعِيْنُوْنِىْ بِقُوَّةٍ اَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿۹۵﴾ مجھے تمہارے پیسے یا دولت کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے میرے اللہ کریم نے جو دے رکھا ہے وہ بے حساب ہے۔ اللہ کا دیا سرمایہ اور دولت میرے پاس بہت ہے تم قوتِ بازو سے میری مدد کرو۔ افرادی قوت جمع کرو کہ میں طویل سفر میں اپنے ساتھ مخصوص تعداد میں ہی افراد رکھتا ہوں۔ تم کام کرنے والے

افراد دو تو میں ان کے اور تمہارے درمیان رکاوٹ کھڑی کر دیتا ہوں تاکہ یہ ادھر نہ آسکیں اور تمہیں تنگ نہ کر سکیں: اٰتُوْنِیْ زُبَرَ الْحَدِیْدِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیْنَ الصَّدَفَیْنِ۔۔۔ پہاڑ کے درمیان کی ساری وادی میں آپ نے لوہے کی چادریں جوڑ کر پہاڑ نما دیوار کھڑی کر دی جو وادی سے لے کر پہاڑوں کی چوٹی تک تھی۔ جب وادی کے منہ کو لوہے کی چادروں سے دیوار بنا کر بھر دیا گیا تو آپ نے حکم دیا: قَالَ انْفُخُوْا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَهٗ نَارًا ۔۔۔ اب اسے آگ جلا کر دہکایا جائے۔ اُسے اس حد تک گرم کیا کہ وہ لوہا بھی آگ نظر آنے لگا بالکل انگاروں کی طرح سرخ ہو گیا۔ قَالَ اٰتُوْنِیْۤ اُفْرِغْ عَلَیْهِ قِطْرًا ﴿۹۶﴾ آپ نے فرمایا، اب پگھلا ہوا تانبہ لاؤ کہ اس پر ڈال دیا جائے۔ فَمَا اسْطَاعُوْۤا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾ یوں وہ لوہے کی چادروں سے بنا ہوا لوہے کا ایک پہاڑ بن گیا۔ ایک ایسی مضبوط دیوار بن گئی کہ نہ تو وہ اس پر چڑھ سکتے تھے اور نہ ہی اس میں نقب لگا کر سوراخ کر سکتے تھے۔ فرمایا، اب تم لوگ محفوظ ہو۔ اب اپنا کام کرو، امن ہو گیا ہے لہٰذا اپنے طریقۂ زندگانی کو درست کر لو۔ قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ ۔۔۔ فرمایا، یہ سب میرے پروردگار کی مہربانی ہے۔ انسان کچھ نہیں کر سکتا جو کام ہوتا ہے اللہ کریم کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس کی عطا ہوتی ہے میں کیا کر سکتا تھا اگر اللہ کریم توفیق نہ دیتے۔ یہ اللہ کریم کی رحمت ہے کہ اتنا بڑا کام ہو گیا، لوہے اور تانبے سے مضبوط دیوار بن گئی۔ اب تمہیں اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اللہ کی اطاعت اختیار کرنا چاہیے۔

یاد رکھو!: فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۔۔۔ جب اللہ کریم کا مقرر شدہ وقت آئے گا تو ہر چیز تباہ ہو جائے گی وَكَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا ﴿۹۸﴾ اور یقیناً میرے پروردگار کا وعدہ حق ہے۔ یہ قربِ قیامت کی نشانیوں میں سے ہے کہ وہ دیوار گرا دی جائے گی اور یاجوج ماجوج ان شمالی پہاڑوں کے پیچھے سے نکل آئیں گے۔ وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ یَوْمَئِذٍ یَّمُوْجُ فِیْ بَعْضٍ ۔۔۔ فرمایا، ہم اُن کو کھلا چھوڑ دیں گے۔ وہ انسانوں میں گڈمڈ ہو جائیں گے۔ دنیا پر بے پناہ قتل وغارت کریں گے، سب کچھ چٹ کر جائیں گے اور نسلِ انسانی کو تباہ کر دیں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بددعا سے اللہ ان پر کوئی وبا بھیج دے گا وہ سب کے سب مر جائیں گے، اُن کی لاشوں سے زمین بھر جائے گی، سخت تعفن پھیل جائے گا پھر اللہ کریم منحنی گردن والے پرندے بھیجے گا جو ان کی لاشوں کو اٹھا کر پھینک دینگے جہاں اللہ کی مرضی ہوگی پھر اللہ کریم بارش برسائے گا جو دیہات وشہر کے ہر گھر پر برسے گی یہ بارش زمین کو دھو کر ایسا کر دے گی جیسے اس پر جھاڑو پھیر دیا گیا ہو اور زمین صاف ہو جائے گی۔ وَّنُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَجَمَعْنٰهُمْ جَمْعًا ﴿۹۹﴾ پھر صور پھونکا جائے گا تو ہر ذی حیات مر جائے گا، پہاڑ اڑ جائیں گے، سمندر خشک ہو جائیں گے، زمین تہہ و بالا ہو کر ایک نئی زمین بن جائے گی جو بالکل ہموار میدان ہو گی جس میں نہ

پہاڑ ہوں گے نہ دریا و چشمے۔ وہاں ہم سب کو جمع فرمائیں گے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامِ قیامت تک کی ساری انسانیت کو زندہ کیا جائے گا، سب جمع کیے جائیں گے۔ تمام مخلوقات، چرند، پرند، حیوانات غرض سب مخلوقات کو میدانِ حشر میں جمع کیا جائے گا۔ جب ساری مخلوق کو جمع کر لیا جائے گا: وَعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا ۝ ہم کافروں کے سامنے جہنم لے آئیں گے۔ وہ کھل کر ان کے سامنے آجائے گی۔ دوسری جگہ ارشادِ باری ہے: وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى۔۔۔ (النّٰزعٰت: 36) دوزخ کو وہاں لایا جائے گا کہ جو نہیں مانتے تھے اب اسے دیکھ کر یقین کر لیں کہ یہ دوزخ ہے۔

سمع و بصارت کا صحیح مفہوم:

فرمایا: الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ۝ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کی آنکھیں میری یاد سے بند تھیں، پردے میں تھیں وہ سننے کی بھی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ سن کر پروا بھی نہیں کرتے تھے۔

فرمایا، سمع اور بصارت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ آنکھ جس چیز کو دیکھے تو صرف اس کی صورتِ حال سے ہی متاثر نہ ہو بلکہ اس کے نتائج پر بھی غور کرے کہ اس کا انجام کیا ہونے والا ہے، اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کان جس بات کو سنیں اس کا تجزیہ کریں اور ان میں جو حق ہے اسے قبول کریں اور غلط بات ہے تو اس کو رد کریں اور جو یہ کام نہ کرے تو گویا اس کی سمع و بصارت پردے میں رہی پھر وہ حیوانی سطح پر آ گیا کہ کان اور آنکھیں تو حیوانوں کے پاس بھی ہیں۔ ہر جانور آواز بھی سنتا ہے اور دیکھتا بھی ہے لیکن جانور خواہش کے تابع ہوتے ہیں۔ جانور کی خواہش بھوک ہوتی ہے یا جائے پناہ کی تلاش ہوتی ہے تو ہر جانور جائے پناہ بھی تلاش کر لیتا ہے اور خوراک بھی ڈھونڈ لیتا ہے۔ کوئی زمین میں کھوہ بنا لیتا ہے۔ کوئی درخت پر گھونسلا بنا لیتا ہے، کوئی خشکی پر رہتا ہے تو کوئی پانی میں۔ سمندر کی مخلوق اپنے ٹھکانے سمندر میں بنا لیتی ہے۔ وہیں رہتی ہے اور وہیں اپنی خوراک تلاش کر لیتی ہے۔ اپنا گزارہ کر لیتی ہے۔ اگر انسان بھی یہی کرے تو پھر جانوروں اور انسانوں میں کیا فرق رہا؟

انسان کی سمع و بصر کا مصرف یہ ہے کہ جو کچھ وہ دیکھے اس کے انجام کو بھی دیکھے۔ دنیا ہمارے سامنے گزر رہی ہے، جو گزر چکی ہے اس کی تاریخ اور واقعات موجود ہیں۔ تو ہمیں ان حالات سے عبرت حاصل کرنا چاہیے۔ کتنے لوگوں نے ظلم کر کے، لوٹ مار کر کے کتنی بڑی بڑی سلطنتیں بنائیں، کتنی بڑی بڑی رہائش گاہیں بنائیں، لاؤ لشکر بنائے۔ کہاں ہیں وہ لوگ اور ان کے وہ لاؤ لشکر اور وہ قلعے؟ اور جتنے لوگوں کو قتل کیا اور لوٹ مار کی اس کا عذاب ان کی

گردن پر سوار رہا۔ دنیا کی دولت تو اُن کی موت کے ساتھ ختم ہو گئی۔ زندگی ختم ہوئی تو اُن کی بادشاہت بھی گئی، دولت بھی گئی، حکومت بھی گئی، اقتدار بھی گیا اور یہ ضروری نہیں کہ بادشاہ ہی ظلم کرتے ہیں جو بندہ بھی ناجائز اور ناروا کرتا ہے وہ ظلم کرتا ہے۔ ہم اپنا حال دیکھیں تو ہم سارا شور حکمرانوں کے خلاف کرتے ہیں لیکن کیا عام آدمی ظلم نہیں کر رہا؟ دکان دار، تاجر، چھابڑی فروش کون نہیں کر رہا؟ جتنی زیادتی جس سے ہو سکتی ہے وہ کر رہا ہے۔ کرنا تو ہر ایک نے اپنی بساط کے مطابق ہی ہے لہٰذا اپنی حیثیت کے مطابق تو وہ بھی کر رہا ہے۔

فرمایا، نظر وہ ہے، بصارت وہ ہے جو ان چیزوں کے انجام تک پہنچے۔ تاریخ عالم تمہارے سامنے ہے، زمین کا سینہ کھلا ہوا ہے۔ بڑے بڑے عظیم بادشاہوں کے قلعے تمہارے سامنے کھنڈروں کی صورت میں عبرت کا نمونہ بنے ہوئے ہیں اور جن لوگوں نے نیکی کی، بھلائی کی اُن کا نیک انجام بھی تمہارے سامنے ہے۔ نیکی کا انجام ہمیشہ نیک ہوتا ہے۔ جس راستے پر کوئی چلتا ہے نتیجہ اُسی راستے کی انتہا ہوتی ہے۔ اگر کوئی برائی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو پھر برائی کی انتہا اس کا مقدر بن جاتی ہے پھر آخرت میں اسے برائی پیش آتی ہے۔ نیکی کی راہ پر چلتا ہے تو بھلائیاں اس کا مقدر بنتی ہیں، نیک انجام ہوتا ہے اور نیک نتائج ہوتے ہیں۔ فرمایا، دوزخ ان لوگوں کے لیے ہے الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ ۔۔۔ جن کی آنکھیں میری یاد سے پردے میں تھیں۔ ذکر عمل ہے، کام ہے۔ عمل ہاتھ پاؤں سے ہوتا ہے۔ ذکر زبان سے بھی ہوتا ہے۔ حقیقی ذکر وہ ہے جو دل سے ہوتا ہے، قلب سے ہوتا ہے۔

یہاں تو قرآنِ حکیم بتا رہا ہے کہ ان کی آنکھیں میرے ذکر سے میری یاد سے بند تھیں۔ فرمایا، انسانی آنکھ کا کمال یہ ہونا چاہیے کہ کسی چیز کو دیکھے تو اس کے نتیجے پر پہنچے اور کہے سبحان اللہ! بنانے والا کیا عظیم صنعت کار ہے! بصارت کی وجہ سے اس طرح یادِ الٰہی نصیب ہوگئی، ذکرِ الٰہی نصیب ہو گیا۔ کوئی اچھی عمارت دیکھتا ہے، اچھا پھل دیکھتا ہے، اچھا درخت دیکھتا ہے، اچھا سبزہ دیکھتا ہے کوئی کھانے والی اچھی چیز دیکھتا ہے، اچھا کپڑا دیکھتا ہے، اچھا گھر اسے نصیب ہوتا ہے تو جب بھی اُس پر نظر پڑے تو اللہ کی یاد تازہ ہو جائے کہ یہ اس کا احسان ہے، یہ پھل اللہ نے میرے لیے بنایا ہے، یہ رزق اللہ نے مجھے دیا، یہ لباس مجھے اللہ کریم نے عطا فرمایا ہے تو یہ آنکھ کا ذکر ہے۔ وہ آنکھ تو انسانی آنکھ نہیں جو اللہ کی عظمت تک نہ پہنچے۔ حیوانی آنکھ بھی چیزیں تو دیکھتی ہے، ایک جانور کو چھوڑ دیں تو وہ خشک چارے کو چھوڑ کر دوسری طرف سبزہ ہو تو وہ سبزے کی طرف چلا جائے گا یہ تمیز تو اسے بھی ہے لیکن اسے یہ نہیں پتا کہ خشک چارے کا خالق بھی وہی ہے اور سبزے کا خالق بھی وہی ہے، تو وہاں تک اس کی نگاہ نہیں پہنچتی، اس کو اللہ نے استعداد ہی نہیں دی۔ لیکن انسان تو جس چیز کو دیکھے اگر کسی کے تباہ شدہ قلعے دیکھے تو اس سے عبرت حاصل کرے کہ اُن لوگوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور اس نے انہیں برباد کر دیا۔ اُجڑی ہوئی بستیاں اور ویرانے اور تباہ شدہ مکانات اسے

اللہ کی یاد دلائیں۔ عالی شان محلات دیکھے تو پھر بھی اللہ کی یاد آئے کہ ان پر اللہ نے احسان کیا اور انہیں یہ نعمتیں عطا کیں۔ خود کو پیاس میں ٹھنڈا پانی ملے، بھوک لگے تو کھانا ملے تو وہ جو محسوسات ان نعمتوں کے استعمال کی ہیں وہ اللہ کی عظمت تک لے جائیں کہ الحمد للہ! اللہ نے مجھ پر احسان کیا ہے۔ فرمایا، اس بصارت کا صحیح استعمال تو یہ تھا کہ یہ دنیا کی نعمتیں اور دولت کو دیکھ کر میری عظمت کے قائل ہوتے اور ان کی بصارت بھی میرا ذکر کرتی لیکن یہ میری عطا کردہ دولت، نعمتیں استعمال کرتے رہے اور میری یاد بھولے رہے اُس پر ان کی طرف سے پردہ پڑا رہا۔ وَكَانُوا لَا يَسْتَطِيعُونَ سَمْعًا ﴿١٠١﴾ اور اسی طرح انہوں نے سماعت کو بھی استعمال نہیں کیا کہ کوئی اچھی بات سنتے اور میرا شکر ادا کرتے، کوئی بُری خبر سنتے تو اللہ کی عظمت سے پناہ چاہتے، اس بُری بات سے اللہ سے پناہ چاہتے، اللہ کریم سے حفاظت کا تقاضا کرتے۔

انسانی زندگی کا ہر لمحہ، ہماری زندگی کا ہر لمحہ ہمیں اللہ سے قریب کر رہا ہے یا اُس سے دور کر رہا ہے۔ ہر لمحے میں جو ہم سوچ رہے ہیں وہ اطاعتِ الٰہی ہے یا نافرمانی ہے، ہر لمحے جو ہم دیکھ رہے ہیں وہ اطاعت ہے یا نافرمانی، ہر لمحے میں جو کر رہے ہیں وہ اطاعت ہے یا نافرمانی ہے۔ ایک بزرگ سے کسی نے سوال کیا تھا کہ مجھے کوئی طریقہ بتائیں کہ میری اصلاح ہو جائے۔ انہوں نے فرمایا، آسان سا کام ہے علی الصبح اُٹھو تو ایک کاغذ اور قلم لے لو اور بیدار ہونے سے رات سونے تک جو بات کرتے ہو، لکھ لو۔ جو کام کرتے ہو وہ لکھ لو۔ رات سونے سے پہلے ایک دفعہ اُس سارے کو پڑھ لینا تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ دن بھر میں کتنی اطاعت کی ہے اور کتنی نافرمانیاں کیں۔ پھر تمہیں اس دن اندازہ ہوگا بلوغت سے لے کر وفات تک کے ہر لمحے ہر دن کا محاسبہ ہوگا کہ کتنی اطاعت اور کتنی نافرمانیاں کیں تو اللہ کرے تمہاری اصلاح ہو جائے لیکن ہماری مصیبت یہ ہے کہ ہم محاسبہ تو سارا دن کرتے ہیں لیکن دوسروں کا کرتے ہیں کہ فلاں نے یہ غلطی کی، فلاں نے یہ برائی کی، فلاں نے یہ کہا، فلاں نے یہ کیا۔ جن سے اپنا تعلق ہو، اُن کی نیکیاں گنتے رہتے ہیں، فلاں بڑا اچھا ہے اس نے یہ اچھا کام کیا۔ سب سے پہلے مقدم ہے کہ ہم اپنا جائزہ لیں کیونکہ ہمیں وہ بھگتنا ہے جو ہم نے کیا، جو دوسرے نے کیا، وہ اسے بھگتنا ہوگا۔ جو ہم نے کیا، وہ ہمیں بھگتنا ہوگا لیکن اس کی ہمیں فکر ہی نہیں ہوتی لہٰذا قرآن کریم کی آیات ہماری توجہ اس طرف دِلا رہی ہیں۔ ہمارا تو عالم یہ ہے کہ جب زندگی ختم ہونے پر آتی ہے تو ہم بڑے چیختے چلاتے ہیں، ڈاکٹروں کے پاس بھاگتے ہیں، پیروں کے پاس بھاگتے ہیں، تعویذ لیتے ہیں، دم کرواتے ہیں لیکن موت نہیں ٹلتی۔ کوئی ایسی جائے پناہ نہیں ہے کہ جب اللہ کی طرف سے زندگی ختم ہو جائے تو کوئی ایک دن، ایک گھنٹہ ایک لمحہ بڑھا سکے ایسا کوئی نہیں ہے اور زندگی کو ہم کیسے خرچ کر رہے ہیں؟ کسی سے پوچھیں کیا کر رہے ہو؟ تو کہتے ہیں

وقت گزار رہے ہیں۔ کیا وقت اتنا سستا ہے، وقت اتنی کم قیمت چیز ہے جسے تم گزارنے کے لیے سڑک پر ہوٹل پر آبیٹھے ہو، تاش کھیل رہے ہو، ریڈیو سن رہے ہو، ٹی وی دیکھ رہے ہو وقت بہت قیمتی چیز ہے جو لمحہ بیت گیا بیت گیا۔ اگر اب ایک دن کا تجزیہ شام کو کرو تو پتا چلتا ہے کہ دن بھر کتنے لمحات میں نے یادِالٰہی میں بسر کیے، کتنے کام میں نے اطاعتِ الٰہی میں کیے۔ عجیب بات ہے کہ ہم تاش کھیلنے لگ جائیں تو ہمیں بھوک لگتی ہے نہ پیاس، ساری ساری رات گزر جاتی ہے وہی بندہ اگر نماز پڑھنے کے لیے آئے تو اسے اتنی جلدی ہوتی ہے کہ وہ رکوع وسجود بھی پورے نہیں کرتا، کیا عجیب بات ہے، ہم نیکی کے کام میں وقت صرف کیوں نہیں کرتے کہ فارغ وقت ہے تو سکون سے دو رکعت نفل پڑھ لیں، تلاوت کرلیں، تسبیحات پڑھ لیں۔ کسی مثبت کام پر خرچ کرلیں۔

والدین کے کردار سے اولاد متاثر:

جب ملازمت پیشہ لوگ ملازمت کے وقت پر کام نہ کریں، دیر سے آئیں جلدی چلے جائیں، تنخواہ کا حق ادا نہ کریں تو رزق حلال نہیں رہے گا۔ اسی طرح تاجر، صنعتکار، دکاندار بدیانتی کرے گا تو خود بھی حرام کھائے گا بچوں کو بھی حرام کھلائے گا تو اُن کے دل میں نحوست ہوگی۔ وہ کہاں اچھے شریف انسان بنیں گے چور ڈاکو ہی بنیں گے جن کا ہمیں بہت شکوہ ہے۔ دہشت گردی ہو تو دہشت گردی ہم ہی پھیلا رہے ہیں۔ جب ہم بچوں کو حلال نہیں کھلاتے تو وہ دہشت گرد ہی بنیں گے ولی اللہ تو نہیں بنیں گے۔ فرمایا جارہا ہے کہ سمع وبصارت جیسی نعمتوں کی اہمیت کا ادراک کرو جو چیز دیکھو اس کے نتیجے تک جاؤ اور سمجھو کہ اللہ کریم نے اسے کتنا خوبصورت بنایا ہے یا جسے سزا ملی اسے اللہ کریم نے عبرت کا سبب بنادیا ہے، اس سے عبرت حاصل کرو۔ اللہ کی نعمتیں ملیں تو اللہ کا شکر ادا کرو۔ سمع اور بصارت اور زبان بھی اللہ کی یاد پر لگاؤ اور دلوں میں اللہ کو بساؤ کہ ہر دھڑکن میں دل ایک بار دھڑکے اور لاکھوں بار اللہ اللہ کہہ جائے، ایسا تب ہوتا ہے جب دل زندہ ہوتا ہے۔ کسی کو سات لطائف بھی نصیب ہوجائیں تو ساتواں لطیفہ سلطان الاذکار بندے کے ہر سیل کو ذاکر کردیتا ہے۔ ہر بندے میں دس کھرب سیل ہیں جب ہر سیل ذکر کرتا ہے تو دل ایک بار دھڑکتا ہے اور ذکر دس کھرب بار ہوتا ہے جس کا صرف سلطان الاذکار راسخ ہوجائے اس بندے کو بھی یہ نعمت نصیب ہوجاتی ہے کہ دل ایک بار دھڑکتا ہے اور اس کا وجود دس کھرب بار ذکر کرتا ہے۔ اس کے وجود کا ہر سیل (Cell) ذکر کرتا ہے۔ ایسی نعمتوں کی طرف آؤ، کہاں دنیاداری میں پھنسے ہوئے ہو جب دل زندہ ہوتا ہے تو پھر یہ چیزیں سامنے آجاتی ہیں، ان کو ہمیں (Face) کرنا ہے، سامنا کرنا ہے، ان سے ہمیں سابقہ پیش آنا ہے۔ اللہ کریم ہمیں اپنی یاد کی توفیق عطا فرمائے، ہماری خطاؤں سے درگزر فرمائے اور ہمیں نیکی پر گامزن رکھے۔ (آمین)

سورۃ الکھف رکوع 12 آیات 102 تا 110

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

أَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۚ اِنَّآ
اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿١٠٢﴾ قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ
اَعْمَالًا ﴿١٠٣﴾ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ
يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿١٠٤﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ
اَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيْمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾ ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ
بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿١٠٦﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿١٠٧﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ
عَنْهَا حِوَلًا ﴿١٠٨﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ
اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿١٠٩﴾ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ
يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ
عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿١١٠﴾

کیا کافروں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ میرے بندوں کو میرے سوا (اپنا) کارساز بنائیں گے یقیناً ہم نے کافروں کی دعوت کے لیے دوزخ تیار کر رکھی ہے ﴿۱۰۲﴾ فرمادیجیے کہ کیا ہم تمہیں بتائیں کہ جو لوگ اعمال کے اعتبار سے بالکل خسارے میں ہیں ﴿۱۰۳﴾ وہ جن کی محنت دنیا کی زندگی میں برباد ہوگئی اور وہ سمجھے ہوئے ہیں کہ

وہ اچھے کام کر رہے ہیں ﴿۱۰۴﴾ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اپنے پروردگار کی آیات اور اس کے سامنے جانے کو ماننے سے انکار کر دیا تو ان کے اعمال ضائع ہو گئے سو ہم قیامت کے دن ان کے لیے (نیک اعمال کا) کوئی وزن قائم نہیں فرمائیں گے ﴿۱۰۵﴾ اس لیے ان کی سزا جہنم ہے کہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیات اور میرے پیغمبروں کی ہنسی اڑائی ﴿۱۰۶﴾ یقیناً جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کے لیے جنت الفردوس (میں) مہمانی ہوگی ﴿۱۰۷﴾ اس میں ہمیشہ رہیں گے وہاں سے کہیں اور جانا نہ چاہیں گے ﴿۱۰۸﴾ فرما دیجیے کہ اگر سمندر میرے پروردگار کی باتوں کے لیے روشنائی بن جائے تو میرے پروردگار کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائے اور اگرچہ اس کی مدد کے لیے ہم ایک اور (سمندر) لے آئیں ﴿۱۰۹﴾ فرما دیجیے کہ بے شک میں تمہاری طرح کا بشر (آدمی) ہوں (البتہ) میرے پاس وحی آتی ہے یہ کہ تمہارا معبود وہی ایک معبود ہے پھر جو شخص اپنے پروردگار سے ملنے کی امید رکھے پس چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے ﴿۱۱۰﴾

تفسیر ومعارف

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ۔۔۔(الخ) فرمایا، کافروں نے کیا یہ سمجھ رکھا ہے کہ اگر وہ اللہ کریم کو چھوڑ کر مخلوق کو اپنا کارساز، اپنا مددگار اور معاون سمجھ لیں گے تو کیا اس کا کوئی نتیجہ سامنے نہیں آئے گا یا اس پر اللہ کریم کا غضب نازل نہیں ہوگا؟ دراصل شرک کی ساری بنیاد آخرت کو بھلا دینے پر ہے۔ آخرت کا یقین آدمی کو کفر و شرک سے محفوظ رکھتا ہے جب مقصد ہی دنیا ہو جائے اور آخرت فراموش کر دی جائے تو پھر آدمی دنیا کے وسائل اور دنیا ہی کی باتیں سوچتا ہے اور اسے دنیا کی چیزیں ہی نظر آتی ہیں جن کے لیے وہ ہمہ وقت دوڑتا رہتا ہے۔ فرمایا عجیب بات ہے کہ میری ذات واحد و لاشریک کو چھوڑ کر میری ہی مخلوق کو اپنا کارساز بنا لیتے ہیں۔ یہ بہت بڑا ظلم ہے۔اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان:13) یہ بہت بڑا جرم ہے کہ اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں کسی کو شریک کیا جائے۔ شرک کا پھر انجام یہ ہوگا: اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾ ان کی مہمانی کے لیے

اللہ کریم نے جہنم تیار کر رکھا ہے۔ جس کا خاتمہ کفر و شرک پر ہو اُس کی نجات کی کوئی امید باقی نہیں رہتی۔ خوش نصیب وہی ہے جسے زندگی میں توبہ نصیب ہو جائے، رجوع الی اللہ نصیب ہو جائے ورنہ اگر موت کفر و شرک پر آ جائے تو پھر ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب اُس کے مقدر میں ہو جاتے ہیں جو بہت بڑی تباہی ہے لیکن انسان دنیا میں اس قدر کھو جاتا ہے کہ اسے ہر طرف صرف دنیا ہی نظر آتی ہے اور اسی کو اپنا مقصد بنا لیتا ہے۔ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام جب مبعوث ہوتے ہیں تو وہ دلوں کو نور اور روشنی عطا فرماتے ہیں اور یہ دل ہے جسے جب ایمان نصیب ہوتا ہے تو یہ آخرت کے لیے انسان کو متوجہ کرتا ہے اور اُس کے اعضاء و جوارح کو آخرت کے حصول پر لگا دیتا ہے۔

دنیا میں بے شمار لوگ نورِ ایمان سے محروم ہیں اور انہوں نے اسی میں اپنے لیے عافیت ڈھونڈ لی ہے کہ ہمیں اس کی ضرورت ہی نہیں جب ہمارا کھانا پینا اچھا چل رہا ہے، گھر اچھے ہیں، گاڑیاں موٹریں، لباس اچھے ہیں تو اور تکلف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ سوچ اس لیے ہے کہ دل مردہ ہیں، نورِ ایمان سے خالی ہیں۔

انسان کے پاس علم حاصل کرنے کے تین ذرائع ہیں جو قرآنِ کریم نے بتائے، سمع و بصارت اور قلب (دل)۔ سمع و بصارت تو فطری طور پر ہر ایک کو حاصل ہوتی ہے اس سے علوم بھی حاصل کرتا ہے اور مادی نعمتوں سے لطف اندوز بھی ہوتا ہے۔

حقیقی ذریعہء علم دل ہے۔ یہ دونوں ذریعے یعنی سمع و بصارت بھی تب صحیح کام کرتے ہیں جب تیسرا ذریعہء علم یعنی دل زندہ ہو۔ اگر دل زندہ ہو جائے تو پھر انہیں بھی ہر چیز میں عبرت اور نصیحت اور آخرت کی یاد حاصل ہوتی ہے ورنہ پھر یہ بھی حصولِ زر میں اور دنیوی ضرورتوں میں کھوئے رہتے ہیں۔ جب دنیا کی زندگی ختم ہوتی ہے تو دنیوی سہولتیں اور دنیوی آسائشیں، مال و دولت سب کچھ یہیں رہ جاتا ہے۔ ابدی زندگی کے لیے انہوں نے کچھ کیا نہیں ہوتا تو آخرت میں خالی ہاتھ رہ جاتے ہیں۔ جب بندہ دنیا میں کھو جاتا ہے تو پھر اسے عظمتِ الٰہی بھی نظر نہیں آتی پھر وہ دنیا ہی کی پوجا میں لگا رہتا ہے یا پھر دنیاداروں کی پوجا میں لگا رہتا ہے اور یوں کفر و شرک میں مبتلا ہو کر تباہ ہو جاتا ہے۔

فرمایا، جو لوگ میرے علاوہ مخلوق کو معبود بنا لیتے ہیں، اپنا کارساز بنا لیتے ہیں تو ان کے یہ مددگار، معاون، دوست، تو دنیا میں ہیں۔ دنیا کے یہ چند روز گزر جائیں گے۔ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿۱۰۲﴾ جن کا کفر پر خاتمہ ہوگا، ان کی مہمانی کے لیے ہم نے دوزخ تیار کر لی ہے اور دوزخ بہت ہی بری جگہ ہے، بہت ہی تکلیف دہ ہے۔ فرمایا، فرما دیجیے اے لوگو! هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾ کیا میں تمہیں ان لوگوں کے بارے بتاؤں جو اپنے کردار اور اعمال کے اعتبار سے بالکل خسارے میں جا رہے ہیں نقصان میں جا رہے ہیں؟ یعنی عجیب بات یہ ہے کہ رات دن محنت بھی کرتے ہیں مجاہدہ بھی کرتے ہیں راتوں کو بھی جاگتے ہیں دنوں کو بھی مشقت کرتے ہیں لیکن وہ سب کچھ ضائع

جا رہا ہے، اکارت جا رہا ہے۔ اَلَّذِیۡنَ ضَلَّ سَعۡیُهُمۡ فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا ۔۔۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی ساری کوششیں محض حصولِ دنیا میں لگی ہوئی ہیں یہ حد سے بڑھ کر محنت کرتے ہیں، رات دن کوشاں رہتے ہیں ان کے پاس کوئی وقت فرصت کا نہیں ہے۔ جدید ایجادات نے تو انسانوں کو اور مصروف کر دیا ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے بھی ٹیلی فون بج رہا ہے۔ جب دیکھو کسی سے بات کر رہے ہیں یا پھر ٹی وی دیکھ رہے ہیں۔ اپنے بزنس کی بات ہو رہی ہے، کسی کی خوشامد ہو رہی ہے، کہیں سے حصولِ زر کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ جب انہیں دنیا کی دولت حاصل ہوتی ہے یا دنیوی فوائد حاصل ہوتے ہیں تو: وَهُمۡ یَحۡسَبُوۡنَ اَنَّهُمۡ یُحۡسِنُوۡنَ صُنۡعًا﴿۱۰۴﴾ سمجھتے ہیں کہ بہت اچھے کام کر رہے ہیں اور کامیاب انسان ہیں لیکن آخرت کو بھلا کر کوئی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

جائز وسائل سے آسائش حاصل کرنا بُرا نہیں:

جائز وسائل سے کمانے، جائز طریقے پر خرچ کرنے سے، آرام سے رہنے سے، اسلام منع نہیں فرماتا لیکن جب اللہ کو بھول کر بندہ دنیا میں گم ہو جائے تو یہ بہت نقصان کی بات ہے۔ حلال طریقے سے دنیا کمائے تو اُس کی ہر محنت میں اللہ کی یاد موجود ہوتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلی آلہٖ وسلم کا اتباع موجود ہوتا ہے، آخرت کی یاد موجود ہوتی ہے اس لیے اسے تو دنیا کہا نہیں گیا وہ تو سارا دین ہے۔ مرد اگر حلال روزی کمانے کے لیے محنت کرتا ہے تو اللہ کا حکم ہے کہ محنت کرے تو وہ تو دین ہو گیا، اللہ کا حکم بجالانا تو عبادت ہے۔ حلال رزق خود کھاتا ہے، بچوں کو پالتا ہے تو وہ عبادت ہے دنیا تو نہ ہوئی، وہ تو دین ہو گیا کیونکہ اللہ کا حکم ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ عالی کا مفہوم ہے کہ مومن کی دنیا بھی دین ہے جبکہ کافر کا دین بھی دنیا ہے۔ وہ دین کے نام پر بھی دنیا کی رسومات ہی ادا کرتا ہے اور اس سے مقصد بھی حصولِ دنیا ہی ہوتا ہے۔ جو لوگ اللہ کریم کو بھول کر اندھا دھند حصولِ دنیا میں لگ گئے جائز ناجائز طریقے سے دولت جمع کر رہے ہیں۔ جائز ناجائز وسائل سے اقتدار حاصل کر رہے ہیں اور اپنے تئیں یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بڑے کامیاب ہیں تو یہ خود فریبی ہے۔ اُن کے اعمال اکارت جائیں گے۔

کیا چیز اعمال کو اکارت کر دیتی ہے؟

فرمایا: اُولٰٓئِکَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمۡ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتۡ اَعۡمَالُهُمۡ فَلَا نُقِیۡمُ لَهُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ وَزۡنًا﴿۱۰۵﴾ ان کی مصیبت یہ ہے کہ جب وہ اللہ کریم کی آیات اور اُس کے حضور پیشی کو بھول کر اس کا انکار کر کے صرف دنیا میں لگ گئے تو دنیا کی ساری وہ محنت جس میں اللہ کے ساتھ ایمان شامل نہ ہو اللہ کی یاد شامل نہ ہو،

آخرت کا یقین نہ ہو اور جس کا طریقہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنّت کے مطابق نہ ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق نہ ہو تو اُس کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں۔ فرمایا: فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَزْنًا﴿۱۰۵﴾ قیامت کے دن اُس عمل کا کوئی وزن نہیں ہوگا، اُس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی، وہ خاک کی طرح اُڑ جائے گا کیونکہ وہ باطل ہے اور باطل کا مقدر تباہی اور بربادی ہے۔ سب سے زیادہ نقصان میں وہ لوگ ہیں جو ناجائز ذرائع اختیار کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگر انہیں عہدہ مل گیا تو وہ بڑے کامیاب ہیں۔ حکومت مل گئی، اقتدار مل گیا، دولت مل گئی، شہرت مل گئی تو یہ بڑی کامیابی ہے۔ فرمایا، یہ سب وقتی اور لمحاتی چیزیں ہیں تم سے زیادہ امیر لوگ دنیا سے رخصت ہو گئے اُنہیں کوئی نہیں جانتا تم سے زیادہ عہدیدار اور بڑے بڑے مطلق العنان حکمران دنیا سے چلے گئے اب انہیں کوئی نہیں جانتا۔ تم بھی چلے جاؤ گے مِٹ جاؤ گے کچھ نہیں ہوگا۔

ہمیں ہر عمل میں یہ خیال رکھنا چاہیے کہ جب یہ عمل اللہ کے حضور پیش ہوگا، بارگاہِ الٰہی میں جائے گا، میدانِ حشر میں پیش ہوگا تو اُس کا کوئی وزن ہونا چاہیے۔ فرمایا یہ لوگ جو آخرت کو اور اللہ کے حضور پیشی کو بھول کر اندھا دھند دنیا میں لگے ہوئے ہیں ان کے کردار کا تو کوئی وزن نہیں ہوگا کیونکہ وزن ہوتا ہے نورِ ایمان سے اور اتباعِ شریعت سے۔ آخرت میں ہر کام کا وزن یہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم کے مطابق ہو اور اُس کا طریقہ وہ ہو جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا یا اختیار فرمایا۔ اللہ کی اطاعت ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے کے مطابق ہو تو ان شرائط کے ساتھ جتنا پھر اس میں خلوص ہوگا اتنا اس میں وزن ہوگا۔

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ارشادِ عالی ہے جس کا مفہوم ہے کہ زندگی میں جس کی ایک تسبیح قبول ہوگئی اس کی نجات کے لیے کافی ہے یعنی زندگی میں کسی نے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہا اور وہ قبول ہو گیا مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ کہا قبول ہو گیا۔ زندگی میں ایک بار سبحان اللہ کہا قبول ہو گیا۔ ایک بار اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا قبول ہو گیا تو وہ نجات کے لیے کافی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ خلوص سے ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دائرہ اطاعت کے اندر ہو۔

ناجائز امور سے بچو:

کچھ لوگوں نے قرآنِ کریم سے عملیات بنانا شروع کر دیے ہیں کہ قرآن کی فلاں آیت کو ایسے لکھو فلاں کو اُلٹا لکھو فلاں کو سیدھا لکھو فلاں کو کالے بکرے کے خون سے لکھو فلاں کو مرغ کے خون سے لکھو حتیٰ کہ پیشاب تک سے لکھتے ہیں اب کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ آیات تو قرآن ہی کی لکھ رہے ہیں۔ کیا اس پر ثواب ہوگا یا عذاب ہوگا؟ قرآن کوئی جادو کی کتاب نہیں ہے، اللہ کی کتابِ ہدایت ہے۔ اللہ اور بندے کے رشتے پر بحث کرتی ہے، دنیا اور آخرت پر بحث کرتی ہے، کفر و اسلام کی نشان دہی کرتی ہے، حق اور باطل کے درمیان فرق واضح کرتی ہے۔ اب جو اس کا مقصد ہے

اسے چھوڑ کر اسے حصولِ دنیا کا ذریعہ بنالو اتنے پیسے دے دو یہ تعویز لوتو ایسے لوگوں کو اللہ کی بارگاہ کی حضوری یادنہیں۔ انہیں یادنہیں ہے کہ کل بارگاہِ الٰہی میں پیش ہونا ہے۔جب یہ بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوں گے تو سارا مجاہدہ جو انہوں نے اللہ پر ایمان کے بغیر اور آخرت کی حاضری کو مانے بغیر کیا ہوگا اُس کی کوئی حیثیت نہیں ہوگی، وہ کوئی کام نہیں آئے گا اُس میں کوئی وزن نہیں ہوگا۔ فرمایا: ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا﴿۱۰۶﴾ اس کی سزاان کے لیے جہنم ہوگی۔اس لیے کہ انہوں نے انکار کا راستہ اختیار کیا اور میری آیات اور میرے انبیا کا مذاق اڑایا۔اللہ کی آیات سنتے تھے تو مذاق کرتے تھے کہ یہ کب ہوگا، کیسے ہوگا؟ جب بدن مٹی میں مل جائیں گے تو پھر کیسے بنیں گے؟ موت کے بعد تو ہم نے کسی کو زندہ ہوتے دیکھا نہیں۔اگر موت کے بعد زندگی ہے تو ہمارے باپ داداؤں کو زندہ کر لاؤ۔اس طرح کے طنز کرتے تھے اور انبیاؑ کے منصبِ نبوت کا مذاق اڑاتے تھے لیکن جو شخص دعویٰ ایمان بھی رکھتا ہے اور اپنے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اطاعت نہیں کرتا، زندگی نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حوالے سے بسر نہیں کرتا وہ کیسا عجیب آدمی ہے، کیسا عجیب ایمان ہے اُس کا کہ ایک ہستی کو نبیؑ بھی مانتا ہے اور اُس کا اتباع بھی نہیں کرتا، اطاعت بھی نہیں کرتا۔یہ تو دو متضاد باتیں ہیں۔

اطاعت نہ کرنا نہ ماننے کے مترادف ہے:

وہ تو کفار کی بات ہو رہی تھی اور ہمارا طرزِ عمل یہ ہے کہ جب اس طرح کی آیت آتی ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ تو کافروں کے لیے ہے اور ہم بے فکر ہو جاتے ہیں کہ میں کافر تو نہیں ہوں۔یہ آیات واقعی کافروں کے لیے ہی ہیں لیکن کفر ہے کیا؟ اللہ پر ایمان نہ لانا اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر ایمان نہ لانا ہی کفر ہے نا۔ہم تو ایمان لے آئے ایمان نہ لانے اور ایمان لانے میں فرق کیا ہے؟ ایمان نہ لانے والا بات نہیں مانتا، اطاعت نہیں کرتا۔جو ایمان لانے والا ہے وہ ساری باتیں مانتا ہے، اطاعت کرتا ہے۔اگر کوئی ایمان کا دعویٰ کر کے اطاعت نہیں کرتا تو پھر اُس کا ایمان کیسا ہے؟ آپ کسی سے کہتے ہیں مجھے پانی کا ایک گلاس پلا دو کہتا ہے جی آپ کی بات مان لی لیکن میں آپ کو پانی نہیں پلاتا تو آپ کیا سمجھیں گے اُس نے آپ کی بات مانی؟ جب ہم اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے معاملہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں ہم ایمان لائے اور کلمہ بھی پڑھتے ہیں لیکن ہم کام اپنی مرضی سے کریں گے جیسے خود کو پسند ہے ویسے کریں گے، جیسا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا نہیں کریں گے۔ایمان لائے ہیں لیکن سود بھی کھائیں گے، ایمان لائے ہیں لیکن عبادت بھی نہیں کریں گے، ایمان لائے ہیں لیکن نیکی اختیار نہیں کریں گے تو یہ کون سا ایمان ہے؟ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ زبان سے یہ کہہ دینا، میں ایمان لایا ہوں میں مسلمان ہوں یہ ایک دعویٰ ہے۔ہر دعویٰ اپنے گواہوں سے ثابت ہوتا ہے نرا کہہ دینا کافی نہیں ہوتا اس پر شہادت موجود ہوتی ہے تب وہ

ثابت ہوتا ہے اور ایمان بھی ایک دعویٰ ہے اس پر گواہ ہیں اعمال۔ اگر اعمال اُس کی تائید کرتے ہیں تو دعویٰ سچا ہے، اعمال اُس کی تردید کرتے ہیں تو دعویٰ سچا نہیں ہے لہٰذا ہمیں دوسروں پر آیات چسپاں کرکے آگے نہیں گزر جانا چاہیے بلکہ ہر آیت کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنا چاہیے۔ قرآن کی ہر آیت انسان کو آئینہ دکھاتی ہے، تصویر سامنے رکھ دیتی ہے ہمیں خود کو جانچنا چاہیے کہ ہمارا کردار اس آیۂ کریمہ کے ارشاد کردہ معیار سے کتنا قریب ہے یا کتنا دور ہے؟ جیسا کہ ارشادِ باری ہے: اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۔۔۔(البقرہ:208) پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ فرمایا، جنہوں نے آخرت کو بھول کر ناجائز ذرائع اختیار کیے، رشوت، ڈاکہ، چوری سے دولت جمع کر لی یا چھینا جھپٹی، ہیرا پھیری سے عہدہ و اقتدار حاصل کر لیا، تو دنیا کی زندگی چند روزہ ہے، گزر جائے گی۔ پھر ان غیر شرعی کاموں کا محاسبہ ہوگا۔ ان کے اعمال کا آخرت میں کوئی وزن نہیں ہوگا، کوئی حیثیت نہیں ہوگی اور انجام کار اُن کے اس کردار کی سزا جہنم ہوگی اس لیے کہ انہوں نے نہ اللہ کی عظمت کا لحاظ کیا اور نہ انبیاؑ کا اور نہ اللہ کی آیات کا بلکہ تمسخر اُڑاتے رہے اور مذاق کرتے رہے تو اُس کے نتیجے میں انہوں نے دنیا میں جتنا زیادہ عیش کر لیا اقتدار حاصل کر لیا یا جتنی زیادہ دولت جمع کر لی اتنا ہی اس سب کا محاسبہ ہوگا، اتنی ہی زیادہ تکلیف بھی ہوگی: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۝ فرمایا، جن لوگوں کو ایمان نصیب ہوا جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے ان کی مہمانی کے لیے جنّت ہے۔

قرآن کریم میں جہاں بھی ایمان کا تذکرہ آتا ہے ساتھ عملِ صالح کی بات آجاتی ہے۔ عملِ صالح یا اچھا کام کون سا ہے؟ میرے خیال میں دنیا میں جو بھی کوئی کام کرتا ہے وہ اپنی طرف سے بُرا نہیں کرتا۔ سمجھتا ہے میں اچھا ہی کر رہا ہوں۔ ہر بندے کا اچھائی کا اپنا معیار ہے تو اچھائی درحقیقت کیا ہے، کام اچھا کون سا ہے؟ ہر وہ کام اچھا ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم کے مطابق ہو جہاں کوئی کام حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے حکم کی حدود سے باہر چلا جائے اُس میں کوئی اچھائی نہیں ہے خواہ وہ عبادت ہی ہو۔ عبادات کے لیے بھی ضروری ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے اندر ہوں جیسے فجر کی دو رکعت فرض ہیں کوئی کہتا ہے کہ دن بھر تو مجھے کام نہیں ہوتا میں دو کی بجائے چار پڑھوں گا۔ اگر وہ چار پڑھے گا تو اس کے دو فرض بھی ادا نہیں ہوں گے کیونکہ ضروری صرف فرض پڑھنا ہی نہیں بلکہ اُس طرح سے پڑھنا ضروری ہے جس طرح حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم نے سمجھایا ہے، اُس طریقے کے مطابق، اُس قاعدے کے مطابق۔ یہی حال سارے اعمال کا ہے۔ اپنی رائے سے، اپنی پسند سے عمل کرے گا تو اُس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی سنّت کے مطابق کرے گا تو وہ اللہ کے ہاں مقبول ہوگا۔ ہمیں اپنے اعمال کو اس طرح پرکھنا چاہیے۔ الحمدللہ ہمارا دعویٰ بھی ہے اور اللہ ہمیں نصیب بھی کرے۔

فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۔۔۔ یقیناً جولوگ ایمان لاتے ہیں اور: وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۔۔۔ عمل بھی صحیح کرتے ہیں، ایمان کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں: كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾ اُن کے لیے اللہ نے جنّت میں ان کی مہمانی تیار کررکھی ہے۔ جنّت اتنی بڑی نعمت ہے اور ایسی عظیم دولت ہے خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾ اُس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اور کہیں جانا بھی نہیں چاہیں گے یعنی اُس کی نعمتیں اس قدر ہیں کہ کوئی جنّتی یہ نہیں سوچے گا کہ اسے چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔ اُس کی نعمتیں ایسی ہیں کہ اہلِ جنّت، جنّت کو چھوڑ کر جانے کا سوچ بھی نہیں سکیں گے۔ انسانی مزاج عجیب ہے، اعلیٰ سے اعلیٰ نعمتوں سے بھی اکتا جاتا ہے۔ شاہی محلات میں رہ کر بھی اکتا جاتا ہے اسے یہ لالچ ہوتا ہے کہ فلاں کا محل بھی قبضہ میں لے لوں۔ فلاں کو بھی اپنی سلطنت میں شامل کرلوں۔ کتنے انسان اسی لالچ میں لڑتے جھگڑتے مر گئے۔ انسان کا جی سیر نہیں ہوتا تو یہ جنّت کیسی جگہ ہے کہ جہاں اُس کا جی لگ جائے گا اور وہ وہیں مقیم ہو جائے گا۔ فرمایا، جنّت کی نعمتیں اللہ کی عطا ہیں اور اللہ کی عطا لامحدود ہے۔

فرمایا: قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾ (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) فرمادیجیے، اللہ جلّ شانہٗ کی نعمتوں کی باتیں، اس کی عظمت کی باتیں اُس کی عطا اور اُس کے کرم کی باتیں اگر تم لکھنا شروع کردو اور یہ سارے سمندر سیاہی بن جائیں اور لکھتے لکھتے سمندر ختم ہوجائیں، اتنے ہی اور بھی لے آئیں تو وہ بھی ختم ہوجائیں گے اللہ کی باتیں اُس کی صفات اُس کی شان کا ذکر ختم نہیں ہوسکتا۔ وہ بڑی قدرت والا، بڑی شان والا ہے۔ جنّت کی نعمتیں اور اُن میں لذتیں پیدا کرنے والا ہے لہٰذا جنّت کی نعمتیں اور اس کی لذتیں کبھی ختم نہیں ہوں گی بلکہ جنّتی اگر ایک ہی پھل سے یا ایک ہی کھانے سے ایک لقمہ کھائے گا اور اسی کھانے سے یا اُسی پھل سے دوسرا لقمہ لے گا تو وہ پہلے سے زیادہ لذیذ ہوگا۔ جنّت کی نعمتیں اور کی لذتیں بڑھتی ہی جائیں گی۔ انسان عادی نہیں ہوسکے گا کہ روزانہ وہی چیزیں ہیں اُن کا عادی ہوگیا۔ انسان جب ایک چیز کا عادی ہوجاتا ہے تو پھر مزید لذت چاہتا ہے کہ اس سے بہتر کوئی چیز ہونی چاہیے۔ جنّت کی تو ہر نعمت ہر لمحہ بڑھتی رہے گی، ہر لذت ہر لمحہ بڑھتی رہے گی اس لیے انسان وہاں سے کہیں اور جانا نہیں چاہے گا یہ نعمتیں اُس ہستی نے بنائی ہیں کہ جس کی باتیں جس کی شان، جس کی صفات اگر تم لکھنا چاہو اور ایسا ممکن ہو کہ یہ سارے سمندر سیاہی بن جائیں اور اس سیاہی کو استعمال کرکے تم لکھتے جاؤ تو سارے سمندر ختم ہوجائیں اتنے ہی پھر اور لے آؤ تو بھی اللہ کی باتیں اور اُس کی صفات اُس کی شان اس کی عظمت کا ذکر ختم ہونے میں، احاطہ کرنے میں نہیں آئے گا۔ جنّت بھی اس نے بنائی ہے اس کی لذتیں بھی ابدالآباد ختم نہیں ہوں گی روز افزوں ترقی ہوتی رہے گی۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشرِ کامل:

فرمایا: قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ۔۔۔ انہیں فرما دیجیے کہ میں تمہیں آخرت کی، جنّت کی، اللہ کی نعمتوں کی باتیں اس لیے نہیں بتا رہا کہ تم میری پوجا شروع کر دو۔ نہیں۔ تم بھی انسان ہو آدم علیہ السلام کی اولاد ہو، میں بھی انسان ہوں آدم علیہ السلام کی اولاد ہوں۔ معبود نہیں ہوں۔ میں خود اللہ کی عبادت کرنے والا ہوں تم سب کو عظمتِ الٰہی سے آشنا کرنے والا ہوں۔ انسان تم بھی ہو انسان میں بھی ہوں يُوْحٰٓى اِلَيَّ۔۔۔ لیکن مجھ پر وحی آتی ہے میری تخصیص یہ ہے کہ مجھ پر اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے، اللہ کی طرف سے احکام آتے ہیں، اللہ کا کلام نازل ہوتا ہے۔ وہ میں تم تک پہنچا رہا ہوں۔ میں خود اللہ کی عبادت کرتا ہوں تم بھی اللہ کی عبادت کرو۔

معبود، صرف اللہ ہے:

ایک مرتبہ ماہ ربیع الاوّل کی مناسبت سے سیرت طیبہ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر پروگرام میں شمولیت کی سعادت ملی۔ وہاں کچھ نوجوان تھے جو فوج میں نئے نئے آئے ہوئے تھے کچھ آفیسرز بھی تھے، کچھ پرانے کچھ نئے۔ انہوں نے تقریریں کیں۔ آخر میں میرا بیان تھا تو ایک لڑکا سا تھا لیفٹیننٹ یا سیکنڈ لیفٹیننٹ۔ نیا نیا کاکول سے پاس ہو کر آیا تھا۔ اُس نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات پر بڑا خوبصورت مقالہ پڑھا اُس میں ایک بات یہ بھی تھی (جو مجھے کبھی نہیں بھولتی) کہ جب اللہ کی مخلوق حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف متوجہ ہوئی تو کوئی بھی بڑا آدمی جو ہوتا ہے جب لوگ اُس کے پیچھے لگ جاتے ہیں تو لوگوں سے اپنی بڑائی منواتا ہے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کو جب مخلوق نے قبول کرنا شروع کیا اور مسلمانوں کی کثرت ہونا شروع ہوئی تو کسی شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنے سامنے جھکنے پر مجبور نہیں کیا، اپنے سامنے جھکنے کی دعوت نہیں دی بلکہ فرمایا، میں اللہ کا رسولؐ ہوں میرا کام ہے تمہیں دین بتانا۔ معبود صرف اللہ ہے تمہیں بھی اللہ کی عبادت کرنی ہے اور مجھے بھی اللہ کی عبادت کرنی ہے تو میرے برابر کھڑے ہو جاؤ میں بھی اللہ کے سامنے سربسجود ہوتا ہوں تم بھی اللہ کے سامنے سربسجود ہو جاؤ۔ اُس نے کہا کہ یہ کام صرف سچا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کر سکتا ہے، کوئی دنیوی لیڈر نہیں کر سکتا۔ دنیادار کے پاس تو چار بندے جمع ہو جائیں وہ اُن کو اپنی خدمت پر لگا لیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا جیسے میں سجدہ کرتا ہوں ویسے تم بھی سیدھے اللہ کو سجدہ کرو۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے بندوں کو اللہ سے واصل کر دیا۔

یہاں وہی بات ارشاد ہو رہی ہے۔ فرما دیجیے: یقیناً اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔۔۔ انسان ہونے میں، میں بھی تمہاری طرح انسان ہوں، مجھے بھی میری والدہ نے جنا، میرے بھی والد بزرگوار تھے، میری بھی نسل تھی، میرے بھی دادا پردادا تھے،

میں بھی آدم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہوں، میں بھی کھاتا پیتا ہوں، لباس پہنتا ہوں، سوتا ہوں، جاگتا ہوں جو بشری تقاضے ہیں وہ سارے میرے اندر بھی موجود ہیں۔ تم بھی بشر ہو، میں بھی بشر ہوں لیکن فاصلہ اس طرح بڑھ گیا ہے کہ یُوْحٰٓی اِلَیَّ ۔۔ مجھ پر اللہ کریم کی طرف سے وحی آتی ہے لہٰذا میں امام بن گیا ہوں۔ اللہ کی طرف دعوت دینا میرا منصب ہے اور تمہارا کام اس دعوت کو قبول کر کے راہِ راست پانا ہے۔ انسان ہونے میں فرق نہیں ہے فرق یہ ہے کہ میں اللہ کا نبی (علیہ الصلوٰۃ والسلام ہوں) اور تم غیر نبی ہو چونکہ میں بھی انسان ہوں تو انسان، انسان کی عبادت نہیں کرتا دونوں ایک طرح کی مخلوق ہوتے ہیں۔ عبادت کی جاتی ہے اس کی جو سب سے الگ اور سب سے اعلیٰ تر ہوتا ہے۔ سب سے اعلیٰ تو اللہ ہے۔ اُس کے برابر کا تو کوئی نہیں ہے لہٰذا میں تمہیں دعوت الی اللہ دیتا ہوں۔ فرمایا: اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۔۔۔ میں تمہیں یہ خبر دیتا ہوں کہ تمہارا معبود وہی ایک معبودِ برحق ہے، سب کا معبود، لائقِ عبادت صرف اللہ ہے۔

اللہ کی الوہیت کے اقرار سے پہلے غیر اللہ کا انکار ضروری ہے:

ہر دعوت اقرار سے شروع ہوتی ہے۔ اسلام اللہ کا ایسا دین ہے جو شروع انکار سے ہوتا ہے یعنی پہلے باطل کا انکار کرو۔ یہ نہیں کہ باطل کو بھی مانتے ہیں، حق کو بھی مانتے ہیں۔ یہ ماننا نہ ماننے کے برابر ہے۔ پہلے کہو: لَآ اِلٰهَ ۔۔۔ کوئی قابلِ عبادت ہے ہی نہیں کہ کوئی ایسی ہستی ہے ہی نہیں جس کی عبادت کی جائے لَآ اِلٰهَ ۔۔ کوئی معبود نہیں اِلَّا اللہ ۔۔ سوائے اللہ کے یعنی جس طرح حق کو قبول کرنا ضروری ہے اسی طرح ردِ باطل بھی ضروری ہے یعنی باطل کا ردِ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا حق کو قبول کرنا ضروری ہے بلکہ باطل کا ردِ پہلے ہے اور باطل کو ردِ کر کے لوحِ دل صاف کر کے اُس پر اللہ کا نام لکھو۔ پہلے سب کچھ صاف کرو کہ کوئی بھی لوحِ دل پر لکھے جانے کے قابل نہیں۔ کوئی معبود ہے ہی نہیں۔ جب تمہاری لوحِ قلب صاف ہو جائے اب اُس پر لکھو کہ اللہ ہے۔ اُس کی عبادت کی جائے گی۔ اللہ اس طرح لاشریک ہے فرمایا: اَنَّمَآ اِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۔۔ یقیناً تمہارا معبود اور لائقِ عبادت الٰہ واحد ہے۔ فرمایا: فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ ۔۔۔ اور جسے اس بات پر یقین ہو جائے کہ مجھے اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔ بارگاہِ الوہیت میں میری پیشی ہونی ہے ایک دن آنا ہے جب مجھے اُس کے حضور کھڑا ہونا ہے: فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا ۔۔ تو یاد رکھو کہ پھر وہ شخص عملِ صالح کرے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرے۔ اپنے اعمال کو شریعت کے سانچے میں ڈھال لے: وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾ اور اللہ کی عبادت کرے۔ اُس میں کسی کو شریک نہ کرے۔ کسی دوسرے کو اپنا مشکل کشا، اپنا حاجت روا نہ مانے۔ اللہ کریم سے ساری بات کرے اور اُسی کی بارگاہ سے ہر چیز چاہے۔ اُس کی ذات اُس کی صفات میں کسی کو شریک کرنے کی جرأت نہ کرے تب بات بنے گی۔

سورۃ مریم رکوع 1 آیات 1 تا 15

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

كٓهٰيٰعٓصٓ ① ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ② إِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً
خَفِيًّا ③ قَالَ رَبِّ إِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّأْسُ شَيْبًا وَّلَمْ
أَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ④ وَإِنِّيْ خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِنْ وَّرَآءِيْ وَكَانَتِ
امْرَأَتِيْ عَاقِرًا فَهَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ⑤ يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ
يَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ⑥ يٰزَكَرِيَّآ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ
يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ⑦ قَالَ رَبِّ أَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ
وَّكَانَتِ امْرَأَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ⑧ قَالَ كَذٰلِكَ
قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْـًٔا ⑨ قَالَ
رَبِّ اجْعَلْ لِّيْ اٰيَةً قَالَ اٰيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ⑩
فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَأَوْحٰى إِلَيْهِمْ أَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً
وَّعَشِيًّا ⑪ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ⑫ وَّحَنَانًا
مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً وَكَانَ تَقِيًّا ⑬ وَّبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا
عَصِيًّا ⑭ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ⑮

کٓھٰیٰعٓصٓ۔ ﴿۱﴾ یہ تذکرہ ہے آپ کے پروردگار کی مہربانی فرمانے کا اپنے بندے
زکریا (علیہ السلام) پر ﴿۲﴾ جب انہوں نے اپنے پروردگار کو پوشیدہ طور پر

پکارا ﴿۳﴾ انہوں نے عرض کیا اے میرے پروردگار! بے شک میری ہڈیاں (بڑھاپے کی وجہ سے) کمزور ہوگئی ہیں اور بڑھاپے کا شعلہ سر سے جا نکلا ہے اور اے میرے پروردگار! میں آپ سے مانگ کر کبھی محروم نہیں رہا ﴿۴﴾ اور یقیناً میں اپنے بعد اپنے رشتہ داروں سے ڈرتا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے پس آپ مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرمایئے ﴿۵﴾ جو میری اور اولاد یعقوب (علیہ السلام) کی میراث کا مالک بنے اور اے میرے پروردگار! اس کو (اپنا) پسندیدہ (بندہ) بنایئے ﴿۶﴾ اے زکریا (علیہ السلام)! بے شک ہم آپ کو ایک لڑکے کی بشارت دیتے ہیں جس کا نام یحییٰ (علیہ السلام) ہے، اس سے پہلے ہم نے اس نام کا کوئی شخص پیدا نہیں فرمایا ﴿۷﴾ انہوں نے عرض کیا، اے میرے پروردگار! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا اور میری بیوی بانجھ ہے اور میں بڑھاپے کی اس انتہا کو پہنچ گیا ہوں ﴿۸﴾ فرمایا کہ اسی طرح (ہوگا) آپ کے پروردگار نے فرمایا کہ یہ میرے لیے (بہت) آسان ہے اور میں پہلے آپ کو بھی تو پیدا کر چکا ہوں اور آپ کچھ بھی نہ تھے ﴿۹﴾ عرض کیا اے میرے پروردگار! میرے لیے نشانی مقرر فرما دیجیے۔ فرمایا آپ کی نشانی یہ ہے کہ آپ تین رات تک تندرست ہوتے ہوئے بھی لوگوں سے بات نہ کر سکیں گے ﴿۱۰﴾ پھر وہ (عبادت کے) حجرے سے نکل کر اپنی قوم کے پاس آئے تو ان کو اشاروں میں فرمایا کہ تم لوگ صبح و شام (علی الدوام اپنے پروردگار کی) پاکی بیان کیا کرو ﴿۱۱﴾ اے یحییٰ (علیہ السلام! ہماری) کتاب کو قوت سے (مضبوط) پکڑیں اور ہم نے ان کو بچپن میں ہی دانائی عطا فرما دی تھی ﴿۱۲﴾ اور اپنے پاس سے شفقت اور پاکیزگی عطا کی تھی اور وہ پرہیزگار تھے ﴿۱۳﴾ اور ماں باپ کے ساتھ نیکی کرنے والے تھے اور سرکش (اور) نافرمان نہیں تھے ﴿۱۴﴾ اور ان پر سلامتی ہو جس دن وہ پیدا ہوئے اور جس روز وہ انتقال کریں گے اور جس دن زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے ﴿۱۵﴾

تفسیر ومعارف

سورۂ مریم مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اس سے پہلے سورۂ کہف ہے جس میں اللہ کریم نے ان سوالات کے جوابات نازل فرمائے جو مشرکین نے یہود کے علماء سے پوچھ کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام پر کیے تھے۔ سورۂ مریم میں مزید عجیب وغریب واقعات بیان فرمائے جن کی مشرکین اور علمائے یہود کو بھی خبر نہ تھی اور نہ انہوں نے یہ سوال کیے تھے۔ ان میں سے ایک بیان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تھا۔ یہود آپؑ کو یوسف نجار کی ناجائز اولاد کہتے تھے اور عیسائیوں نے تو سیدھا اللہ کا بیٹا ہی کہہ دیا۔ یہودیوں کی روایت دیکھ کر مرزا قادیانی نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یوسف نجار کی طرف منسوب کر دیا۔ فرق صرف یہ کیا کہ یہودیوں کی طرح ناجائز اولاد کہنے کی بجائے لکھا کہ وہ یوسف نجار کی جائز اولاد تھے۔ ایسا کہنا بھی حقیقت سے انحراف ہے۔ عیسائی، چونکہ عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے تو بہت سے عجیب وغریب قصے جو مشہور تھے اس سورۂ مبارکہ سے اُن سب کا رد بھی ہو گیا اور حقیقت آشکارا ہو گئی۔

حروفِ مقطعات:

کٓھٰیٰعٓصٓ ① یہ حروفِ مقطعات ہیں اور جیسا کہ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان راز ہیں یا اللہ کا کوئی بندہ جسے اللہ بتانا چاہیں۔ قاری کو ان کے پڑھنے سے ثواب بھی ملتا ہے اور ان حروف کی برکات وکیفیات بھی نصیب ہو جاتی ہیں۔ حروف مقطعات قرآن کریم میں جابجا ملتے ہیں۔ ان کا مفہوم اللہ جانتے ہیں، اللہ کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم جانتے ہیں یا پھر اللہ اپنے خاص بندوں میں سے کسی کو بتا دیں۔ ہر ایک کے لیے جاننا ضروری نہیں ہے۔

تلاوت کا اثر:

یہاں سے ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ قرآن کے معنی سمجھنا، ان پر عمل کرنا مقصد ہے لیکن اگر کسی کو معنی نہ آتے ہوں تو تلاوت کرنے سے دل کی جو صفائی ہوتی ہے، اس پر جو کیفیات وارد ہوتی ہیں وہ نصیب ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ معنی نہ بھی آتے ہوں تو تلاوت کا ثواب نصیب ہوتا ہے کہ یہ ایک الگ عبادت ہے۔ تلاوت کرتے رہنا چاہیے کہ اس سے جو برکات وقلبی کیفیات نصیب ہو سکتی ہیں وہ ہوتی رہیں۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کا ذکر اور آدابِ دعا:

فرمایا: ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝ کہ سب سے پہلے اس مہربانی کا ذکر کیجیے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پروردگار نے زکریا علیہ السلام پر فرمائی۔ اللہ کریم جو چاہتے ہیں، جب چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ جس کو جو عطا کرنا چاہیں، عطا کر سکتے ہیں، جس سے جو روکنا چاہیں، روک سکتے ہیں۔ وہ ہر چیز پر ہمہ وقت قادر ہیں۔ فرمایا: اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝ جب انہوں نے نہایت پوشیدہ اور مخفی طور پر اپنے پروردگار کو پکارا۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کا ذکر ہے اور اس میں دعا کے آداب بھی ارشاد فرمائے گئے ہیں۔ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ ۔۔۔۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ کریم پر یہ یقین ہو کہ وہی میرا ربّ ہے، پالن ہار ہے، وہی ایک واحد لاشریک ہستی ہے جو ہر چیز عطا کر سکتی ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، اس کے دینے میں کوئی اس کا حصہ دار نہیں۔ وہ خود عطا کرتا ہے، یہ اس کی رحمت ہے۔ روئے زمین پر کوئی ایسی ہستی نہیں جو اللہ کو مجبور کر سکے کہ وہ فلاں چیز عطا کرے اور فلاں چیز نہ دے۔ اس پر کسی کا بس نہیں چلتا جبکہ اس کی قدرتِ کاملہ سب پر چلتی ہے۔ انبیاؑ تو ہوتے ہی اللہ کے بندے ہیں۔ یہاں دعا مانگنے کا اصول بیان فرمادیا کہ پہلے اللہ کو اپنا حاجت روا مان لیں اور اس کے سوا کسی کو اپنا حاجت روا نہ سمجھیں اور یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ کوئی اللہ کو مجبور کر سکتا ہے یا اس سے زبردستی کوئی چیز لے سکتا ہے۔ اللہ کو اپنا ربّ مانا جائے جو سب کو ہر آن، ہر چیز عطا فرماتا ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے رب کو نِدَآءً خَفِيًّا ۝ نہایت پوشیدہ طور پر پکارا۔ دعا کے آداب میں یہ بھی شامل ہے کہ شور نہ کیا جائے اور لوگوں کو نہ سنایا جائے۔ یہ بندے اور ربّ العالمین کی بات ہے اور نہایت خشوع وخضوع سے اپنے دل میں اللہ کریم کو خفی طور پر پکارا جائے۔ دعا بھی از قسمِ ذکر ہے، اللہ سے گزارشات پیش کرنا اللہ سے مخاطب ہونا، اللہ کو یاد کرنا تو فرمایا نہایت خفیہ طریقے سے انہوں نے اللہ کریم کو پکارا۔

ذکر اللہ میں بھی ذکرِ خفی کو فضیلت حاصل ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خَيْرُ الذِّكْرِ الْخَفِيُّ وَ خَيْرُ الرِّزْقِ مَا يَكْفِي (رواہ احمد و ابنِ حبان) بہترین ذکر وہ ہے جو اللہ اور بندے کے درمیان خفی طور پر ہو اور بہترین رزق وہ ہے جو کفایت کرے جس سے انسان کا گزارہ ہوتا رہے۔

ظاہری حالات کی بجائے اللہ کی عطا پر نظر رکھنا:

حضرت زکریا علیہ السلام نے اللہ کو پکارا: قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝ اور سب سے پہلے اپنی صورتِ حال عرض کی، یا اللہ! میری توہڈیاں

بھی کمزور پڑ چکی ہیں یعنی بڑھاپا اس حد تک چھا گیا ہے کہ بدن گوشت پوست ہی نہیں ہڈیاں بھی کمزور پڑ چکی ہیں وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا ۔۔۔ اور بڑھاپے کا شعلہ سر سے جا نکلا ہے یعنی سر پر بالوں کی سفیدی، سر کی لرزش اور یادداشت کی کمزوری بتا رہی ہے کہ یہاں بڑھاپا آ چکا ہے۔ جس طرح کہیں آگ کا شعلہ اٹھتا ہے اور خبر دیتا ہے کہ یہاں آگ جل رہی ہے۔ اسی طرح باقی اعضاء کا تو کیا ذکر میری تو ہڈیاں بھی کمزور پڑ چکی ہیں۔ بالوں کی سفیدی، سر کی لرزش اور چہرے کی جھریاں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ شخص اب بہت بوڑھا ہو چکا ہے۔ اپنی حالتِ زار پیش کرنے کے بعد فرمایا: وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝۴ لیکن میرا ایمان ہے، میرا اعتماد و یقین ہے کہ اے میرے پروردگار! آپ سے دعا کر کے میں کبھی محروم نہیں رہا۔ زندگی بھر میں نے جب بھی آپ کو پکارا، آپ نے میری دستگیری فرمائی، جو بھی مانگا آپ نے عطا فرمایا ہے۔ گو عذر تو بہت ہیں، بدن اور اعصاب کمزور پڑ چکے ہیں، وجود اس حد تک کمزور پڑ چکا ہے کہ ہڈیاں تک کمزور ہو گئی ہیں اور بڑھاپے کا شعلہ سر سے نکل گیا ہے لیکن اس سب کے باوجود آپ سے دعا کر رہا ہوں اس لیے کہ میں نے جب بھی کبھی آپ کو پکارا ہے آپ نے میری دعا قبول فرمائی ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کا سبب:

فرمایا: وَاِنِّىْ خِفْتُ الْمَوَالِىَ مِنْ وَّرَآءِىْ ۔۔۔ یا اللہ میں نے ساری زندگی محنت کی ہے، لوگوں تک آپ کا پیغام پہنچایا، اُن کی تربیت کی، اُن کے قلوب روشن کیے ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ میرے رشتہ دار، برادری کے لوگ اس کارِ خیر کو جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ وہ آپ کا پیغام لوگوں تک پہنچانے کے اہل ثابت نہیں ہوں گے بلکہ دنیاداری میں الجھ جائیں گے۔ اے میرے پروردگار! میں ڈرتا ہوں کہ میرے رشتہ دار میرے بعد میرے مشن (Mission) کو جاری نہیں رکھ سکیں گے کہ انہوں نے مجھ سے استفادہ ہی نہیں کیا، برکات حاصل نہیں کیں لہٰذا عین ممکن ہے کہ یہ دینی کام میں رکاوٹ کا سبب بن جائیں۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ: وَكَانَتِ امْرَاَتِىْ عَاقِرًا ۔۔۔ میری بیوی ساری زندگی بانجھ رہی ہے اور اس بانجھ پن کی وجہ سے ہماری اولاد نہیں ہوئی۔ اب تو وہ بھی ضعیف ہو چکی ہے لیکن اس سب کے باوجود میں نے جب بھی آپ سے مانگا ہے آپ نے ہمیں محروم نہیں رکھا اس لیے میں مانگتا ہوں: فَهَبْ لِىْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۝۵ یا اللہ! مجھے اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرمایئے کہ آپ اسباب کے محتاج نہیں ہیں بلکہ مسبب الاسباب ہیں۔ اسباب بھی مخلوق ہیں اور آپ خالق ہیں۔ میرے پاس کوئی ایسا ظاہری سبب نہیں ہے کہ میری اولاد ہو سکے، میری بیوی بھی بانجھ ہے لیکن یہ تمام مجبوریاں میرے لیے ہیں، مخلوق کے لیے ہیں آپ کی ذات وراء الوریٰ ہے آپ قادر ہیں۔ مجھ پر

مہربانی فرمایئے اور اپنے پاس سے ایک وارث عطا فرمایئے جو اس قابل ہو: یَّرِثُنِیۡ وَیَرِثُ مِنۡ اٰلِ یَعۡقُوۡبَ۔۔۔ جو میری وراثت کا اہل ہو اور آلِ یعقوب کی وراثت کا حقیقی وارث ہو۔

وراثتِ انبیاؑ:

انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کی وراثت کیا ہوتی ہے؟ اس پر جمہور کا اتفاق ہے کہ انبیاء کی وراثت اُن کے علوم اور اُن کی کیفیات ہوتی ہیں۔ انبیاء کی وراثت اُن کا علم ہوتا ہے اور اس علم کا جو اثر دلوں پر مرتب ہوتا ہے، کیفیاتِ قلبی کی صورت میں وہ درحقیقت اُنؑ کی وراثت ہوتی ہے۔ گویا انبیاؑ کی دولت اُن کی کیفیات اور برکات ہوتی ہیں۔ دنیا کا مال اگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وصال کے بعد رہ جائے تو وہ صدقہ ہوتا ہے وراثت نہیں۔ اوّل تو انبیاؑ کے گھر میں مال نہیں ہوتا اور اگر رہ جائے تو صدقہ ہوتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصالِ مبارک پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے درِ دولت پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلواریں تھیں، نیزے تھے، سواری کے جانور تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا لباسِ اطہر تھا لیکن یہ سب وارثوں کو وراثت میں تقسیم نہیں ہوا بلکہ یہ سب کچھ صحابہ حضرات کو بطورِ تبرک عطا کر دیے گئے۔

انبیاؑ کے حقیقی وارث:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے کہ علما انبیاؑ کے وارث ہوتے ہیں، اور چونکہ انبیاؑ کی دولت اُن کی کیفیات و برکات ہوتی ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ عالم وہ ہے جس کے پاس علومِ ظاہری کے ساتھ کیفیاتِ قلبی بھی ہوں۔ ایسے علما ہی انبیاؑ کے حقیقی وارث ہوتے ہیں۔

قرابت داروں کا برکات سے محروم رہ جانے کا ایک سبب:

یہ بڑی عجیب بات ہے کہ اکثر انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے رشتہ دار محروم ہی رہ جاتے ہیں۔ اسی طرح اکثر اولیاء اللہ کے قرابت دار بھی اُن سے استفادہ نہیں کر پاتے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ اس ہستی کو اپنی برادری کا ایک بندہ تو سمجھتے ہیں لیکن اس کا منصب قبول کرنے سے گریز کرتے ہیں اور اُن کے دل میں اس کا احترام نہیں ہوتا۔ وہ اسے اپنے جیسا ہی سمجھتے ہیں، ماموں یا چچا یا بھائی کا بیٹا ہی سمجھتے ہیں لیکن ان کے دل میں اس کی عظمت کا احساس نہیں ہوتا۔ حصولِ برکات کے لیے ادب پہلی شرط ہے اور قرابت دار ادب کا وہ حق ادا نہیں کر پاتے اس لیے اکثر محروم رہتے ہیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا کی کہ اللہ! مجھے ایسی اولاد، ایسا بیٹا عطا فرما جو میری میراث کا بھی مالک بنے اور

آلِ یعقوبؑ کی وراثت کا بھی۔ اب یعقوب علیہ السلام تو بہت پہلے گزر چکے تھے اور آلِ یعقوبؑ پہلے گزر چکی، تو اُن کی وراثت سے کیا مراد تھی؟ اگر مال و دولت کی وراثت ہوتی تو وہ تو اب تک نہیں پڑی تھی تو وراثت یہی تھی کہ اُنؑ کے بعد یہ نبی ہوگا اور علوم و معارف اور کیفیات انؑ کے ذریعے تقسیم ہوں گی۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے دعا فرمائی کہ اللہ! کوئی ایسا فرزند عطا فرما جو نہایت نیک بخت ہو، جو یہ وراثت حاصل کر سکے اور اللہ کی مخلوق پر بانٹ سکے۔ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝ اور اُسے ایسا خوبصورت بندہ بنائیں جسے ہر کوئی پسند کرے، جس سے سب راضی رہیں، جو بہت نیک سیرت، پاک سیرت اور خوش زبان ہو گویا ہر لحاظ سے بہت بہترین انسان ہو۔ دنیا کا نظام تو چل رہا ہے، چلتا رہے گا، آپ مجھے ایسا وارث عطا فرمایئے جو آپ کے دین کو آگے چلا سکے۔

دعا کی قبولیت کے لوازمات:

دعا مانگنے کے آداب میں بنیادی بات جو یہاں ارشاد ہوئی وہ ہے رَبَّہٗ۔۔۔یعنی اللہ کو اپنا حاجت روا سمجھ کر صرف اسی سے مانگا جائے۔ اللہ کی عظمت بیان کرنا، اس کی شان اور تعریف بیان کرنا اور اپنی معذوری عرض کرنا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد دعا کا حصہ ہے کہ اللہ کی عظمت و پاکی بیان کرنے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجا جائے کہ درود شریف بھی ایک دعا ہے اور یہ وہ دعا ہے جو ہمیشہ قبول ہوتی ہے۔ اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ۔۔۔اے اللہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اپنی بے پناہ رحمتیں نازل فرما وَ عَلٰى اٰلِهٖ وَ صَحْبِهٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ۔۔۔اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آل اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہِ کرام پر بھی بے پناہ رحمتیں نازل فرما۔ یہ ایسی دعا ہے کہ مانگنے سے پہلے قبول ہو چکی کہ ارشادِ باری ہے: اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ۔۔۔(الاحزاب:56)

اللہ جَلَّ شَانُہٗ مسلسل رحمتیں برساتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور فرشتے نزولِ رحمت کے لیے ہمیشہ دعا کرتے رہتے ہیں۔ علمائے کرام اسی لیے فرماتے ہیں کہ دعا سے پہلے بھی درود شریف پڑھا جائے اور دعا کے بعد بھی درود شریف پڑھ کر دعا مکمل کی جائے تو اللہ کریم کی عظمت سے یہ اُمید ہے کہ اس نے پہلی بھی قبول فرمالی، آخری بھی قبول فرمالی تو درمیان میں پیش کی جانے والی دعا بھی قبول فرمالیں گے۔ دعا جب تمام آداب و شرائط کا لحاظ رکھتے ہوئے مانگی جائے تو فوراً جواب آتا ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام کو ارشاد ہوا: يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ۔۔۔اے زکریا (علیہ السلام) ہم تجھے بیٹے کی بشارت دیتے ہیں اور ہم تمہیں ایسا ہی عالیشان، عظیم المرتبت بیٹا عطا فرماتے ہیں، تمہیں مبارک ہو۔

اسلام میں نام کی اہمیت:

اللہ کریم نے بیٹے کی بشارت بھی دی اور نام بھی تجویز فرما دیا: اسْمُهٗ يَحْيٰى۔۔۔کہ اس کا نام یحییٰ ہوگا :لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا۝ ہم نے اس نام کا بندہ اس سے پہلے پیدا نہیں فرمایا۔ آج تک کسی نے یہ نام نہیں رکھا تو گویا نام کی بھی ایک اہمیت ہے۔ غیر مسلموں میں تو نام کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، کوئی بھی نام رکھ لیتے ہیں کہ بندے کو پکارنا ہی تو ہے لیکن اسلام میں نام کی اہمیت ہے۔ نام مبارک، بابرکت اور بامعنی ہونا چاہیے نام رکھتے ہوئے اس امر کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اگرچہ ہم خطا کار اور گناہگار ہیں لیکن مسلمانوں میں الحمدللہ بڑا خوبصورت رواج ہے کہ کم و بیش ننانوے فیصد بچوں کے نام میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ نامی شامل کر دیتے ہیں اور محمد سے نام شروع ہوتا ہے۔ یہ بہت خوبصورت بات ہے کہ جب بندے کو پکارا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامِ نامی لیا جائے یہ بہت مبارک ہے۔ ایسے نام بھی بہت مبارک ہیں جن میں اللہ کا نام آجائے اور ایسے نام بھی بہت رکھے جاتے ہیں مثلاً عبداللہ جن میں نسبت اللہ کی طرف ہوتی ہے یا اللہ کی کسی صفت کی طرف ہوتی ہے مثلاً عبدالستار، عبدالغفار، عبدالجبار وغیرہ۔ نام ہمیشہ، اچھے معنوں والا اور خوبصورت رکھنے چاہیے۔ اس لیے کہ نام کی ایک اہمیت ہے۔

اس ضمن میں ایک ذاتی تجربہ عرض کردوں کہ لوگ اپنی بچیوں کا نام صائمہ رکھ دیتے ہیں جس کا مطلب ہے روزہ دار خاتون، لیکن میرا یہ تجربہ ہے کہ اس نام کی جتنی بچیوں کو دیکھا ان میں سے پچانوے فیصد کے حالات اچھے نہیں رہے بلکہ ساری زندگی روزہ دار کی طرح ہی گزری۔ روزہ دار پانی ہوتے ہوئے پانی پی نہیں سکتا، غذا ہوتے ہوئے کھا نہیں سکتا۔ ایسے ہی وہ آباد گھروں میں ہوتے ہوئے بھی پریشان ہی ہوتی ہیں۔ نجانے والدین ایسا نام کیوں رکھتے ہیں۔ اس طرح کے اور بھی بہت سے نام ہیں اور کچھ نام تو فضول اور بے معنی ہوتے ہیں، وہ بھی نہیں رکھنے چاہییں۔

اللہ کی قدرتِ کاملہ:

حضرت زکریا علیہ السلام نے عرض کیا: قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا۝ بارِالٰہا میں نے عرض کیا، آپ نے عطا کر دیا تو اب یہ کیسے ہوگا؟ دنیا تو عالمِ اسباب ہے اور میرا وجود تو بڑھاپے سے لرز رہا ہے، ہڈیاں تک کمزور ہو چکی ہیں، سر لرز رہا ہے بال سفید ہو چکے ہیں تو کیا مجھے پھر سے جوانی عطا ہوگی؟ میری بیوی بھی ضعیف ہے اور بانجھ بھی ہے تو کیا مجھے کوئی اور بیوی عطا ہوگی یا اس کو صحت دے دی جائے گی یہ بیٹا کیسے ہوگا؟ قَالَ كَذٰلِكَ۔۔۔اللہ نے فرمایا، ان اسباب کے ہوتے ہوئے، ایسے ہی ہوگا۔

نہ آپ پر جوانی آئے گی نہ ہی کوئی نئی شادی ہو گی، نہ آپ کی اہلیہ پر جوانی آئے گی نہ آپ پر لیکن آپ دونوں کا بیٹا ہوگا۔ جس حال میں آپ لوگ ہیں اسی حال میں بیٹا عطا کر دوں گا۔ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ۔۔۔ زکریا آپ کا پروردگار ارشاد فرماتا ہے کہ میرے لیے ایک ضعیفہ بانجھ عورت اور ایک ضعیف و کمزور آدمی کو اولاد عطا کر دینا مشکل نہیں ہے، میں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ میں ربّ العالمین ہوں، میں آپ (علیہ السلام) کا بھی پروردگار ہوں آپ (علیہ السلام) کو عطا کرنے والا ہوں اور یہ میرے لیے ہرگز مشکل نہیں کہ آپ (علیہ السلام) کے بڑھاپے اور آپ کی اہلیہ کے بانجھ پن کے باوجود آپ (علیہ السلام) کو فرزند عطا کروں۔ ایسا کرنا میرے لیے آسان ہے اور: وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا ۝ آپ (علیہ السلام) کو بھی تو میں نے پیدا کیا تھا، اور پیدا ہونے سے پہلے تو آپ (علیہ السلام) کا وجود نہیں تھا، آپ (علیہ السلام) کچھ بھی نہیں تھے۔ اگر میں عدم سے پیدا کر سکتا ہوں تو پھر زندہ وجودوں سے پیدا کرنا میرے لیے کیا مشکل ہے۔ اسی حال میں آپ کو بیٹا عطا ہوگا۔

نعمت پر شکر کا سلیقہ:

حضرت زکریا علیہ السلام نے عرض کیا: قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً۔۔۔ یا اللہ! مجھے کوئی نشانی بتا دیجیے کہ مجھے تسلی ہو جائے گی کہ بیٹا ہوگا۔ فرمایا: قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ۝ نشانی یہ ہے کہ جب آپ کی اہلیہ حاملہ ہو جائیں گی تو تین رات اور دن آپ کسی سے بات نہیں کر سکیں گے۔ آپ عبادت کریں گے، ذکر اذکار کریں گے، نماز ادا کریں گے، روزہ رکھیں گے لیکن کسی انسان سے آپ بات نہیں کر سکیں گے۔ اللہ کریم نے بہت خوبصورت نشانی بھی بتائی اور یہ طریقہ بھی بتا دیا کہ جب اللہ کا احسان ہو تو ڈھنڈورا پیٹنے کی بجائے خاموشی سے اللہ کو یاد کرنا چاہیے۔ اللہ کریم کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اس کی مہربانی پر زبان بند اور دل جاری ہو جانا چاہیے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کو اس خوشی کے موقع پر کہ ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا جو بہترین انسان ہوگا، اللہ کا نبیؑ ہوگا اور بہت خوبیوں کا مالک ہوگا یہ سلیقہ تعلیم فرمایا جا رہا ہے کہ آپ (علیہ السلام) کسی سے بات نہیں کر سکیں گے صرف اللہ کا ذکر کر سکیں گے۔ صرف اللہ سے بات کر سکیں گے، صرف رکوع و سجود کر سکیں گے۔ اللہ کریم نے طریقہ بھی بتا دیا اور ان پر یہ طاری بھی کر دیا کہ اس طرح سے میرا شکر ادا کریں۔

ولادتِ باسعادت اور ہم:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ولادتِ باسعادت پر اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثتِ عالی پر جتنی بھی خوشی کا اظہار کیا جائے وہ کم ہے اور اس کا سلیقہ یہی ہے کہ زبان بند ہو جائے اور دل روشن ہو جائے۔ اللہ کریم کے حضور سربسجود

ہوا جائے، اللہ کریم کا ذکر کیا جائے اور اس کا احسان مانا جائے۔ اس موقع پر تو اگر تیس دن بھی خاموش رہا جائے تو کم ہے لیکن ہم ہیں کہ ڈھول باجے لے کر سڑکوں پر نکل جاتے ہیں۔ یہ درست نہیں ہے۔ سلیقہ یہ ہے کہ مساجد میں جاؤ، گھروں میں ہو تو وہاں بیٹھ جاؤ، اللہ کا ذکر کرو، قرآن کی تلاوت کرو، اللہ کا شکر کرو، دعائیں مانگو۔ اللہ کا احسان مانو کہ اے اللہ! تو نے اتنی مبارک ہستی صلی اللہ علیہ وسلم عطا فرمائی۔ ولادتِ باسعادت پر اس طریقے سے خوشی منانا سعادتمندی ہے، اس سے کون روک سکتا ہے؟ بات صرف اس خوشی کے منانے کے طریقے کی ہو رہی ہے۔

اظہارِ تشکر کا انداز:

حضرت زکریا علیہ السلام اللہ کریم کی طرف سے بشارت اور شکر اور خوشی منانے کا سلیقہ عطا ہونے کے بعد اپنے حجرۂ مبارک باہر تشریف لائے: فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ ۔۔۔ اور اپنی قوم کو اشاروں سے سمجھایا: فَاَوْحٰٓى اِلَيْهِمْ ۔۔۔ کہ اُن سے بات تو نہیں کر سکتے تھے کہ تین دن کے لیے زبان تو اللہ کریم نے روک دی تھی بات نہیں کر سکتے تھے لہٰذا اپنی قوم کو اشاروں سے سمجھایا کہ اللہ نے مجھے بیٹا عطا کیا ہے جو تمہارا نبی ہوگا۔ وہ تمہارا امام ہوگا، تمہارا راہنما ہوگا اور میرے جانے کے بعد بھی تمہیں راہنمائی ملتی رہے گی، تمہاری دستگیری ہوتی رہے گی، تم محروم نہیں رہو گے لہٰذا خوشیاں مناؤ۔ اس کا طریقہ یہ ہے: اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۱۱﴾ کہ دن رات، ہمہ وقت، ہر لمحہ اللہ کی پاکی بیان کرتے رہو۔ خوشی منانے کا طریقہ ہے کہ صبح شام، رات دن اسی کا ذکر کرتے رہو، اس کی پاکی بیان کرتے رہو۔ بُكْرَةً وَّعَشِيًّا کو انگریزی میں Round The Clock کہتے ہیں اور اردو میں علی الدوام۔

کتابِ الٰہی کو مضبوطی سے تھامنا:

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے تورات نازل ہو چکی تھی اور وہی دین چل رہا تھا چنانچہ حضرت یحییٰ جب پیدا ہوئے اور مبعوث ہوئے تو اللہ کریم نے فرمایا: يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۔۔۔ اے یحییٰ! (علیہ السلام) کتاب کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ نبی تو ویسے ہی کتاب کے ساتھ ہی زندہ رہتا ہے لیکن یہ جو انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو تاکید کی جاتی ہے اس سے مراد یہ ہوتا ہے کہ اگر نبی کو تاکید کی گئی ہے تو کوئی دوسرا اس سے کیسے مستثنیٰ ہو سکتا۔ کتاب کو پکڑنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ اسے مضبوطی سے چمٹایا جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ اپنے عقیدے سے لے کر عمل تک ہر کام کتاب کے مطابق کیا جائے لہٰذا سب سے پہلی بات اور بنیادی بات یہ ارشاد فرمائی: خُذِ الْكِتٰبَ ۔۔۔ مضبوطی سے پکڑیں اور پھر آپؑ کی تعریف فرمائی: وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴿۱۲﴾ کہ انہیں بچپن میں ہی ہم نے دانائی عطا کر دی تھی۔ انتہائی بچپن اور لڑکپن سے ہی اُن سے دانشمندی

اور دانائی جھلک رہی تھی اور ظاہر ہو رہا تھا کہ یہ بہت عظیم انسان ہوں گے: وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً ۔۔۔ اور ہم نے اپنے پاس سے انہیں شفقت اور پاکیزگی عطا کر دی تھی۔ وہ منجانب اللہ شفقت، مہربانیاں، کرم اور پاکیزگی لے کر پیدا ہوئے تھے: وَكَانَ تَقِيًّا ﴿۱۳﴾ اور بہت پرہیزگار، بہت ہی نیک تھے: وَّبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿۱۴﴾ اور وہ اپنے والدین کے ساتھ بھی بہت نیکی کرنے والے تھے۔ وہ نہ تو سرکش و نافرمان تھے اور نہ ہی جبار تھے کہ زبردستی کرتے یعنی نہ وہ غلط کام کرتے تھے اور نہ ہی کسی پر اپنی مرضی مسلط کرتے تھے۔ اللہ کریم نے اُن کے مزاجِ عالی کی تعریف فرمائی کہ شفقت اور پاکیزگی تو انہیں وہبی طور پر، پیدائشی طور پر ہی عطا فرمائی گئی تھی۔ اُن کے مزاج میں نیکی ہی نیکی تھی اور وہ اپنے والدین کے ساتھ بھی نیکی کرنے والے تھے: وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ ۔۔۔ اُن پر سلامتی ہو جب وہ دنیا میں تشریف لائے اور وَيَوْمَ يَمُوْتُ ۔۔۔ اور اُن پر سلامتی ہوگی جب وہ وصال فرمائیں گے اور: وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿۱۵﴾ یوم حشر جب وہ زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے تو بھی اُن پر سلامتی ہوگی۔ یعنی وہ قدم قدم پر اللہ کی سلامتی، اللہ کے کرم اور مہربانی کے سائے میں رہیں گے۔ اللہ کریم نے کتنی تعریفیں کیں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی لیکن یہ بنیاد بیان فرمائی خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۔۔۔ کہ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے تھامے رہنا۔

قرآنِ کریم اور ہمارا رویہ:

ہم نے قرآنِ کریم کو بہت عزت، بہت ادب اور احترام کے ساتھ لپیٹ کر ریشمی غلافوں میں رکھ دیا ہے۔ یہ کتاب کو پکڑنا نہیں ہے۔ کتاب کو مضبوطی سے تھامنے سے مراد ہے کہ اسے پڑھا جائے، سمجھا جائے اور اس پر عمل کیا جائے۔ اسے غور سے پڑھا جائے، پورے دھیان سے سمجھا جائے اور پوری محنت سے اس پر عمل کیا جائے کہ یہ عمل کی کتاب ہے۔ اس سے صبح وشام استفادہ کیا جائے۔ کوئی ضرورت درپیش ہو، کوئی مصیبت آئے تو اس کو پڑھو۔ ہر حال میں پڑھو۔

سورۃ مریم رکوع 2 آیات 16 تا 40

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ۙ﴿۱۶﴾
فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۪ فَاَرْسَلْنَاۤ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا
سَوِيًّا ﴿۱۷﴾ قَالَتْ اِنِّيْۤ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾ قَالَ اِنَّمَاۤ اَنَا
رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾ قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ
يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾ قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ
وَلِنَجْعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾ فَحَمَلَتْهُ
فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾ فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ
قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾ فَنَادٰىهَا مِنْ
تَحْتِهَاۤ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ وَهُزِّيْۤ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ
تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۫﴿۲۵﴾ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ
الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْۤ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ
اِنْسِيًّا ۚ﴿۲۶﴾ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ﴿۲۷﴾
يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا ۖۚ﴿۲۸﴾ فَاَشَارَتْ
اِلَيْهِ ؕ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿۲۹﴾ قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ ؕ
اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا ۙ﴿۳۰﴾ وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۪
وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ۖ﴿۳۱﴾ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ ۫ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ

جَبَّارًا شَقِيًّا ۝٣٢ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ
حَيًّا ۝٣٣ ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝٣٤ مَا
كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ
فَيَكُوْنُ ۝٣٥ وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝٣٦
فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ
عَظِيْمٍ ۝٣٧ اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ يَوْمَ يَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْيَوْمَ فِيْ
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝٣٨ وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ
وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝٣٩ اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ۝٤٠

اور آپ اس کتاب میں مریم کا بھی ذکر فرمایئے جب وہ اپنے لوگوں سے الگ ہوکر مشرق میں ایک مکان میں گئیں ﴿۱۶﴾ (غسل کی غرض سے) پھر ان (گھر والوں) کے سامنے سے پردہ کرلیا تو ہم نے ان کی طرف اپنا فرشتہ (جبرائیل علیہ السلام) بھیجا تو وہ ان کے سامنے پورا آدمی بن گیا ﴿۱۷﴾ انہوں نے کہا میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں اگر تم پرہیزگار ہو تو (چلے جاؤ) ﴿۱۸﴾ انہوں نے کہا بے شک میں تو آپ کے پروردگار کا بھیجا ہوا (فرشتہ) ہوں کہ آپ کو ایک پاکیزہ لڑکا دوں ﴿۱۹﴾ وہ کہنے لگیں بھلا میرے لڑکا کس طرح ہوگا حالانکہ مجھے کسی بشر نے چھوا تک نہیں اور میں بدکار بھی نہیں ہوں ﴿۲۰﴾ (فرشتے نے) کہا یونہی (ہوگا) آپ کے پروردگار نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہ میرے لیے آسان ہے اور تاکہ ہم اس کو لوگوں کے لیے ایک دلیل اور اپنی طرف سے (باعث) رحمت بنائیں اور یہ کام طے ہو چکا ہے ﴿۲۱﴾ تو وہ (اس بچے کے ساتھ) حاملہ ہوگئیں پھر اسے لے کر دور ایک جگہ الگ چلی گئیں ﴿۲۲﴾ پھر وہ دردِ زہ کے مارے کھجور کے تنے کی طرف آئیں کہنے لگیں اے کاش! میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی اور بھولی بسری ہوگئی ہوتی ﴿۲۳﴾

پس اس وقت ان سے نیچے کی جانب سے (فرشتے نے) ان کو آواز دی کہ غم نہ کریں
بے شک آپ کے پروردگار نے آپ کے نیچے ایک چشمہ پیدا فرما دیا ہے ﴿۲۴﴾
اور اس کھجور کے تنے کو اپنی طرف ہلائیں آپ پر تازہ تازہ کھجوریں گر پڑیں
گی ﴿۲۵﴾ پھر کھائیں اور پئیں اور آنکھیں ٹھنڈی کریں پھر اگر آپ کسی آدمی کو
دیکھیں تو کہیں بے شک میں نے تو رحمٰن کے لیے (خاموشی کے) روزے کی منت
مان رکھی ہے تو آج میں کسی آدمی سے ہرگز بات نہ کروں گی ﴿۲۶﴾ پھر وہ ان کو گود
میں لیے ہوئے اپنی قوم کے پاس آئیں لوگوں نے کہا اے مریم! تم نے کیا غضب
ڈھایا! ﴿۲۷﴾ اے ہارون کی بہن! نہ تو تمہارے والد ہی برے آدمی تھے اور نہ
تمہاری ماں بدکار تھیں ﴿۲۸﴾ پھر انہوں (مریم علیہا السلام) نے اس (بچے) کی
طرف اشارہ کر دیا وہ لوگ کہنے لگے بھلا اس سے ہم کیا بات کریں جو ابھی گود کا بچہ
ہے ﴿۲۹﴾ انہوں (بچّے) نے فرمایا یقیناً میں اللہ کا (خاص) بندہ ہوں اس
نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا ہے ﴿۳۰﴾ اور مجھے بابرکت بنایا جہاں کہیں بھی
میں ہوں اور جب تک زندہ رہوں، مجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم فرمایا ہے ﴿۳۱﴾ اور
اپنی ماں کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے والا (بنایا ہے) اور مجھے سرکش، بدبخت نہیں
بنایا ﴿۳۲﴾ اور مجھ پر (اللہ کی جانب سے) سلامتی ہے جس روز میں پیدا ہوا اور
جس روز رحلت کروں گا اور جس روز (قیامت میں) زندہ کر کے اٹھایا جاؤں
گا ﴿۳۳﴾ یہ عیسیٰ (علیہ السلام) بیٹے مریم (علیہا السلام) کے ہیں۔ بالکل سچی بات
ہے، جس بات میں یہ لوگ جھگڑتے ہیں ﴿۳۴﴾ اللہ کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی کو
اولاد بنائیں۔ وہ پاک ہیں۔ جب کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو اس کو فرما دیتے ہیں
ہو جا، پس وہ ہو جاتا ہے ﴿۳۵﴾ اور یقیناً اللہ ہی میرا پروردگار ہے اور تمہارا بھی لہٰذا
صرف اسی کی عبادت کرو، یہی سیدھا راستہ ہے ﴿۳۶﴾ پھر مختلف فرقوں نے آپس
میں اختلاف کیا۔ سو ان کافروں کے لیے ایک بڑے دن کے آنے سے خرابی ہونے

والی ہے ﴿۳۷﴾ وہ جس دن ہمارے سامنے آئیں گے، کیسے سننے والے اور کیسے دیکھنے والے ہوں گے۔لیکن ظالم آج کھلی گمراہی میں ہیں ﴿۳۸﴾ اور ان کو حسرت کے دن سے ڈرائیں، جب بات فیصل کردی جائے گی اور وہ غفلت میں پڑے ہیں اور وہ ایمان نہیں لاتے ﴿۳۹﴾ بے شک ہم ہی زمین کے اور اس پر رہنے والوں کے وارث (مالک) ہیں اور ہماری ہی طرف ان کو لوٹنا ہوگا ﴿۴۰﴾

تفسیر و معارف

حضرت مریم علیہا السلام کا ذکرِ خیر:

فرمایا: وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۔۔۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم !اس کتاب میں حضرت مریم علیہا السلام کا ذکر بھی فرما دیجیے کہ یہ وہ باتیں ہیں جن کے متعلق علمائے یہود اور مشرکین بھی صحیح طور پر نہیں جانتے تھے اور نہ ہی انہوں نے سوال پوچھا تھا۔جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معاملے میں یہودیوں اور عیسائیوں نے بہت سے غلط قصے گھڑ رکھے تھے۔اللہ جل شانہ ارشاد فرماتے ہیں کہ ان واقعاتِ عجیبہ کے بارے بھی انہیں مطلع فرما دیجیے، اے میرے حبیب! آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کتاب میں حضرت مریم علیہا السلام کے حالات و واقعات کا صحیح اور حقیقی تذکرہ فرما دیجیے۔حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش کا واقعہ سورۂ آل عمران میں گزر چکا ہے۔حضرت مریم علیہا السلام کی پیدائش سے پہلے ہی انہیں اللہ کی نذر کر دیا گیا تھا اور مسجد میں دے دیا گیا اور وہ حضرت زکریا علیہ السلام، جو رشتہ میں ان کے خالو تھے، کی کفالت میں مسجد میں ہی جوان ہوئیں۔اُن سے بے شمار کرامات کا ظہور ہوا جن میں سے بہت سی قرآن کریم نے بیان بھی فرمائی ہیں۔جب وہ جوان ہوئیں تو: اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿۱۶﴾ جب وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر مشرق میں ایک مکان کی طرف گئیں، لوگوں سے پردہ کر لیا، غسل وغیرہ کا اہتمام ہوگا۔ اللہ کریم فرماتے ہیں جب انہوں نے لوگوں سے پردہ کر لیا تو: فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿۱۷﴾ ہم نے رُوْحَنَا ۔۔۔ جبرئیل امین کو، اپنے فرشتے کو ان کی طرف بھیجا۔حضرت جبرئیل کا نام روح الامین بھی ہے اور وہ پردے کے اندر انسانی صورت میں حضرت مریم علیہا السلام کے سامنے آئے تو وہ پہچان نہ سکیں کہ یہ فرشتہ ہے اور پریشان ہوئیں کہ میں نے تو پردہ کر لیا تھا پھر یہ پردے میں کون سا انسان گھس آیا ہے۔فرمایا: قَالَتْ اِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾ میں تم سے اللہ رحمن و رحیم کی پناہ چاہتی ہوں، اگر تمہیں اللہ کا خوف ہے

توتم یہاں کہاں گھس آئے تم باہر چلے جاؤ۔ تم یہاں سے چلے جاؤ میں اللہ رحمن ورحیم کی تم سے پناہ مانگتی ہوں اور اگر تمہیں بھی اللہ کا خوف یا پرہیزگاری ہے تو تم یہاں سے چلے جاؤ۔

مفسرینِ کرام فرماتے ہیں کہ ایسے موقع پر کہ جہاں کسی کو گناہ میں پھنسنے کا اندیشہ ہو تو اُسے چاہیے کہ اللہ کا ذکر کرے اور اللہ سے پناہ طلب کرے کہ سب سے بڑی بات اللہ کی یاد ہے، ذکرِ الٰہی ہے۔ اگر ذکرِ الٰہی کیا جائے اور اللہ سے پناہ مانگی جائے تو بچنے کے اسباب بن جاتے ہیں۔

ایک اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ حضرت مریم علیہا السلام نبی نہیں ہیں، ولیہ ہیں اور اُن کے پاس فرشتہ آیا، اس کا مطلب ہے کہ ولی اللہ کو بھی فرشتے سے ہمکلام ہونے کا شرف حاصل ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی چیز مانع نہیں ہے۔ البتہ یہ سب اللہ کے اختیار میں ہوتا ہے اور اللہ کی عطا کردہ توفیق سے ہوتا ہے۔

یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ علوم اللہ تعالیٰ ہی کے ہیں، جتنا چاہتے ہیں جسے چاہتے ہیں عطا کر دیتے ہیں۔ حضرت مریم علیہا السلام کے پاس فرشتہ بھیج دیا اور وہ یہ نہ جان سکیں کہ یہ انسان ہے یا فرشتہ، بلکہ انسان سمجھ کر گھبرا گئیں اور انہیں بھی اللہ کا واسطہ دے کر جانے کو کہا تو انہوں نے کہا: قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ۔۔۔ میں آپ کے رب کا ہی بھیجا ہوا ہوں۔ مجھے اللہ رحمن ورحیم نے حکم دیا ہے آپ کے پاس آنے کا۔ میں انسان نہیں ہوں بلکہ اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں اور اللہ نے مجھے اس لیے بھیجا ہے: لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾ کہ آپ کو پھونک مار دوں، دم کر دوں تاکہ اللہ کریم آپ کو نیک صالح بیٹا عطا فرمائیں۔ یہ بات بہت عجیب تھی اور اُن کو بھی بہت عجیب لگی کہ ایک بچی جو پیدا ہوتے ہی مسجد میں اللہ کی راہ میں دے دی گئی اور نہایت پاکیزگی اور طہارت کے ماحول میں، اللہ کے ذکر سے روشن ماحول میں پل کر جوان ہوئیں اور اُن سے بے شمار کرامات کا ظہور ہوا، اب بغیر شادی اُن کے بیٹا کیسے ہوگا؟ انہوں نے فرمایا: قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾ میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی، کسی مرد نے چھوا ہی نہیں اور نہ ہی میں ایسی ہوں کہ کوئی غلط کام کیا ہو تو بغیر مرد کے میرا بیٹا کیسے ہوگا؟ تم اللہ کے فرشتے ہو لیکن تم عجیب بات کر رہے ہو۔ انہوں نے عرض کی: قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ۔۔۔ آپ کے بیٹا ایسے ہی ہوگا بغیر شادی کے، بغیر مرد کے چھوئے ہی ہوگا اور آپ کے پروردگار کا ارشاد ہے کہ یہ کام میرے لیے بہت آسان ہے کہ میں جو چاہوں کر سکتا ہوں۔

دم کرنا:

یہاں ایک بات واضح ہوگئی کہ دم کرنا جائز ہے کہ حضرت جبرئیل امین نے اللہ کے حکم سے حضرت مریم علیہا السلام

پر دم کیا یا پھونک ماری اور وہ حضرت عیسیٰؑ کے ساتھ حاملہ ہو گئیں۔ گویا اللہ کا کلام پڑھ کر دم کرنا جائز ہے اور اس کا اثر ہے۔قرآن کریم کی آیات میں سے کوئی پڑھ کر، درود شریف پڑھ کر دم کیا جائے تو جائز ہے مگر ایسا کلام پڑھنا جس میں کوئی ایسا لفظ ہو جو شریعت کی گرفت میں آتا ہو یا علما فرماتے ہیں ایسا کلام جس کی سمجھ نہ آتی ہو جائز نہیں ہے۔ جیسے لوگوں نے کچھ پنجابی، اردو، پرانے زمانے کی سُریانی زبان ملا کر کچھ دم وغیرہ بنا رکھے ہیں، اُن کی سمجھ ہی نہیں آتی لہٰذا وہ ناجائز ہیں۔قرآن کی آیات پڑھ کر دم کرنے کا واقعہ ملتا ہے کہ کچھ صحابہ کرامؓ صحرا سے گزر رہے تھے تو انہوں نے بدوؤں کا خیمہ لگا دیکھا، یاد رہے یہ بدو خانہ بدوش ہوتے ہیں اور چلتے پھرتے زندگی بسر کرتے ہیں۔اُن بدوؤں نے جب صحابہ کرامؓ کو گزرتے ہوئے دیکھا تو وہ سمجھ گئے کہ یہ کوئی نیک سیرت لوگ جا رہے ہیں لہٰذا اُنؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ہمارے ایک آدمی کو سانپ نے کاٹا ہے اور ہمارے تمام تر علاج کے باوجود وہ قریب المرگ ہو گیا ہے۔انہوں نے صحابہ کرامؓ سے درخواست کی کہ اگر آپ میں سے کوئی اس مریض پر کوئی دم کر دے یا پھونک دے تو مہربانی ہوگی۔صحابہ کرامؓ رُک گئے اور ایک صحابیؓ نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر مریض پر پھونک ماردی۔اللہ کی شان ہے وہ ٹھیک ہو گیا اور زہر کا اثر زائل ہو گیا تو وہ لوگ بہت خوش ہوئے اور انہوں نے صحابہ کرامؓ کی خدمت میں اجرت کے طور پر بیس بکریاں پیش کیں۔صحابہ کرامؓ نے وہ بکریاں لے لیں لیکن انہیں یہ خیال آیا کہ پتا نہیں ان کا لینا جائز بھی ہے یا نہیں؟ انہوں نے سوچا کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر کے پوچھ لیں گے اگر جائز ہوگا تو رکھ لیں گے اور ناجائز ہوا تو واپس کر دیں گے لہٰذا وہ بکریاں لے آئے۔ بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضر ہوئے اور سارا ماجرا سنایا کہ ہمیں تو پتا نہیں تھا ہم نے سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا اور مریض ٹھیک ہو گیا تو اُن لوگوں نے ہمیں یہ بیس بکریاں اجرت کے طور پر دی ہیں۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا تمہیں کس نے بتایا تھا کہ سورۂ فاتحہ دم بھی ہے، انہوں نے کہا کہ ہم نے تو ویسے ہی سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ان کے علاج کی اجرت ہے اور حلال ہے، یہ لینا جائز ہے بلکہ اس میں میرا حصّہ بھی رکھو۔یہ آپس میں بانٹ لو اور ان میں میرا حصّہ بھی رکھو۔

دم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دم کرنے والا بندہ نیک سیرت، پاک صاف، کلامِ الٰہی جاننے والا پڑھا لکھا ہو اور یہ بھی حقیقت ہے کہ دم میں تاثیر فرد سے پیدا ہوتی ہے کہ دم کرنے والا کیسا ہے۔دم کرنے والے میں صفاتِ ملکوتی ہوں، طہارت و پاکیزگی ہو، صحیح العقیدہ ہو، صاحبِ علم ہو جائز کلام ہو، قرآن کریم سے ہو، حدیث شریف سے یا تسبیحات ہوں اور جائز کام کے لیے دم کیا جائے تو یقیناً اس میں اثر ہوگا لیکن ایسے لوگوں سے دم کرانا جو نہ وضو کرنا جانتے ہیں نہ نماز پڑھتے ہیں ہرگز مناسب بات نہیں ہے۔ایسے الفاظ جن کا مطلب بھی نہ آتا ہو یا غیر شرعی الفاظ

ہوں ان کو پڑھ کر دم کرنا جائز نہیں نہ ہی دم کرانا جائز ہے۔

اگر تعویذ یا دم سے علاج کروایا جائے تو علاج کی اجرت لینا جائز ہے۔ اگر کوئی یہ علاج فی سبیل اللہ کرتا ہے تو اللہ اُسے اجر و ثواب دیں گے لیکن اگر وہ اجرت بھی طلب کرے تو یہ جائز ہے۔

دنیا عالمِ اسباب ہے:

اللہ کریم کا نظام ہے کہ اس نے دنیا کو عالمِ اسباب بنایا ہے اور دنیا میں ہر کام کے لیے سبب چاہیے۔ یہاں تک کہ خود ذاتِ باری نے جب یہ کرشمہ ظاہر کرنا چاہا کہ بغیر باپ کے بھی اولاد ہو سکتی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کرنا چاہا وہاں بھی یہ اصولِ فطری کہ ہر کام کے پیچھے سبب ہونا چاہیے، ترک نہیں کیا۔ اللہ کریم نے فرشتے کو حکم دیا کہ تم جا کر پھونک مار دو کہ یہ اللہ کریم کا قانون ہے کہ یہ دنیا عالمِ اسباب ہے اور ہر کام کے لیے سبب چاہیے۔

توکّل:

توکل یہ ہے کہ سبب اختیار کیا جائے، پورے خلوص سے پوری محنت کی جائے پھر نتیجے کا انتظار اللہ کی طرف سے کیا جائے۔ البتہ کام نہ کرنا اور یہ کہنا کہ میں توکل کر رہا ہوں یہ درست نہیں ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک صحابیؓ حاضر ہوئے، وہ اونٹ پر سوار ہو کر آئے تھے تو اندر آئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اونٹ کا کیا کیا؟ انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اللہ کے توکل پر باہر چھوڑ آیا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یہ توکل نہیں ہے جاؤ اس کی ٹانگ باندھ کر آؤ اور پھر اللہ پر توکل کرو۔ یعنی توکل یہ ہے کہ اسباب اختیار کرو، اور نتیجہ اللہ کی طرف سے امید رکھو کہ بہتر ہوگا اور پھر جو اللہ کی طرف سے آئے اُسے قبول کرو۔ مولانا رومیؒ نے اسی پر منظوم کیا ہے ''بر توکل بازوئے اشتر بہ بند'' توکل یہ ہے کہ اپنی طرف سے تم اونٹ کے پاؤں باندھ دو اور پھر اللہ پر توکل کرو۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وِلادت:

حضرتؑ مریم علیہا السلام نے تعجب کا اظہار کیا تو ارشاد ہوا: قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿٢١﴾ آپؑ کے ہاں بیٹا، جس حال میں آپؑ ہیں ایسے ہی ہو جائے گا اور آپؑ کے پروردگار کا ارشاد ہے کہ یہ میرے لیے ہرگز مشکل نہیں کہ میں قادرِ مطلق ہوں۔ آپؑ کے پروردگار کا

ارشاد ہے کہ میں اس کولوگوں کے لیے ایک دلیل اور نشانی کے طور پر پیدا کرنا چاہتا ہوں اور باعث رحمت بنا کر بھیجنا چاہتا ہوں۔ اب یہ ایسا ہی ہوگا، آپؑ چاہیں تو بھی ہوگا نہ چاہیں تو بھی ہوگا، اس کا فیصلہ ہو چکا۔ چونکہ حضرت مریم علیہا السلام بہت گھبرا رہی تھیں کہ بلاشبہ اللہ قادر ہیں بیٹا تو ہو جائے گا لیکن مجھے تو مخلوق میں بسنا ہے، لوگ تو بہت انگلیاں اٹھائیں گے، مجھ سے سوال کریں گے تو میں کیا جواب دوں گی۔ اللہ تو قادر ہیں لیکن لوگوں کی رسائی تو اللہ کی قدرت تک نہیں ہے، اُن کی نگاہ تو اسباب اور طریقوں تک جاتی ہے، اور اُن کے منہ میں زبانیں بھی ہیں وہ تو سوالات کا طوفان کھڑا کر دیں گے۔ لوگ مجھ سے پوچھیں گے یہ کہاں سے لے آئی ہو تو میں کیا جواب دوں گی؟ حضرت مریم علیہا السلام اپنی طرف سے ایک بہت بڑی مشکل میں پڑ گئیں، کہ کسی بھی پاکیزہ شعار، نیک سیرت ولیہ کو جو نوجوان بھی ہو اور بغیر شادی کے اولاد ہو جائے تو بے حد پریشانی ہوگی کہ وہ کس کس کو کیا جواب دے گی لہٰذا حضرت مریم علیہا السلام بہت گھبرائیں۔ حضرت جبرئیل نے کہا کہ یہ طے ہو چکا اور ایسا ہو کر رہے گا۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿٢٢﴾ چنانچہ وہ اس بچے کے ساتھ حاملہ ہو گئیں اور پھر ایک الگ جگہ چلی گئیں۔ اب یہ معجزاتی کام تھا اور عام ترتیب سے نہیں تھا کہ حمل ہو، بچہ ہو پھر وہ نو مہینے پیٹ میں رہے گا وہ تو بہت لمبی ترتیب تھی جبکہ یہ سارا معجزاتی کام تھا۔ جب حمل ہو گیا تو پھر گھر سے نکل گئیں، باہر کسی جگہ الگ چلی گئیں۔ وہاں پہنچیں تو: فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ۔۔۔ وہاں دردِزہ شروع ہو گیا، ولادت کا وقت آ گیا۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا کہ یہ معجزاتی کام تھا، ایسا ہرگز نہیں تھا کہ وہ نو مہینے جنگل میں رہتی رہیں ہوں اور کسی کو یاد نہ رہا ہو اور کسی نے پتا ہی نہ کیا ہو کہ کہاں چلی گئیں۔ حق یہ ہے گھر سے الگ ہو کر باہر جنگل میں نکل گئیں اور وہاں بچے کی پیدائش کا عمل شروع ہو گیا، اور درد کے مارے ایک کھجور کے تنے سے ٹیک لگا لی۔ یہ کھجور کا سوکھا ہوا تنا تھا جس کے پتے جھڑ چکے تھے کیونکہ یہاں اللہ کریم نے کھجور کا درخت نہیں فرمایا بلکہ فرمایا: جِذْعِ النَّخْلَةِ۔۔۔ یعنی کھجور کا تنا، تو اس تنے سے حضرت مریم علیہا السلام نے سہارا لیا، ٹیک لگائی اور بڑے دکھ سے فرمایا: قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿٢٣﴾ اے کاش! میں یہ سب دیکھنے سے پہلے، اس وقت سے پہلے مر گئی ہوتی اور اب تک لوگوں کو میری یاد بھی بھول چکی ہوتی کہ کبھی میں تھی۔

یہاں ایک نکتہ ارشاد ہوا ہے کہ یہ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ ہر انسان اس زعمِ باطل میں مبتلا نظر آتا ہے، خواہ وہ بادشاہ ہے یا فقیر، کہ شاید یہ کائنات اس کے دم سے ہی چل رہی ہے۔ کسی سے بات کرو تو وہ کہتا ہے کہ جب میں نہیں رہوں گا تو میرے گھر والوں کو پتا چلے گا، یا میں نہیں رہوں گا تو لوگوں کو پتا چلے گا، گویا اس کے دم سے سارا کچھ چل رہا ہے۔ سب اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں، لیکن دیکھا یہ گیا ہے کہ جو مر جاتا ہے اُسے لوگ بھول جاتے ہیں اور کچھ ہی

عرصے میں کسی کو یاد نہیں رہتا کہ اس نام کا بندہ کوئی تھا بھی یا نہیں، وہ اچھا تھا یا جیسا بھی تھا کسی کو یاد نہیں رہتا۔ اسی لیے حضرت مریم علیہا السلام نے کہا کہ کاش یہ سب کچھ دیکھنے سے پہلے میں مرگئی ہوتی اور اب تک لوگ بھول بھال چکے ہوتے۔

جبرئیلؑ امین نے پردے کے پیچھے سے آواز دی، سامنے نہیں آئے کیونکہ ولادت کا وقت تھا اور دردِ زہ شروع ہو چکا تھا اور یہ خاتون کے لیے انتہائی پردے کا وقت ہوتا ہے، عرض کی: فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾ آپ گھبرائیں نہیں اللہ کریم نے آپ کے قدموں کے نیچے آپ کی خاطر ایک چشمہ جاری کر دیا ہے۔ ورنہ تو وہ صحرائی علاقہ تھا اور کھجوروں کے خشک تنے کھڑے تھے فرمایا: وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾ آپ اس کھجور کے تنے کو ہلائیں، تنا تو خشک ہے لیکن آپ پر تازہ کھجوریں گریں گی۔ جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے کہ دنیا عالمِ اسباب ہے اور سبب اختیار کرنا ضروری ہے۔ اب یہاں بھی دیکھیں کہ اللہ کریم نے قدموں میں چشمہ پیدا کر دیا ہے لیکن بتا دیا کہ آپ ریت ہٹائیں گی تو صاف پانی نکل آئے گا۔ ایک کھجور کے خشک تنے سے ٹیک لگائے آپ علیہا السلام کھڑی ہیں، اسی کو ہلانے کی کوشش کریں یعنی سبب اختیار کریں نتیجہ اللہ کریم کے دستِ قدرت میں ہے اور وہ ایسا قادر اور کریم ہے کہ خشک تنے پر تازہ کھجوریں دے رہا ہے۔ اللہ کریم نے ایسا انتظام فرمایا کہ وہاں تازہ میٹھا پانی بھی عطا فرما دیا اور فرمایا کہ کھجور کا تنا خشک ہے، خشک رہے گا آپ اس کھجور کے تنے کو ہلائیں تو آپ پر تازہ کھجوریں گریں گی۔ یہاں بھی اللہ کریم نے سبب اختیار کرنے کا حکم دیا۔

دردِ زہ میں آسانی کا نسخہ:

فرمایا: فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْنًا ۔۔۔ کھجوریں کھائیں اور پانی پئیں، کھجور پانی میں بھگو کر کھائیں، بیٹا پیدا ہو جائے گا اور بیٹے کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی کریں۔ گویا نیک اولاد کا پیدا ہونا بھی باعث راحت وسکون ہوتا ہے۔

آج بھی یہ بہت آزمودہ اور شافی علاج ہے کہ خاتون کو دردِ زہ میں تازہ کھجور پانی میں تر کر کے کھلائی جائے تو ولادت میں آسانی ہوتی ہے۔

حضرت مریم علیہا السلام سے اللہ نے بذریعہ جبرئیل امین فرما دیا کہ آپ اپنے بیٹے سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کریں۔ لوگوں کی فکر نہ کریں یعنی یہ کہ اللہ کی قدرت آگے خود سنبھال لے گی۔ فرمایا: فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا ﴿۲۶﴾ اگر کوئی آدمی آپ کے پاس آ جائے یا آپ واپس لوگوں میں جائیں اور وہ آپ سے سوال کریں تو آپ اشارہ کر دیجیے کہ میرا تو چپ کا روزہ ہے میں کسی سے بات نہیں کر سکتی۔ پہلی امتوں میں 'چپ کا روزہ' بھی رکھا جاتا تھا جبکہ شریعت محمدی علیٰ صاحبہا صلوٰۃ والسلام میں یہ نہیں ہے۔

ولایت آسان راستہ نہیں:

ولایت الٰہی اتنا آسان راستہ نہیں ہے، دین کا کام کرنا مجاہدہ کہلاتا ہے اس لیے کہ اس میں جدو جہد اور محنت کرنی پڑتی ہے اور بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لوگوں کی باتیں سننا پڑتی ہیں، الزامات لگائے جاتے ہیں، لوگ گالیاں بھی دیتے ہیں، راستے میں کانٹے بھی بچھاتے ہیں پتھر بھی مارتے ہیں۔ یہ سب کچھ سہہ کر اللہ کے بندے اللہ کے لیے محنت و مجاہدہ کرتے ہیں اور دین کی تبلیغ کرتے ہیں اور یہ سب کچھ سہنا پڑتا ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام کامل ولیہ ہیں جن سے فرشتہ ہمکلام ہوتا اور اللہ نے انہیں کراماتی طور پر بغیر شادی کے بیٹا عطا فرمایا جو صاحب کتاب نبیؑ تھا، اس کے باوجود کتنا مشکل کام ہے کہ ایک نوجوان بن بیاہی لڑکی اپنے نوزائیدہ بچے کو لے کر اپنی قوم کے پاس جائے۔ حکم ہوا آپ واپس جایئے۔ فَأَتَتْ بِهِ قَوْمَهَا تَحْمِلُهُ۔۔۔ تو وہ بچہ گود میں اٹھائے واپس آ گئیں: قَالُوا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا﴿٢٧﴾ لوگوں نے فوراً انگلیاں اٹھائیں، انہوں نے کہا کہ اے مریم علیہا السلام کیا غضب ڈھایا آپ نے، یہ کیا انہونی کر دکھائی؟: يٰاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا﴿٢٨﴾ اے ہارون کی بہن! تم موسیٰ اور ہارون علیہم السلام کے خاندان سے ہو، نیک نام گھرانے سے ہو جن کی نیک نامی اور پاکیزگی کی بہت شہرت ہے، تم نے یہ کیا غضب ڈھایا ہے؟ تمہارے والد بہت نیک آدمی تھے اور والدہ بھی نہایت پارسا تھیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی برائی کرنے والا نہیں تھا۔ تم ایک نیک خاندان سے تعلق رکھتی ہو، یہ انبیاءؑ کا پارسا خاندان ہے، تو پھر تم نے یہ کیا غضب ڈھایا؟ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ۔۔۔ حضرت مریم علیہا السلام نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف اشارہ کیا جو نوزائیدہ تھے: قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا﴿٢٩﴾ لوگ کہنے لگے بھلا جو بچہ ابھی پیدا ہوا ہے ماں کی گود میں پڑا ہے اس سے ہم کیا بات کریں، آپ اس کی طرف اشارہ کر رہی ہیں مگر ہم اس سے کس طرح بات کر سکتے ہیں، کیسے سوال کر سکتے ہیں؟ جب وہ یہ اعتراض کر رہے تھے تو عیسیٰ علیہ السلام ماں کی گود میں گویا ہوئے: قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ۔۔۔ فرمایا لوگو! میں اللہ کا بندہ ہوں: اٰتٰىنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا﴿٣٠﴾ اللہ نے مجھے ایک کتاب بھی دی ہے اور مجھے نبیؑ بنایا ہے، میں اللہ کی طرف سے بھیجا گیا ہوں۔

نبوت وہبی ہوتی ہے:

نبوت اللہ کی طرف سے عطا کی جاتی ہے، وہبی ہوتی ہے اور نبیؑ کی ذاتی صفت بن جاتی ہے۔ یہ فیصلہ ازل میں ہو چکا کہ نبوت کسے عطا کی جائے گی۔ نبیؑ پشتِ پدر میں نبیؑ ہوتا ہے، شکمِ مادر میں نبیؑ ہوتا ہے، دنیا میں پیدا ہوتے وقت بھی نبیؑ ہوتا ہے، دنیا سے رخصت ہوتے بھی نبیؑ ہوتا ہے۔ برزخ میں بھی، میدانِ حشر میں بھی نبیؑ، نبیؑ ہی ہوگا،

جنّت میں بھی اس کی نبوت، اس کی شانِ رسالت قائم رہے گی۔

بعثت کا معاملہ یہ ہے کہ نبیؑ کی نبوت لوگوں پر تب ظاہر ہوگی جب نبیؑ مبعوث ہوگا۔

عربی کا ایک قاعدہ:

عربی کا ایک قاعدہ ہے کہ جس کام کے ہونے کا یقین ہو، اگر مستقبل میں بھی ہونا ہوا سے صیغہء ماضی میں شمار کرتے ہیں کہ گویا یہ ہو چکا، یعنی یہ ضرور ہوگا۔ یہی اصول یہاں استعمال ہوا کہ بعثت تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعد میں ہوئی، کتاب بعد میں نازل ہوئی لیکن یہ وقت سے پہلے اطلاع دے رہے ہیں کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبیؑ بنایا ہے۔ یعنی یہ اتنا یقینی ہے کہ سمجھ لو کہ یہ ہو چکا۔

صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی اہمیت:

فرمایا: وَّجَعَلَنِيْ مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ ۖ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا ﴿۳۱﴾ وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾ مجھے بابرکت بنایا ہے، میں جس حال میں بھی ہوں، جہاں بھی ہوں اللہ کی طرف سے میں بابرکت ہوں۔ اللہ نے مجھے صلوٰۃ (نماز) اور زکوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ نماز کردار کی پاکیزگی اور زکوٰۃ مال کی پاکیزگی ہے۔ انسان کے پاس دو ہی چیزیں ہیں، ایک اس کا کردار اور ایک اس کا مال جبکہ باقی سب کچھ آگے ان پر استوار ہوتا ہے۔ اس کی ذات وصفات ایک پہلو ہے اور اس کے پاس اسبابِ دنیا اور مال ومتاع کیا ہے یہ دوسرا پہلو ہے۔ فرمایا مجھے اللہ کریم نے ذاتی طور پر نیکی کا، اللہ کی یاد میں رہنے کا، اللہ سے جڑے رہنے کا اللہ کے ذکر کا، صلوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ اور میرے پاس جو مال ہوگا وہ بھی پاکیزہ اور حلال ہوگا اور اس میں سے زکوٰۃ دی جائے گی اور اس کو پاک صاف رکھا جائے گا۔ اللہ کریم نے دونوں احکام زندگی بھر کے لیے ارشاد فرمائے ہیں۔

انبیا علیہم السلام ہمیشہ اعلیٰ نسب ہوتے ہیں:

فرمایا: وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ ۡ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ﴿۳۲﴾ اللہ نے مجھے اپنی ماں کے ساتھ نیک برتاؤ کرنے والا نیک اور صالح بنایا ہے۔ چونکہ آپؑ قدرتِ باری سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے اور آپؑ کی صرف والدہ تھیں اس لیے یہ ارشاد فرمایا۔ اللہ نے مجھے سختی یا جبر کرنے والا سرکش ونافرمان نہیں بنایا اور نہ ہی بدبخت بنایا ہے۔ بلکہ اللہ نے مجھے نیک بخت، خوش بخت بنایا ہے۔ انبیاؑ ہمیشہ اعلیٰ نسب سے ہوتے ہیں اور اُن کے والدین بھی نیک ہوتے ہیں، غلط کار نہیں ہوتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر اپنی ولادت تک

میں جس بھی مرد کی پشت میں رہا اور جس بھی والدہ سے پیدا ہوا، یعنی میری نسل جتنی بھی آدم علیہ السلام تک ہے اُن میں سے کسی کا باپ، کسی کی ماں غلط کار نہیں ہے، بدکار نہیں ہے۔

ایسے ہی ولایت میں بھی جن لوگوں کو مناصب عطا ہوتے ہیں وہ ہمیشہ اعلیٰ نسب کے اعلیٰ خاندانوں سے ہوتے ہیں۔

نسلِ انسانی کی حفاظت:

سارے انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جب طوفان آیا تو جہاں جہاں انسانی آبادی تھی ساری انسانیت، ماسوائے اُن کے جو حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار تھے، غرق ہوگئی۔ جو لوگ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی میں سوار تھے اور بچ گئے اُن میں سے بھی کسی کی نسل آگے نہیں چلی، سوائے حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹوں کی کہ آگے اُن کے پوتے پر پوتے ہوئے اور یوں آبادی بڑھی۔ اسی لیے حضرت نوح علیہ السلام کو آدمِ ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ اب سارے انسان تو اولادِ آدم علیہ السلام، یا نوح علیہ السلام کی اولاد ہی ہیں لیکن جوں جوں پیشے بڑھے، کردار بدلے تو یہ تبدیلی نسلوں کو متاثر کرگئی۔ جن لوگوں کا کردار اعلیٰ رہا، اخلاق واطوار پاکیزہ رہے اور انہوں نے اپنے نسب کی حفاظت کی تو وہ خاندان مدتوں چلتے رہے، چل رہے ہیں اور چلتے رہیں گے جو اعلیٰ نسب ہوں گے اُن کے کردار اچھے ہوں گے۔ لوگوں میں اُن کی عزت اور احترام ہوگا اور ایسے ہی خاندانوں میں سے انبیاؑ چنے جاتے رہے۔

جو لوگ اپنے کردار کی وجہ سے گھٹیا ہوگئے، سوچ گھٹیا ہوگئی پھر وہ بات Genes میں چلی جاتی ہے اور آگے نسل کمزور ہوجاتی ہے۔ گویا اپنے کردار کو گھٹیا کرنا یا کمینگی اختیار کرنا صرف اپنی ذات کی حد تک جرم نہیں ہے بلکہ یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ آنے والی نسلوں کو بھی کمینہ بنا دیتا ہے۔ یعنی انسان کو صرف اپنے لیے زندہ نہیں رہنا بلکہ اپنے پہلوں کی عزت بحال رکھنے اور اپنی آنے والی نسل کی بھلائی کے لیے اپنا کردار پاکیزہ رکھنا چاہیے۔

چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوۡمَ وُلِدۡتُّ وَیَوۡمَ اَمُوۡتُ وَیَوۡمَ اُبۡعَثُ حَیًّا ﴿۳۳﴾ ذٰلِکَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ ۚ قَوۡلَ الۡحَقِّ الَّذِیۡ فِیۡهِ یَمۡتَرُوۡنَ ﴿۳۴﴾ میں تو اللہ کی ایسی خوش نصیب ہستی ہوں کہ مجھ پر اللہ کی سلامتی اور رحمت ہے جب میں پیدا ہوا، مجھ پر اللہ کی طرف سے امان ہے۔ مجھے بھی مرنا ہے لیکن میری موت بھی اللہ کی سلامتی اور رحمت کے زیرِ سایہ ہے جب میں مروں گا تب بھی مجھ پر اللہ کی سلامتی ہوگی۔ جب اللہ کریم دوبارہ زندہ کریں گے اور میں بھی زندہ کیا جاؤں گا تب بھی مجھ پر اللہ کی سلامتی ہے۔ یعنی میں تو اللہ کی سلامتی

تقسیم کرنے والا، اللہ کا نبیؐ ہوں، صاحبِ کتاب ہوں۔

فرمایا: ذٰلِكَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِي فِيهِ يَمْتَرُونَ ﴿٣٤﴾ اے میرے حبیب! (صلی اللہ علیہ وسلم) انہیں بتا دیجیے کہ یہ تھے عیسیٰ علیہ السلام حضرت مریمؑ کے بیٹے، جن کے بارے میں ان لوگوں نے کیا کیا خرافات گھڑ رکھی ہیں۔ کوئی انؑ پر الزام لگاتا ہے، کوئی انؑ کو اللہ کا بیٹا کہتا ہے حالانکہ یہ سب بہت ہی غلط ہے اور سب بہتان ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اللہ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سچی بات بتا دی اور حقیقت بیان فرما دی جس میں یہ لوگ جھگڑتے ہیں ایک دوسرے پر الزام لگاتے ہیں، ایک دوسرے سے مناظرے کرتے ہیں۔

اللہ واحد و یکتا ہے:

فرمایا: مَا كَانَ لِلَّهِ أَنْ يَتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ ۔۔۔ اللہ کی شان تو اتنی بلند ہے کہ اسے زیبا ہی نہیں کہ وہ کسی کو اولاد بنائے یا اس کا کوئی بیٹا ہو اس لیے کہ اس جیسا دوسرا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ اللہ کی شان یہ ہے کہ وہ واحد و لاشریک ہے۔ نہ اس کا کوئی ماں باپ ہے، نہ اس کی اولاد ہے نہ اس کا کوئی رشتہ دار ہے اس جیسا دوسرا ہے ہی نہیں جبکہ اولاد میں تو والدین کی خصوصیات ہوتی ہیں جس طرح انسان کی اولاد انسان ہوتی ہے اگرچہ باپ طاقتور ہو بیٹا کمزور ہو سکتا ہے، باپ عالم ہو بیٹا جاہل ہو سکتا ہے، باپ خوبصورت ہو بیٹا بدصورت ہو سکتا ہے لیکن انسان کا بیٹا ہو گا تو انسان۔ اگر اللہ کا بیٹا ہوتا تو وہ بھی اللہ ہی ہوتا، اس میں الوہیت کی خصوصیات ہونی چاہیے تھیں۔ اللہ کا نبیؐ بھی ہو انسانی خصوصیات کا حامل بھی ہو، پیدا ہونا، مرنا، کھانا پینا یہ تمام حوائج بھی ہوں تو یہ سب اللہ کی شان سے تو بعید ہے۔ اللہ کی شان اس سے بہت بلند ہے سُبْحٰنَهٗ ۔۔۔ وہ ان باتوں سے بالاتر اور پاک ہے، اس کی تو شان یہ ہے کہ: إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ﴿٣٥﴾ اس کا علم حضوری ہے، اس کے سامنے ہر چیز موجود ہے۔ اس کے لیے نہ کوئی ماضی ہے نہ مستقبل بلکہ ہر چیز حال میں اللہ کے علم میں موجود ہے اور وہ جب چاہتا ہے، جو چاہتا ہے، جس کام کا فیصلہ کرتا ہے تو اُسے صرف حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ یعنی شئے معدوم ہے دنیا میں اس کا کوئی سرا سراغ نہیں ہے لیکن اللہ کے روبرو تو موجود ہے اور اللہ اُسے حکم دیتا ہے ہو جا اور وہ فوراً دنیا میں ہو جاتی ہے۔ موجود کو تو حکم دینا اور بات ہے، وہ معدوم کو حکم دیتا ہے اور وہ عدم سے وجود میں آ جاتا ہے۔

اللہ ربّ ہے اسی لیے معبودِ برحق ہے:

فرمایا: وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ۔۔۔ یقیناً یہی اللہ ہے، جس کی یہ شان ہے کہ جو کرنا چاہتا ہے اُسے حکم دیتا ہے 'ہوجا' اور وہ ہوجاتا ہے، اور یہ میرا پروردگار ہے، اور لوگو! سن لو تم سب کا بھی وہی پروردگار ہے۔ اللہ میرا خالق ہے، میرا رازق ہے، میری فریاد سننے والا بھی ہے اور ہر جگہ ہر نعمت مجھے پہنچانے والا بھی ہے۔ میری زندگی کی ایک ایک تار اسی کے دستِ قدرت میں ہے تو اسی کی عبادت کرو۔ فَاعْبُدُوْهُ۔۔۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنی ذاتِ اقدس کو سجدہ نہیں کروایا بلکہ ہر بندے سے کہا کہ تم براہ راست اللہ کو سجدہ کرو، تمہارا اللہ بھی وہی ہے میرا اللہ بھی وہی ہے۔ میری تمام حاجات پوری کرنے والا بھی اللہ ہے اور لوگو! تم سب کی بھی تمام ضروریات پوری کرنے والا اللہ ہی ہے لہٰذا اسی کی اطاعت کرو، اسی کی عبادت کرو، اُسے ہی سجدہ کرو۔ انبیاؑ کا یہ کمال ہوتا ہے کہ وہ اللہ کا بندہ ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے اور انہوں نے بھی جو پہلا کلمہ فرمایا وہ یہی تھا: اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ۔۔۔ میں اللہ کا بندہ ہوں، میں اللہ کی عبادت کروں گا، تم بھی کرو۔ میری پیدائش غیر فطری طریقے سے ہوئی، اللہ کی قدرتِ کاملہ سے ہوئی ہے لیکن اس پیدائش سے میں خدا نہیں بن گیا۔ میری ولادت میں عجیب بات ضرور ہے لیکن میری پوجا نہ کرنا۔ میں اللہ کا بندہ ہوں۔ یہی بات آپ صلی اللہ علیہ وسلّم فرما رہے ہیں کہ اللہ ہی میرا ربّ ہے اور تمہارا بھی ربّ ہے لہٰذا اسی کی عبادت کرو: هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٣٦﴾

یہی سیدھا راستہ ہے کہ اپنی ساری امیدیں، اللہ کی ذات سے جو وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ ہے، سے وابستہ کرلو، تمہیں ہر نعمت وہیں سے ملے گی لہٰذا اسی کی اطاعت اختیار کرو۔ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں سے امیدیں وابستہ کرنا سیدھا راستہ نہیں ہے۔

شرک کا وبال:

فرمایا: فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَيْنِهِمْ۔۔۔ پھر لوگوں میں اختلاف پیدا ہوا اور وہ مختلف دھڑوں میں بَٹ گئے اور انہوں نے اللہ کی بجائے مخلوق کی پوجا شروع کردی۔ کسی نے پتھروں کی، کسی نے بتوں کی پوجا شروع تو کسی نے سورج، آگ اور فرشتوں کی پوجا شروع کردی۔ کچھ لوگوں نے اللہ کے بیٹے بنا لیے، تو یوں لوگ فرقوں میں بَٹ گئے۔ ایسے لوگوں کے لیے: فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿٣٧﴾ بہت خرابی ہے جو قیامت کا اور اللہ کے روبرو حاضری کا انکار کرتے ہیں۔ جو عظمتِ الٰہی کو چھوڑ کر، حضورِ حق میں پیش ہونے کی تیاری نہ کرکے اور اللہ پر ایمان نہ لاکر کسی فرقے میں چلا گیا اس نے خود کو تباہ کرلیا، وہ اُجڑ گیا، برباد ہوگیا۔ ایسا کرنے سے

اللہ کا تو نقصان نہیں کر سکتا، اس کی شان تو کم نہیں ہوتی۔ اللہ کے دین کا بھی کچھ نقصان نہیں کر سکتا کہ اللہ کا دین بھی ان شآء اللہ قیامت تک رہے گا، جو مخالفت کرتا ہے وہ اپنے آپ کو تباہ کر لیتا ہے۔

عین الیقین:

فرمایا: اَسۡمِعۡ بِہِمۡ وَ اَبۡصِرۡ ۙ یَوۡمَ یَاۡتُوۡنَنَا لٰکِنِ الظّٰلِمُوۡنَ الۡیَوۡمَ فِیۡ ضَلٰلٍ مُّبِیۡنٍ ﴿۳۸﴾ جب میدانِ حشر قائم ہوگا، بارگاہِ الٰہی لگے گی، دربارِ الٰہی ہوگا تو دیکھنا کہ یہ لوگ کیسے دیکھنے اور سننے والے ہو جائیں گے۔ جب دوزخ بھی سامنے لائی جائے گی اور جنت بھی قریب ہوگی تو انہیں ہر بات کا یقین آ جائے گا۔

دوزخ بھی کھینچ کے قریب لائی جائے گی اور: وَ اُزۡلِفَتِ الۡجَنَّۃُ لِلۡمُتَّقِیۡنَ غَیۡرَ بَعِیۡدٍ (ق: 31) جنت بھی سجا کر قریب لائی جائے گی اور کہا جائے گا کہ جنت بھی دیکھ لو دوزخ بھی دیکھ لو، اور سارے حالات و واقعات فرشتے بھی نظر آ رہے ہوں گے تو دیکھنا یہ کیسے دیکھنے اور سننے والے ہوں گے لیکن آج دنیا میں یہ ظالم، غلط کار کتنی بڑی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں کہ حقائق کا انکار کیے پھرتے ہیں اور مفروضے بنا رکھے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ ساری کی ساری ہدایت اللہ کی کتاب اور اللہ کے نبیؐ کے ارشاد میں ہے، اس کے علاوہ جو کچھ بھی گھڑا جاتا ہے وہ سب گمراہی ہے۔

یومِ حسرت:

فرمایا: وَ اَنۡذِرۡہُمۡ یَوۡمَ الۡحَسۡرَۃِ اِذۡ قُضِیَ الۡاَمۡرُ ۘ وَ ہُمۡ فِیۡ غَفۡلَۃٍ وَّ ہُمۡ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ ﴿۳۹﴾ انہیں اس دن سے ڈرائیں جب فیصلے ہوں گے اور وہ حسرت کا دن ہے۔ آج تو عمل کی فرصت ہے، لوگ عمل کر رہے ہیں اور سب کے اعمال لکھے جا رہے ہیں۔ اللہ نہایت غفور و رحیم ہیں کہ ہر جرم پر گرفت نہیں فرماتے ورنہ ارشادِ باری ہے کہ اگر ہم ہر جرم پر گرفت کرتے تو شاید دنیا میں کوئی بھی جاندار زندہ نہ بچتا اور انسانوں کے لیے زندگی دشوار ہو جاتی لہٰذا وہ مہربانی فرماتے ہیں۔ علمائے حق فرماتے ہیں کہ گناہ زہر ہے۔ اگر کوئی زہر کھا لے اور اسے قے شروع ہو جائے یا پیچش لاحق ہو جائے تو اس کی جان بچ جاتی ہے لیکن اگر زہر ہضم ہو جائے تو موت کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی طرح اگر گناہ کے صدور پر اللہ کی طرف سے کوئی چھوٹی موٹی سزا آ جائے تو توبہ کا سبب بن جاتی ہے لیکن اگر یہ گناہ کا زہر ہضم ہو جائے تو ایمان کی موت کا سبب بن جاتا ہے۔ لہٰذا انہیں فیصلے کے دن سے ڈرایئے، آج تو یہ غفلت میں پڑے ہیں ایمان نہیں لا رہے لیکن اس دن کیا کریں گے جب فیصلے ہوں گے اور وہ ان کے لیے حسرت کا دن ہے۔

نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے کہ اس دن جنتی بھی حسرت کریں گے۔ صحابہؓ نے عرض کی

یارسول اللہ صلی اللہ علیہم جنتی کیوں حسرت کریں گے جبکہ وہ تو بخشے گئے کامیاب ہو گئے۔ فرمایا جنتی بھی اس دم، اس لمحے پر حسرت کریں گے جو ذکر اللہ کے بغیر گزرا ہوگا، کہ کاش! یہ وقت بھی ذکر، یادالٰہی میں بسر کیا ہوتا، کاش! اس وقت میں دو رکعت اور پڑھ لیتا۔ کاش! اس وقت کو تلاوتِ قرآن میں بسر کر لیتا، درود شریف اور تسبیحات میں گزار دیتا، میں اور برکات سمیٹ لیتا۔ یوں جنتی بھی ذکرالٰہی کے بغیر گزارے ہوئے لمحات پر حسرت کریں گے جبکہ اہلِ دوزخ تو ہیں ہی حسرت زدہ کہ اُن کا تو ایمان ہی نہیں ہے تو عمل کہاں سے ہوں گے لہٰذا بالکل ہی تہی دامن ہوں گے اور فیصلے کی گھڑی ہے تو وہ حسرت سے مریں گے۔

کائنات کا مالک صرف اللہ ہے:

فرمایا: اِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْاَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ۝ ہم زمین کے مالک بھی ہیں اور جو کچھ زمین پر ہے وہ ہمارا ہے اور اس کے وارث بھی ہم ہی ہیں۔ ایک گھاس کے تنکے سے لے کر بلند و بالا پہاڑ تک، ایک ادنیٰ سی چیونٹی سے لے کر ہاتھی تک، الغرض جو کچھ زمین پر ہے وہ بھی ہمارا ہے اور زمین بھی ہماری ہے۔ تمہارا اس میں کچھ بھی نہیں ہے نہ ہی تم نے کچھ تخلیق کیا ہے لہٰذا جو کچھ میں تمہیں عطا کر دیتا ہوں اس پر شکر کرو، شکوے نہ کرتے رہو کہ مجھے یہ نہیں ملا، وہ نہیں ملا۔ تمہارا ہے کیا جو تمہیں ملے؟

حق تو یہ ہے جو نعمتیں حلال جائز طریقے سے اللہ کریم عطا فرماتے ہیں ان کا شکر ادا کرنا چاہیے لیکن ہمارا رویہ مختلف ہے اور ہم ساری عمر شکایت ہی کرتے رہتے ہیں کہ مجھے کچھ نہیں ملا جبکہ جو نعمتیں ملی ہوتی ہیں اُن کا احساس ہی نہیں کرتے اور اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ یہ زمین اور جو کچھ اس پر ہے سب میرا ہے اور سب نے پلٹ کر میرے پاس ہی آنا ہے۔ تم سب کو بھی میری بارگاہ میں حاضر ہونا ہے اور پھر یہاں فیصلہ ہوگا کہ جو نعمتیں میں نے عطا کیں اس پر تم نے میرا شکر ادا کیا یا نافرمانی کرتے رہے، میری ذات کی عبادت کی یا میرے ساتھ لوگوں کو شریک کرتے رہے۔

اللہ کریم ہدایت نصیب فرمائیں اور نیکی کی توفیق عطا فرمائیں اور اپنی نافرمانی سے پناہ میں رکھیں۔

سورۃ مریم رکوع 3 آیات 41 تا 50

أَعُوذُ بِاللَّهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِبْرٰهِيمَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ﴿٤١﴾ إِذْ قَالَ لِأَبِيهِ
يٰٓأَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنكَ شَيْـًٔا ﴿٤٢﴾ يٰٓأَبَتِ
إِنِّي قَدْ جَآءَنِي مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِيٓ أَهْدِكَ صِرٰطًا سَوِيًّا ﴿٤٣﴾
يٰٓأَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۖ إِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿٤٤﴾ يٰٓأَبَتِ
إِنِّيٓ أَخَافُ أَن يَمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُونَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿٤٥﴾
قَالَ أَرَاغِبٌ أَنتَ عَنْ ءَالِهَتِي يٰٓإِبْرٰهِيمُ ۖ لَئِن لَّمْ تَنتَهِ لَأَرْجُمَنَّكَ
وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا ﴿٤٦﴾ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۖ سَأَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيٓ ۖ إِنَّهُ كَانَ بِي
حَفِيًّا ﴿٤٧﴾ وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَأَدْعُوا رَبِّي عَسَىٰٓ أَلَّآ
أَكُونَ بِدُعَآءِ رَبِّي شَقِيًّا ﴿٤٨﴾ فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ
اللَّهِ وَهَبْنَا لَهُۥٓ إِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿٤٩﴾ وَوَهَبْنَا لَهُم
مِّن رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿٥٠﴾

اور اس کتاب میں ابراہیم (علیہ السلام) کا (قصہ) بیان کیجیے۔ بے شک وہ صدیق (اور) نبی تھے ﴿۴۱﴾ جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا اے میرے والد! آپ ایسی چیز کی عبادت کیوں کرتے ہو جسے نہ کچھ سنائی دے اور نہ دکھائی دے اور نہ آپ کے کسی کام آ سکے ﴿۴۲﴾ اے میرے والد! یقیناً مجھے ایسا علم عطا ہوا ہے جو آپ کو نہیں ملا، سو آپ میرا اتباع کریں میں آپ کو سیدھی راہ بتا دوں گا ﴿۴۳﴾ اے میرے والد! شیطان کی پوجا نہ کریں بے شک شیطان رحمٰن کا نافرمان

ہے ﴿۴۴﴾ اے میرے والد! بے شک مجھے اس بات سے ڈر آتا ہے کہ کہیں آپ پر رحمٰن کی طرف سے کوئی عذاب (نہ) آپڑے تو آپ شیطان کے ساتھی بن جائیں ﴿۴۵﴾ اس (باپ) نے کہا اے ابراہیم (علیہ السلام)! کیا تم میرے معبودوں سے برگشتہ ہو (پھرے ہوئے ہو) اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں ضرور پتھروں سے ماردوں گا اور تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے دور ہو جا ﴿۴۶﴾ فرمایا سلام ہو آپ پر میں عنقریب اپنے پروردگار سے آپ کے لیے بخشش طلب کروں گا بے شک وہ مجھ پہ بہت مہربان ہے ﴿۴۷﴾ اور میں تم لوگوں اور جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو ان سے کنارہ کرتا ہوں اور میں اپنے پروردگار کی عبادت کروں گا۔ امید ہے کہ میں اپنے پروردگار کی عبادت کر کے محروم نہ رہوں گا ﴿۴۸﴾ پس جب وہ ان لوگوں اور جن کی وہ اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے تھے علیحدہ ہو گئے تو ہم نے ان کو اسحٰق (علیہ السلام، بیٹے) اور یعقوب (علیہ السلام، پوتے) عطا فرمائے اور ان (دونوں میں سے) ہر ایک کو نبیؑ بنایا ﴿۴۹﴾ اور ان کو اپنی رحمت سے حصہ عطا فرمایا اور (آئندہ نسلوں میں) ہم نے ان کا نام نیک (اور) بلند فرمایا ﴿۵۰﴾

تفسیر ومعارف

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِبْرٰهِيْمَ ۔۔۔ فرمایا، انہیں کتاب اللہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر خیر بھی سنا دیجیے: اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ بے شک وہ صدیق اور نبیؑ تھے یہ تذکرہ اس لیے ضروری تھا کہ اکثر مشرکین عرب کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پیروکار تھے اور ان مشرکین کا کردار یہ تھا کہ کفر اور شرک میں مبتلا تھے، بتوں کو پوجتے اور ایسی رسومات گھڑ رکھی تھیں جن کا حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

نبیؑ سے تعلق کا معیار یہ ہوتا ہے کہ جس نبیؑ کے اتباع کا دعویٰ ہو اس کے ارشادات کے مطابق عمل کیا جاتا ہے، نبیؑ کی لائی ہوئی کتاب کے مطابق کردار کو ڈھالا جاتا ہے۔ نبیؑ سے زبانی تعلق نہیں ہوتا بلکہ نبیؑ کا تعلق دل سے ہوتا ہے اور جب یہ تعلق قائم ہو جائے، مضبوط ہو جائے تو پھر زبان بھی اللہ کے نبیؑ کی بات کرتی ہے، اللہ کے نبیؑ کی بات مانتی ہے اور دماغ بھی اللہ کے نبیؑ کی منشا کے مطابق سوچتا ہے۔ اعضاو جوارح بھی اس طرح کام کرتے ہیں جس طرح

اللہ کا نبیؑ فرماتا ہے اور اگر کہیں غلطی ہو جائے تو انسان کو تکلیف ہوتی ہے، دکھ ہوتا ہے اور وہ رجوع الی اللہ کرتا ہے، توبہ کرتا ہے اصلاح کرتا ہے۔ جب دل کا رشتہ نبیؑ سے استوار نہ رہے، دل مردہ ہو جائے تو زبانی رشتہ کام نہیں آتا اور بندہ نام تو نبیؑ کا لیتا ہے مگر کام اپنی پسند سے کرتا ہے، نام دین کا لیا جاتا ہے مگر نبھائی رسومات جاتی ہیں۔ جوں جوں وقت گزرتا ہے یعنی مرورِ زمانہ سے انبیاؑ سے تعلق کمزور پڑتا ہے اور رسومات اور خرافات عام ہو جاتی ہیں جیسے بعثتِ عالی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دین تو ختم ہو چکا تھا اور لوگ رسومات کے اسیر تھے حتیٰ کہ بتوں کی پوجا بھی اسی خیال سے کرتے کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کرتے ہیں جیسا کہ ارشاد ہے: مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ۔۔۔(الزمر:3) کہتے ہیں، ہم ان بتوں کو اس لیے پوجتے ہیں کہ یہ ہمیں کسی درجے میں اللہ کا مقرب بنا دیں۔ ان کے نزدیک یہ بت قربِ الٰہی کا وسیلہ ہیں۔ گویا اُن کے پاس اللہ کا تصور تو تھا لیکن تصور ہونا اور بات ہے اور اطاعت کرنا ایک الگ بات ہے۔

منصبِ صدیقیت:

فرمایا: اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۴۱﴾ بے شک حضرت ابراہیم علیہ السلام صدیق اور نبیؑ تھے صدیق کا لفظی معنیٰ تو ہے سچا ہونا لیکن یہاں صدیق سے مراد منصب صدیقیت ہے۔ فرمایا، ابراہیم علیہ السلام اللہ کے نبی تو تھے ہی نبیوںؑ میں آپؑ صدیقیت کے حامل بھی تھے۔ فرمایا، آپؑ صدیق بھی تھے اگرچہ ارشادِ باری کی بے شمار مصلحتیں ہوں گی، کئی پہلو ہوں گے ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مشرکین نے ابراہیمؑ کے نام پر جو جھوٹ گھڑ رکھے تھے ان کی قلعی کھول دی جائے اس لیے فرمایا آپ تو سچے، کھرے اور راست باز تھے اور تم ان کی پیروی کا دعویٰ بھی رکھتے ہو اور شرک بھی کرتے ہو۔

بعض علما نے لکھا ہے کہ جو سچ کے مطابق بات کرے وہ صادق ہے اور جو جیسا کہے پھر ویسا ہی ہو جائے وہ صدیق ہے، دراصل صادق اور صدیق ایک ہی مصدر سے ہیں۔ صدیق ہونا ایک منصب بھی ہے جو نبوت میں بھی ہے اور ولایت میں بھی ہے۔ نبیؑ بحیثیت نبیؑ کے صدیق ہوتا ہے اور ولی بحیثیت ولی کے صدیق ہوتا ہے۔ نبیؑ کا اپنا منصب، اپنا مقام ہے، نبیؑ کی منفرد شان کے مطابق ہے۔ نبیؑ جو کچھ پاتا ہے براہ راست اللہ کریم سے پاتا ہے جبکہ ولی جو کچھ پاتا ہے نبیؑ کی وساطت سے پاتا ہے، نبیؑ کی اطاعت اور غلامی سے پاتا ہے۔

مناصبِ اولیا:

مناصبِ اولیا کے متعلق حدیث شریف میں بھی ارشاد ہے اور محققین نے اس موضوع پر بہت تحقیق بھی کی

ہے جو اس شعبہ کی کتب میں دیکھی جاسکتی ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ دنیا میں جتنی مخلوق بستی ہے اُن میں سے بیک وقت چار بندے ایسے منتخب کیے جاتے ہیں جو قطب کہلاتے ہیں اور اُن چاروں کا تعلق الگ الگ شعبوں سے ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک قطبِ ارشاد ہے، ایک قطب ابدال ہے۔ قطبِ ارشاد کا منصب اگر کسی مضبوط شخص کو عطا ہو تو دنیا میں رشد و ہدایت، علم و فہم بڑھ جاتا ہے اور یہ ضروری نہیں کہ اس کے کرنے سے ہو بلکہ قدرتی طور پر ہوتا ہے۔ جس طرح سورج کی کرنوں سے بے شمار چیزوں کو نمو ملتی ہے، بے شمار چیزیں پلتی ہیں، زمین پر بے شمار تبدیلیاں آتی ہیں لیکن سورج کو اس کا پتا بھی نہیں ہوتا۔ ایسے ہی صاحبِ منصب افراد کو بھی ضروری نہیں ہے کہ پتا ہو، اُن کے وجود کی برکت سے کام ہوتا رہتا ہے۔ اللہ کریم ان کے وجود کو سبب بنا دیتے ہیں جیسے بارش کو روئیدگی کا سبب بنا دیتے ہیں۔ ان اقطاب کے اوپر جو منصب ہے اُسے غوث کہتے ہیں اور روئے زمین پر جتنی انسانی آبادی ہے، اس میں ہر دور میں صرف ایک شخص ہوتا ہے جس کے پاس منصبِ غوثیت ہوتا ہے۔ عموماً اس منصب سے آگے بہت کم ترقی ہوتی ہے۔ یہ بہت بڑا منصب ہوتا ہے کہ روئے زمین کی ساری آبادی میں ایک غوث ہوتا ہے، تو یہ بہت ہی بڑا منصب ہے۔ اللہ جب چاہے تو گاہے گاہے غوث ترقی پا کر قیوم بنتا ہے۔ قیومیت منصب ہے۔ قیوم ترقی کر کے فرد بنتا ہے، فرد بھی ایک منصب ہے جو قیوم سے بالاتر ہے۔ جب کسی فرد کو ترقی ملے تو وہ قطبِ وحدت کہلاتا ہے اور وہ اپنے عہد کا بے نظیر شخص ہوتا ہے۔ قطبِ وحدت کو اگر ترقی ملے تو وہ صدیق کہلاتا ہے اور یہ صدیق گاہے گاہے، صدیوں بعد اللہ کریم پیدا فرماتے ہیں۔ یہ مناصبِ ولایت نظامِ کائنات کو معتدل (balanced) رکھنے کے لیے ہوتے ہیں۔ دنیا میں جتنی گمراہی بڑھتی ہے اس کے مقابلے کے لیے اللہ کریم اتنا ہی بڑا منصب عطا کر دیتے ہیں پھر اس کے طفیل نورانیت پھیلتی ہے، ہدایت پھیلتی ہے، مسلمانوں میں بیداری آتی ہے، دین کو قوت فراہم ہوتی ہے۔ اولیا میں صدیق ایسے ہوتا ہے جیسے چاند ستاروں میں سورج ہے۔ اس کی کوئی تاب نہیں لاسکتا۔

حضرت ابراہیمؑ کی شانِ ارفع کا ذکر ہے کہ فرمایا، آپؑ صدیق تھے اور ان کی قوم کا ذکر ہے کہ وہ رسومات کی اسیر ہو چکی تھی۔ آج ہم نے بھی دین کے نام پر بے شمار رسومات اور باتیں گھڑ رکھی ہیں اور بہت سے تماشے کرتے ہیں جن کو باعثِ نجات سمجھتے ہیں حالانکہ اُن کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، نہ ہی دین میں اُن کی کوئی اصل ملتی ہے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ ہمارے پاس قرآن ہے اور اللہ نے اپنے بندوں کو توفیق دی ہے اور وہ قرآن و حدیث مسلسل بیان کرتے آرہے ہیں۔ علمائے حق بیان کرتے رہتے ہیں اس کے باوجود ہم دین کو نظر انداز کر کے رسومات میں کھو گئے

ہیں۔ فرائض کی ادائیگی کا اہتمام کوئی نہیں کرتا لیکن رسومات پوری پابندی سے ادا کی جاتی ہیں حتیٰ کہ گھر کی خواتین تک میں وہ راسخ ہیں۔ یہ بہت بدنصیبی ہوتی ہے کہ فرائض وعبادت چھوڑ دی جائے اور رسمیں نبھائی جائیں۔ اس کردار کے ساتھ ہمیں دین دار ہونے کا بھی دعویٰ ہے۔

فرمایا، حضرت ابراہیمؑ تو اس قدر راست باز تھے کہ حق کہنے میں کوئی رشتہ ان کے آڑے نہیں آیا۔ آپؑ کا ہر قول اور ہر فعل حق کو ثابت کرتا رہا، حق کو قائم کرتا رہا۔

انبیاؑ کے والدین اور بیویاں پاک باز ہوتے ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد جو شاہی بت خانہ کے ذمہ دار تھے اور بتوں کی دیکھ بھال کرتے تھے، آپؑ نے ان سے صاف کہا: اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْـًٔا ﴿۴۲﴾ ابا جان! آپ ایسی چیزوں کی عبادت کیوں کرتے ہیں جو نہ آپ کی بات سُن سکتے ہیں نہ آپ کو دیکھ سکتے ہیں؟ جب یہ آپ کو سُن، دیکھ نہیں سکتے تو یہ آپ کے کس کام آئیں گے؟ یہ تو آپ کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ جن بتوں کی آپ پوجا کرتے ہیں وہ تو آپ کی عبادت سے بے خبر ہیں۔ یہ تو محض پتھر یا لکڑی کے بت ہیں جو آپ نے تراش لیے ہیں جن میں نہ قوتِ سماعت ہے نہ قوتِ گویائی ہے نہ بصارت ہے۔ وہ آپ کا کیا بگاڑ یا سنوار سکتے ہیں، آپ ان کی پوجا کیوں کرتے ہیں؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کے حوالے سے علما کی دو رائے ہیں۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ آزر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد نہیں بلکہ چچا تھے چونکہ انہوں نے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پالا پوسا تھا تو عربی میں چچا کو بھی اَبٌ کہہ دیتے ہیں اس لیے یہ کہا گیا۔ غالباً علما نے یہ اس لیے کہہ دیا کہ آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ عالی ہے کہ میں آدم علیہ السلام سے لے کر اپنے باپ تک نیک پشتوں میں رہا، پاک پشتوں میں رہا حتیٰ کہ میں دنیا میں ظاہر ہوا میری ولادت ہوئی۔ لیکن قرآن نے تو سیدھا سیدھا لِاَبِيْهِ۔۔۔ 'اپنے باپ سے' استعمال فرمایا ہے۔ حق یہ ہے کہ پاک باز ہونا ایک اور بات ہے اور مسلمان ہونا ایک اور، انبیاؑ میں حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی مسلمان نہیں تھیں لیکن انبیاؑ کے ساتھ جو لوگ ہوتے ہیں اگر مسلمان نہ بھی ہوں تو کردار کے پاکباز ہوتے ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی مسلمان نہیں ہے لیکن کردار کی پاکباز تھی۔ اسی اعتبار سے ابراہیم علیہ السلام کے والد بھی کردار کے پاکباز تھے۔

چونکہ قرآن نے لفظ لِاَبِیْہِ۔۔۔استعمال فرمایا ہے اس لیے بہتر یہی ہے کہ جو لفظ قرآن نے استعمال فرمایا ہے اسی کو اختیار کیا جائے۔

محض عمر کی زیادتی دلیلِ بزرگی نہیں:

فرمایا: يٰٓاَبَتِ اِنِّىْ قَدْ جَآءَنِىْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِىْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا۝۴۳ اے والدِ بزرگوار! اللہ نے مجھے وہ علم دیا ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ میں اللہ کا نبیؑ ہوں، مجھ پر وحی آتی ہے اور مجھے اللہ کی طرف سے وہ علوم عطا ہوئے ہیں جن سے آپ واقف نہیں ہیں۔ سو آپ میرا اتباع کریں، میں آپ کو سیدھی راہ بتا دوں گا۔ اس کا مطلب ہے کہ بزرگی عمر سے نہیں آتی بلکہ بزرگی اللہ سے تعلق اور ان علوم کی وجہ سے، جو منجانب اللہ عطا ہوتے ہیں، آتی ہے۔ اگر بزرگی عمر سے آتی تو پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے بزرگوں کا یعنی والد کا اتباع کرنا چاہیے تھا لیکن آپؑ نے فرمایا اے والدِ گرامی اللہ نے مجھے علم دیا ہے جو آپ کے پاس نہیں ہے سو آپ کو فَاتَّبِعْنِىْٓ۔۔۔ میرا اتباع کرنا چاہیے۔ جو میں کہوں آپ کو وہ کرنا چاہیے اس لیے کہ میں اللہ کا نبیؑ ہوں اللہ کریم مجھے راستہ سمجھاتے ہیں جبکہ آپ کو اس کی خبر نہیں۔ اگر کسی عمر رسیدہ شخص کو راستے کا علم نہ ہو تو وہ کسی راہ جاننے والے سے پوچھے گا خواہ وہ اس سے عمر میں کم ہی کیوں نہ ہو۔ نہ جاننے والے کو جاننے والے کا ہی اتباع کرنا پڑے گا۔ تو فرمایا: اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا۝۴۳ آپ میرے پیچھے چلیں تا کہ میں آپ کو سیدھے راستے پر چلا کر منزل تک لے جاؤں۔ جو راہ سے واقف ہو وہی راہ پر سیدھا لے کر چل سکتا ہے اور انبیاؑ کا تو راستہ بھی سیدھا تک ہوتا ہے، اس میں کوئی اینچ پینچ، کوئی بل یا فریب نہیں ہوتا، کچھ بھی غیر موزوں نہیں ہوتا بلکہ زندگی کے ہر شعبے پر چلنے کا صحیح ترین طریقہ ہوتا ہے۔

کسی کا لمبی عمر پانا بھی ہمارے ہاں بہت بڑی کرامت سمجھی جاتی کہ فلاں بزرگ بہت عظیم ہے اس کی عمر سو سال سے بھی زیادہ ہے حالانکہ اگر اُن کی عمر سو سال سے زیادہ ہے تو اس میں اُن کا کیا کمال ہے؟ یہ تو اللہ کریم نے مہلت دی ہے، موت نہیں آئی اس لیے زندہ ہیں۔ اُن کے اختیار میں تو نہیں ہے نہ ہی اُن کا کمال ہے کہ وہ اپنی عمر خود کھینچ کر لمبی کر رہے ہیں۔ کمال تو یہ ہے کہ معرفتِ الٰہی میں کسی کو کیا نصیب ہوا؟ بوڑھا ہونا تو فطری عمل ہے اس میں انسان کی کوئی کاوش نہیں لگتی نہ ہی بوڑھا ہونے کے لیے مجاہدہ کرنا پڑتا ہے۔ نیک لوگوں پر بھی بڑھاپا آتا ہے اور بدکاروں پر بھی آتا ہے۔ کافر بھی بڑی لمبی لمبی عمریں گزار کر مرتے ہیں اس لیے محض عمر زیادہ ہونے سے بزرگی نہیں مل جاتی۔

شیطان کی عبادت:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا۝۴۴ اے والدِ گرامی شیطان کی پوجا نہ کریں یہ انسان کو زیب نہیں دیتا۔ اگرچہ مشرکین بتوں کی پوجا کرتے تھے

لیکن وہ بتوں کو اللہ کے قرب کا وسیلہ سمجھتے تھے تو آپؑ نے فرمایا کہ یہ سب شیطان کی گھڑی ہوئی باتیں ہیں۔ آپ بتوں کو پوج رہے ہیں لیکن یہ بالواسطہ شیطان ہی کی پوجا ہے کہ اسی کی بات مان رہے ہیں۔

اسی طرح جب بھی کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت چھوڑ کر دوسرے کاموں میں مصروف ہوجاتا ہے تو یہ شیطان کی عبادت ہے، اس لیے کہ یہ باتیں شیطان سکھاتا ہے اور اگر بندہ اُن کی پیروی شروع کردے تو گویا اس نے شیطان کی عبادت کی۔ جیسا کہ سورۃ الجاثیۃ میں ارشاد ہے: اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ۔۔۔(الجاثیہ:23) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن لوگوں کو دیکھا جنہوں نے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنالیا، اپنی خواہشات کی پوجا کرتے ہیں! اب خواہشات کا کوئی بت تو تراشا نہیں جاتا وہ تو انسان کے دل کے اندر ہوتی ہیں یا ذہن میں ہوتی ہیں، کوئی اپنی خواہش کو مجسم کرکے سامنے رکھ کر سجدے تو نہیں کرتا لیکن جب اللہ کی نافرمانی میں اپنی خواہش کی پیروی کرتا ہے تو اللہ کریم فرماتے ہیں کہ اب یہ میری اطاعت سے نکل گیا، اس کا معبود اس کی خواہش ہے کہ اس کی تکمیل کے لیے ناجائز ذرائع استعمال کرتا ہے اور میری نافرمانی کرتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: يٰۤاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾ اے والدِ گرامی! شیطان کی پوجا انسان کو زیب نہیں دیتی اس لیے کہ شیطان تو اللہ کا نافرمان ہے، کافر ہے بلکہ بدترین کافر ہے اور جو اس کے پیچھے چلے گا وہ اُسے بھی کفر میں لے جائے گا، اللہ کی نافرمانی میں لے جائے گا۔ دوسری بات یہ ہے کہ شیطان تو جن ہے جو انسان سے ادنیٰ مخلوق ہے، تو اپنے سے کمتر مخلوق کی پیروی یا پوجا کرنا کہاں کی دانشمندی ہے! جب کوئی اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، شیطان کی بات مانتا ہے تو گویا وہ شیطان کی پوجا کررہا ہے اور یہ بات یہاں ختم نہیں ہوگی بلکہ بہت آگے تک جائے گی، شیطان کی پوجا کرنے والا اللہ کے عذاب میں گرفتار ہوگا اور اس کے ساتھ پھر جہنم میں بھی جائے گا۔

اللہ کی صفتِ رحمت:

فرمایا: يٰۤاَبَتِ اِنِّيْۤ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ۔۔۔ اے والدِ گرامی! میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ اگر آپ نے توبہ نہ کی اور بتوں کی پوجا پر جمے رہے تو اللہ رحمٰن و رحیم کی طرف سے کہیں عذاب نہ آجائے۔ اللہ تو بہت مہربان ہے لیکن آپ کے کردار کی وجہ سے آپ پر عذاب نہ آجائے۔ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾ اور آپ شیطان کے ساتھی نہ بن جائیں۔ اس آیت میں اللہ نے عذاب کے ساتھ رحمٰن کی صفت جوڑ دی، یہ عجیب سی بات نہیں ہوگئی؟ یہ خوبصورت جملہ بتا رہا ہے کہ اللہ کی رحمت اس کی تمام صفات پر غالب ہے۔

الرَّحْمٰنِ، الرَّحِيْمِ یہ اللہ کی رحمت کے دو انداز ہیں۔ رحمٰن کا معنی ہے بہت بخشنے والا، وسیع مغفرت والا لیکن رحمانیت ایسی صفت ہے جس کی ایک حد ہے اور رحیمیت ایسی صفت ہے جو لامحدود ہے۔ رحیمیت اور رحمانیت دونوں اللہ کی صفات ہیں جو ہمیشہ کے لیے ہیں تو اس کی حدود کے کیا معنی؟ جواب یہ ہے کہ صفاتِ الٰہی کی کوئی حد نہیں۔ یہ حد ہماری طرف سے ہے جب تک ہم میں قبولیت کی استعداد ہوتی ہے ہم اللہ کی رحمانیت سے مستفید ہوتے ہیں لیکن جب ہم اپنی استعداد ضائع کر دیتے ہیں تو اس سے مستفید نہیں ہو سکتے۔ عربی میں اس وزن کے الفاظ عطشان، غضبان وقتی حال کی خبر دیتے ہیں۔ مثلاً عطشان، بہت پیاسا لیکن پیاس دائمی کیفیت نہیں ہے بلکہ پانی پیتے ہی ختم ہو جائے گی۔ اسی طرح غضبان کہ بہت غصے میں یا ناراض تو کوئی بھی مستقل ناراض نہیں رہتا۔ غصہ ختم ہو جاتا ہے صلح ہو جاتی ہے، تو یہ معاملہ انسان کی استعداد کے مطابق ہے۔ جبکہ الرَّحِيْمِ دائمی ہے، وقتی نہیں ہے۔ عربی میں اس وزن پر آنے والی صفات دائمی ہوتی ہیں مثلاً الحکیم جیسے کوئی حکیم و دانا ہے تو ہمیشہ کے لیے دانا ہے۔ یہ اس کی وقتی صفت نہیں۔

علمائے کرام فرماتے ہیں اللہ کریم الرَّحْمٰنُ لِلدُّنْيَا وَ الرَّحِيْمُ لِلْآخِرَةِ ہیں کہ رحمانیت دنیا کے لیے عام ہے جس کے طفیل کافر بھی زندگی پاتا ہے، رزق پا رہا ہے، اولاد پا رہا ہے، بے شمار نعمتیں پا رہا ہے، اور یہ نعمتیں مومن بھی حاصل کر رہا ہے۔ دنیا میں اللہ کی رحمانیت بہت وسیع ہے اور ہر ذرہ، ہر متنفس، ہر شئے اس سے مستفید ہو رہی ہے۔ سب کے سب دنیا کی ہر نعمت الرَّحْمٰن کی عطا سے پا رہے ہیں۔ رحیمیت دائمی رحمت ہے اور وہ صرف آخرت میں مومن کے حصے میں آئے گی۔ کافر کا اس سے تعلق نہ ہوگا۔

جب انسان اپنی استعداد ضائع کر بیٹھے اور اللہ کی نافرمانی کرے تو اللہ بے شک کریم ہے، رحمٰن ہے لیکن انسان پر اپنے کردار کے باعث عذاب آ جائے گا۔ کتنا بدبخت ہے وہ شخص جو الرَّحْمٰن سے عذاب حاصل کرے۔ کتنی بدنصیبی ہے کہ اللہ کی وسیع تر رحمت کے باوجود بندہ اس کے عذاب کی طرف رسے تڑوا تڑوا کر بھاگے!

ایک بہت عجیب بات ہے یہ اکثر کہا جاتا ہے کہ جنت میں جانا بہت مشکل ہے! کمال ہے، جنت تو اللہ کی رحمت ہے، راہ میں پڑی ہے، جو بھی اس کی رحمت کا سہارا لے لے، جنت کو پا لے گا۔ جنت جانے میں کیا مشکل ہے؟ اپنا حق کماؤ، اپنا حق لو دوسرے کا حق مت چھینو، سچ بولو، جھوٹ نہ کہو، مزدوری کرو، چوری نہ کرو، دیانتداری سے کام کرو، اس میں کیا مشکل ہے؟ اگر صاف ستھری پاکیزہ زندگی گزارو گے، صاف ستھرا عقیدہ و عمل رکھو گے، اللہ کو واحد و لاشریک مانو گے اس کی اطاعت کرو گے، اللہ کے انبیاؑ کی صداقت اور اس کی کتاب پر ایمان رکھو گے تو جنت تو مفت میں ملے گی۔ اللہ کی کتاب تو قدم قدم پر راہنمائی فرماتی ہے اس کو پڑھو، سمجھو اور عمل کر کے آرام سے مزے کی زندگی گزارو۔ اسلام تو زندگی گزارنے کا آسان ترین راستہ ہے۔ اسلام نہ اچھا کھانے سے روکتا ہے نہ اچھے لباس

سے، نہ شادی سے روکتا ہے نہ رشتہ داریاں نبھانے سے تو پھر مشکل کہاں سے ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مشکل برائی کرنا ہے۔ ہر گناہ کے ساتھ مصیبت جُڑی ہوئی ہے، قتل، بدکاری، چوری یہ جتنی بھی برائیاں ہیں سب کے ساتھ مصیبتیں جُڑی ہیں اور لوگ مشکل حالات میں سے گزر کر جہنم جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل محنت تو لوگ جہنم جانے کے لیے کرتے ہیں، جنت تو مفت میں ملتی ہے، جنت اللہ کی رحمت ہے، جو بھی اس کی رحمت کو تھام لے اُسے بخش دے گا۔ ساری عمر گناہ کرنے والا بھی ایک دن خلوصِ دل سے توبہ کر لے تو خواہ اسی دن اسے موت آ جائے اللہ اُسے بخش دے گا۔ ساری زندگی کسی کی کفر میں بسر ہو، جب بھی توبہ کر لے گا اللہ قبول فرما لے گا تو یہ آسان راستہ ہے۔ جو بھی جہنم جاتا ہے بڑی محنت اور بڑی مشکل زندگی گزار کر جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا: يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿٤٥﴾ والدِ گرامی! میں ڈرتا ہوں کہ آپ کے کردار کی وجہ سے آپ کو عذاب ملے گا جبکہ اللہ تو بہت مہربان ہے، اور آپ شیطان کے ساتھی بن جائیں گے کیونکہ جو بھی عذاب میں مبتلا ہوگا، جہنم میں ڈالا جائے گا وہاں شیطان ہی کا ساتھ ہوگا۔ اس بات پر بڑے میاں کو غصہ آ گیا، انہیں یہ بات پسند نہیں آئی۔

ایک منفی رویہ:

لوگوں میں ایک عجیب ضد ہوتی ہے کہ ہر انسان اپنی رائے کو درست جانتا ہے اور جو بات اس کی رائے سے مختلف ہو، اس بات کو غلط سمجھتا ہے۔ دنیا میں بیشتر فسادات اسی زعمِ باطل کی پیداوار ہیں حتیٰ کہ باپ بیٹوں میں، ساس بہوؤں میں، بھائی بہنوں میں اسی بات پر غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں کہ ایک دوسرے کی رائے کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ آج کل تو کہیں عالم کے نام پر، کہیں پیر کے نام پر کہ اُن کی جو رائے ہو، وہ مریدوں پر فرض ہو جاتی ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے، ہر بندے کو اللہ نے رائے رکھنے کا حق دیا ہے۔

مثبت رویہ:

آپ کسی کو دلیل سے سمجھا سکتے ہیں، صحیح رائے دے سکتے ہیں لیکن اگر وہ اپنی رائے پر مُصر ہے تو اُسے اپنی رائے رکھنے کا حق ہے۔ اگر ایک بات آپ جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ صحیح ہیں تو پھر بھی دوسرے کی رائے سُن لینی چاہیے شاید وہ صحیح کہہ رہا ہو اور آپ کو غلطی لگی ہو۔ یا آپ اُسے اپنی رائے کے حق میں دلائل دیں یا اس سے دلیل مانگیں کہ اس کی رائے کیسے صحیح ہے۔ اگر ایسا کیا جائے تو دنیا میں پرامن معاشرہ قائم ہو سکتا ہے اور جھگڑے فسادات ختم ہو سکتے ہیں۔

انبیا کا اندازِ تبلیغ بھی کتنا شفیق اور مثبت ہوتا ہے وہ کسی پر کوئی بات مسلط نہیں کرتے بلکہ بہت پیار سے تفصیل سے دلائل سے سمجھاتے ہیں اور نتائج سے آگاہ کر دیتے ہیں۔

اسلامی طریقۂ تبلیغ:

اسلام کا طریقۂ تبلیغ بھی مثبت ہے کہ حق بیان کیا جائے جس بات کو آپ حق سمجھتے ہیں اُسے بیان کریں، اس کے دلائل بیان کریں۔ ہمیشہ سچ بیان کیا جائے اور احسن انداز سے کیا جائے پھر اس کے بعد اگر کسی کو پسند نہیں آتا تو نہ آئے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو تبلیغ کرتا ہے اُسے لوگوں کو محبت سے، دلائل سے اللہ کی بخشش کی طرف بلانا ہے۔ اُسے منبرِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر بیٹھ کر لوگوں کو ایمان کی طرف بلانا ہے، اچھا مسلمان بننے کے لیے اعمال کی تلقین کرنی ہے اور اگر کوئی غیر مومن ہے تو اُسے ایمان کی فضیلت، اسلام کی حقانیت کے دلائل دینے ہیں۔ چونکہ یہ عالم کا، پیر صاحب کا، مولوی کا کام ہے کہ وہ لوگوں کو ایمان، سلامتی، اللہ کی رحمت اور بخشش کی طرف بلائیں تو انہیں حق بیان کرنا چاہیے محض لوگوں پر کفر کے فتوے لگا کر انہیں دور نہ بھگائیں۔ کفر پر دلائل دیں، کفر کی خرابی بیان کریں غیر اللہ کی عبادت کا نقصان بیان کریں، محض کافر کافر کہہ کر لوگوں کو دور نہ بھگائیں۔ جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دلائل سے والد کو سمجھایا کہ یہ بتوں کی پوجا جو آپ کر رہے ہیں یہ درحقیقت شیطان کی پوجا ہے اور شیطان اللہ کا نافرمان ہے اور جہنم میں جائے گا۔ جبکہ اللہ تو بہت رحمٰن ہے پھر آپ اس کی رحمت کو چھوڑ کر شیطان کے پیچھے لگ جائیں گے تو عذاب میں مبتلا ہو کر بہت نقصان اٹھائیں گے۔ تبلیغ و تعلیم کا یہ مثبت انداز اسلام سکھاتا ہے، پھر بھی اگر کوئی اپنی رائے رکھنا چاہے تو رکھ لے وہ اپنے نتیجے کو پالے گا۔

ہر گناہ مفضی الی الکفر ہوتا ہے:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خیر خواہی اور دلائل کے باوجود اُن کے والد ناراض ہو گئے اور کہا: قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿۴۶﴾

ابراہیم! تم ہمارے معبودوں سے برگشتہ ہو گئے، پھر گئے ہو، ہماری تو عمر بیت گئی ان بتوں کو پوجتے اور تم ان کی گستاخیاں کرتے ہو، ان کو بے کار کہتے ہو اور ان سے برگشتہ ہو رہے ہو۔ اگر تم اس انکار سے باز نہ آئے اور ہمارے معبودوں کو بے کار اور بے بس کہتے رہے تو پھر میں تمہیں سنگسار کر دوں گا یا تم اس گھر سے ہی نکل جاؤ اور ہم سے الگ ہو جاؤ۔ ہمیں تمہارے ساتھ کوئی رشتہ نہیں رکھنا، تم ہم سے ہمیشہ کے لیے دور ہو جاؤ۔ گویا انہوں نے محض ضد کی اور دلیل قبول نہیں کی اور ان کا اصرار تھا کہ جو ہم کر رہے ہیں یہی صحیح ہے اور تم بھی یہی کرو ورنہ قتل کیے جاؤ گے یا گھر

سے نکال دیے جاؤ گے۔ دراصل یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ ہر گناہ مفضی اِلیٰ الکفر ہوتا ہے یعنی کفر کی طرف کھینچ کر لے جانے والا ہوتا ہے۔ انسان جب اللہ کی اطاعت سے باہر قدم رکھتا ہے تو پھر آہستہ آہستہ وہ ایمان سے بھی محروم ہوجاتا ہے۔ اس محرومی کے بھی درجات ہیں کہ ایک حد تک توبہ نصیب ہوجاتی ہے لیکن پھر ایک حد آتی ہے کہ اس کے آگے نکلنے پر توبہ کی توفیق سلب ہوجاتی ہے اور انسان تائب بھی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے گناہ سے اس لیے ڈرنا چاہیے کہ یہ اللہ سے بہت دور لے جاتا ہے اور یہ دوری عقائد پر اثر انداز ہوتی ہے اور عقیدہ خراب ہوجاتا ہے۔ گناہ کے اثر سے اللہ کی عطا کردہ نعمتیں بھی دکھائی نہیں دیتیں کیونکہ انسان اللہ سے دور ہوجاتا ہے اور کفر میں چلا جاتا ہے۔ اکثر ایسے لوگوں کو کہتے سنا گیا ہے کہ ہمارے لیے اللہ کیا کر رہا ہے، ہمارے پاس تو دولت نہیں ہے، ہمیں تو صحت بھی خراب ہی ملی، پریشانیاں ملی ہیں ہمارے لیے تو اللہ نے کچھ کیا ہی نہیں۔ یہ سب گناہ کا اثر ہے اور بدنصیبی ہے کہ گناہ انسان کو ایسا اندھا کر دیتا ہے کہ منہ سے ایسے جملے نکلتے ہیں کہ اللہ نے میرا کوئی کام ہی نہیں کیا، اور جو نعمتیں ملی ہوتی ہیں انہیں بھول جاتے ہیں۔ یہ گناہوں کی سزا ہے جو کفر کے اندھیرے کی طرف لے جاتی ہے پھر آدمی کو انعاماتِ الٰہی سمجھ ہی نہیں آتے اور وہ ادھر سے پیٹھ پھیر لیتا ہے۔ تو یہی حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا بھی تھا، وہ بہت ناراض ہوئے اور سنگسار کرنے کی دھمکی دی یا گھر سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔

اللہ کی نعمتوں کا شکر ممکن نہیں:

گناہوں کے اثر سے انسان اللہ کی نعمتوں کو بھول کر صرف محرومیاں شمار کرتا ہے اور ہر وقت اللہ سے نالاں و ناراض دکھائی دیتا ہے۔ اُسے احساس ہی نہیں کہ اللہ نے اُسے عدم سے وجود عطا کیا اور اس وجود میں بے شمار خصوصیات رکھیں۔ ایک وجود میں دس کھرب Cell رکھے اور ہر سیل Cell کی عمر چھ ماہ سے زیادہ نہیں۔ چھ مہینے میں نئے (Cell) پیدا ہوجاتے ہیں اور پرانے مرجاتے ہیں۔ اب اس وجود کے اندر ان (Cell) خلیوں کو کون حیات دے رہا ہے، کون موت دے رہا ہے، کون تخلیق فرما رہا ہے؟ ہمیں تو پتا بھی نہیں چلتا۔ اسی لیے اللہ نے فرمایا کہ میں تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ تم سے قریب ہوں، کہ شہ رگ بھی تو ایک رگ ہے اور اُن (Cell) سیلوں سے ہی بنی ہے اور شہ رگ میں جو خون گردش کر رہا ہے، اس میں بھی سیل (Cell) ہیں۔ اللہ کی ذات ان تمام سیلوں کو تخلیق فرما رہی ہے، موت دے رہی ہے تو کس قدر قریب ہے۔ وجودِ انسانی میں بے شمار کمالات و خصوصیات ہیں اور ان نعمتوں کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے۔ آنکھ کی نعمت ہی اتنی عظیم ہے کہ انسان اس کا شکر ادا نہیں کرسکتا۔

حدیث شریف میں بنی اسرائیل کے ایک شخص کا قصہ ارشاد ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا، جب وہ بالغ ہوا، اس نے ہوش سنبھالا تو دنیا ترک کر کے ایک چھوٹے سے جزیرے پر چلا گیا وہاں عبادت میں مشغول رہتا۔ تنہا تھا لہٰذا کسی سے نہ بات ہوتی نہ ملاقات، ہر وقت عبادت میں مشغول رہتا۔ اللہ کریم نے اس جزیرے پر میٹھا چشمہ جاری کر دیا اور پھل اُگا دیے تو وہ پھل کھاتا، پانی پیتا اور اُسی پانی سے وضو کرتا اور ہر وقت عبادت میں مصروف رہتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جبرئیل امین نے یہ حکایت بیان فرمائی کہ وہ شخص چار سو سال زندہ رہا اور یہ زندگی اس نے عبادت میں بسر کر دی اور جب موت کا وقت آیا تو اللہ کریم نے ملک الموت کو حکم دیا کہ میرے اس بندے سے پوچھنا کہ وہ کس طرح جان دینا چاہتا ہے، اس سے پوچھ کر روح قبض کرنا۔ ملک الموت نے اس سے پوچھا کہ تم کس حال میں جان دینا چاہتے ہو؟ اس نے کہا کہ میں نوافل کی نیت کرتا ہوں اور جب میں سجدے میں جاؤں تو تم میری روح قبض کر لینا تا کہ قیامت کے روز میں سُبْحٰنَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی پڑھتا ہوا سجدے سے اٹھوں۔ حضرت جبرئیل نے عرض کی، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! اسی طرح اس کی روح قبض ہوئی اور اب بھی جب آسمان سے آتے اور واپس جاتے میری نظر اس کے وجود پر کبھی پڑتی ہے تو وہ سلامت سر بسجود پڑا ہے۔ مرورِ زمانہ نے، موسموں نے بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑا۔ اور وہ اب بھی سجدے میں پڑا ہے۔ لیکن ایک عجیب بات جو میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب قیامت قائم ہوگی، حساب کتاب ہوگا اور یہ بندہ پیش ہوگا تو ارشادِ باری ہوگا: اِذْهَبُوْا بِعَبْدِیْ اِلَی الْجَنَّةِ بِرَحْمَتِیْ۔ کہ میری رحمت سے اس بندے کو جنت لے جاؤ۔ اس کا حساب کتاب نہیں ہوگا بلکہ میری رحمت سے، میری بخشش سے اسے جنت لے جاؤ، تو اس وقت وہ بندہ عرض کرے گا کہ اللہ! بے شک تیری رحمت بہت وسیع ہے لیکن میں نے بھی چار سو سال سجدے سے سر نہیں اٹھایا۔ میں نے دنیا میں کسی سے تعلق نہیں رکھا، نہ ماں باپ سے نہ بہن بھائی سے نہ ہی شادی کی نہ گھر بار بنایا، صرف تیرے سجدے کیے تو کچھ تو میری مزدوری بھی بنتی ہوگی یا مجھے رحمت سے ہی بھیجنا ہوگا؟ اس پر اللہ کریم فرمائیں گے کہ بے شک تمہاری بھی بہت محنت ہے اور بجا ہے کہ تم ایسا کہو لہٰذا حکم دیں گے کہ اس کی چار سو سالہ عبادت کو ایک پلڑے میں رکھا جائے اور دوسرے پلڑے میں صرف آنکھ کی ایک نعمت جو اس نے چار سو سال استعمال کی، رکھی جائے۔ چار سو سال مسلسل یہ نعمت بھی تو استعمال کرتا رہا۔ جب وزن ہوگا تو اُس کی عبادت کم پڑ جائے گی۔ ارشاد ہوگا: اِذْهَبُوْا بِعَبْدِیْ اِلٰی جَهَنَّمَ بِعَدْلِیْ۔

اگر یہ عدل چاہتا ہے تو اسے جہنم میں پھینک دو جب تک سزا پوری نہ ہو جائے کہ اتنی نعمتیں استعمال کی ہیں،

اُن سب کی شکر گزاری کا حق ادا نہ کرنے کی سزا پوری کرنی پڑے گی۔

پھر وہ شخص عرض کرے گا، بارِ الہا مجھ سے بھول ہوگئی، میں نے غلطی کی، میں تیری نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا مجھ پر رحم فرمائیے۔ حکم ہوگا کہ اگر رحمت چاہتا ہے تو جنت بھیج دو اور اگر عدل چاہتا ہے تو جہنم چلا جائے۔

سلام کے مسائل:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تبلیغ کا انداز دیکھیے، کہ والد نے ناراضگی کا اظہار کیا، سنگسار کرنے کی دھمکی دی، گھر سے نکل جانے کا کہا تو آپؑ نے فرمایا: قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ۔۔۔ اللہ کی سلامتی ہو آپ پر، یعنی میں پھر آپ کے لیے سلامتی کی دعا ہی کر سکتا ہوں کہ اللہ آپ کو سلامتی دے، اور سلامتی دین ہی تھا۔ اللہ آپ کو سلامتی کا دین اختیار کرنے کی توفیق دے، اللہ آپ کو دین عطا کر دے، تو یہی سلامتی کی بات ہے۔

پہلی بات یہ ہے کہ یہ شریعتِ ابراہیمی کی بات ہے شاید اس میں کافر کو سلام کہنے کی اجازت ہو لیکن اسلام میں کافر کو سلام جائز نہیں ہے، سلامتی جائز نہیں ہے۔ البتہ کسی مجلس میں مسلمان بیٹھے ہوں اور کچھ کافر بھی ہوں تو اس مجلس کو السلام علیکم کہنا جائز ہے، لیکن صرف کافر کو السلام علیکم کہنا جائز نہیں ہے، سلامتی جائز نہیں ہے۔ کافر کے لیے ہدایت کی دعا جائز ہے کہ جب تک زندہ ہے اللہ اُسے ہدایت دے لیکن جب تک وہ کافر ہے اُسے نجات یا سلامتی کی دعا جائز نہیں اور کفر پر ہی مر جائے تو بخشش کی دعا بھی جائز نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ تو میرے قتل کے درپے ہیں، میں آپ کے لیے اللہ سے بخشش چاہوں گا: سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ کہ آپ کی اپنی رائے ہے اور میرا اپنا منصب ہے۔ آپ تو خفا ہو گئے ہیں لیکن میں آپ کے لیے اپنے پروردگار سے مغفرت چاہوں گا اس لیے کہ میرا پروردگار مجھ پر بے حد مہربان ہے۔ میرے اللہ کی مجھ پر بے پناہ رحمت ہے، اس نے مجھے نبوت سے نوازا ہے، صدیقیت سے نوازا ہے اور میرے ہر حال پر اس کی بہت رحمت ہے، تو میں اللہ سے آپ کی سفارش کروں گا۔

حق اور باطل میں سمجھوتہ نہیں ہو سکتا:

فرمایا: وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ۔۔۔ میں آپ کو بھی چھوڑ دوں گا اور جتنے بتوں کو آپ اللہ کے سوا پکارتے ہیں رد کر دوں گا یہ بات بالکل پکی ہے کہ میرا آپ سے سمجھوتہ نہیں ہو سکتا اور دین کے معاملے میں باپ بھی سامنے آگیا تو میں اللہ کی توحید پر قائم رہوں گا۔ دنیوی رشتہ داریوں کے پیچھے ہرگز بے دینی اختیار نہیں کروں گا۔ میں اپنے پروردگار ہی کو پکارتا رہوں گا۔ دین میں سمجھوتے نہیں ہوتے، عقائد اور ایمان میں

سمجھوتہ نام کی کوئی چیز نہیں، اس لیے کہ حق اور باطل دو الگ چیزیں ہیں۔ حق ہے یا باطل ہے، سچ ہے یا جھوٹ ہے، درمیان میں کچھ نہیں ہے۔ مومن ہے یا کافر ہے۔ یہ قرآن کے جو پیمانے ہیں یہ ہمارے لیے کسوٹی ہیں کہ ہم ان پر اپنے آپ کو جانچیں کہ میں مومن ہوں یا میرا ایمان کچھ متزلزل ہو چکا ہے، کچھ کفر کی طرف اور کچھ ایمان کی طرف ہوں۔ ہم ہمیشہ دوسروں کے ایمان کو جانچتے رہتے ہیں حالانکہ ہم کسی کے دل کا حال نہیں جانتے، وہ جانے اور اس کا ربّ جانے، ہمیں اپنا ایمان جانچنا چاہیے۔

دعا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد پر واضح کر دیا کہ وہ سوائے اللہ کی ذات کے کسی اور کو نہ پکاریں گے اور اللہ ہی اُن کے پروردگار ہیں جو اُن کی ہر ضرورت پوری کرتے ہیں۔ فرمایا: عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ﴿٤٨﴾ میں اپنے پروردگار سے آپ کے لیے استغفار بھی کروں گا، بخشش چاہوں گا، اور میرا پروردگار مجھ پر ضرور کرم فرمائے گا، میری بات ضرور سنے گا کہ وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔

دعا ایک درخواست ہے، ایک وسیلہ ہے جو اختیار کیا جاتا ہے لیکن اعتماد اللہ ہی پر ہونا چاہیے کہ اللہ کریم ضرور ایسا کرنے پر قادر ہیں۔ آج ہمارا حال یہ ہو چکا ہے کہ ہمارا اللہ سے تعلق بہت کمزور ہو چکا ہے، ہمارے دلوں میں یہ بات نہیں اتری کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے محض سنی سنائی سی بات ہے۔ ہمیں اللہ سے زیادہ اسباب پر بھروسہ ہے۔ اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا۔

دعا لب سے نہ نکلی، پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

کہ انہیں اللہ پر بھروسہ نہیں ہے محض دنیوی وسائل پر مرتے ہیں یہ بات بہت عجیب مگر حقیقت ہے اور بندے کا ذاتی تجربہ ہے کہ کچھ لوگ کسی کام کی غرض سے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فلاں شخص آپ کا واقف ہے اس کے نام کوئی چٹھی دے دیں یا فون کر دیں۔ اگر ان سے کہا جائے کہ میں اللہ کریم سے دعا کروں گا کہ تمہارا کام ہو جائے تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں کہ آپ نے تو ٹرخا دیا، سفارش نہیں کی۔ البتہ جھوٹ موٹ محض فرضی کوئی چٹھی لکھ دوں یا فون کر دوں تو اُن کا کام اگر نہ بھی ہو تو بہت خوش ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے تو چٹھی دی تھی اب میری قسمت کہ کام نہیں ہوا۔ تب قسمت آ جاتی ہے کہ اللہ کی مرضی نہیں تھی نہیں ہوا لیکن اگر انہیں سیدھا یہ کہا جائے کہ اللہ کریم سے دعا کریں گے تو کہتے ہیں ٹرخا دیا۔ اصل بات یہی ہے کہ دنیوی اسباب، عرضیاں، درخواستیں ضرور اختیار کرنے چاہیے کہ وسیلہ اختیار کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہے لیکن اعتماد اللہ کی ذات پر ہونا چاہیے کہ کرے

گا وہی۔ اللہ سے دعا پورے یقین سے مانگی جائے کہ وہ قادرِ مطلق ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کی رحمت پر کامل بھروسہ رکھتے ہوئے دعا فرمائی، اپنے باپ کی ہدایت اور مغفرت کے لیے دعا کی لیکن اصل بات یہ ہے کہ اُن کے والد میں اجابت نہیں تھی، حق کو قبول کرنے کی استعداد نہیں تھی ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا تو رد نہیں ہو سکتی تھی اور اُن پر اللہ کا بے حد کرم تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کو اللہ نے دنیوی نعمتیں دے رکھی تھیں، زندگی، صحت، مال و دولت اور عہدہ سب کچھ تھا بلکہ شاہی دربار میں سب سے بڑے پجاری کے عہدے پر فائز ہونے کے سبب سے بادشاہ بھی اس کا احترام کرتا تھا۔ چونکہ اللہ کی ربوبیت کا تقاضا ہے لہٰذا دنیوی نعمتیں بے حد دے رکھی تھیں لیکن اپنی ذات سے تعلق وہ یوں ہی نہیں دیتا، بن مانگے عطا نہیں فرماتا۔ جب تک اللہ کی عظمت کا اقرار نہ کیا جائے، مانا نہ جائے اور اس کی اطاعت نہ کی جائے، یہ تعلق نصیب نہیں ہوتا۔ اس اقرار اور اطاعت کے اعتبار سے آپؑ کے والد تہی دست تھے۔

اللہ کریم اپنے بندوں کو اکیلا نہیں چھوڑتے:

فرمایا: فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔۔۔ جب آپؑ اپنے والد سے، گھر سے، اُن بتوں سے جن کی پوجا کی جاتی تھی الگ ہو گئے تو اللہ کریم نے آپؑ کو تنہا نہ ہونے دیا بلکہ ایسے رشتہ دار عطا کیے جو کائنات میں بے مثل لوگ تھے۔ فرمایا: وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۗ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۝۴۹ اللہ کریم فرماتے ہیں، ہم نے انہیں اسحاق علیہ السلام جیسے بیٹے عطا فرما دیے، یعقوب علیہ السلام جیسے پوتے عطا کیے جو سارے نبیؑ تھے۔ پھر آگے یوسف علیہ السلام بھی نبیؑ تھے تو چار نسلوں میں مسلسل نبوت چلتی گئی۔ ہم نے انہیں کیسے پیارے، اللہ کے مقرب رشتہ دار عطا کر دیے کہ جب دین کے لیے انہوں نے رشتہ داری کو چھوڑا تو ہم نے ان کو ایسے رشتہ دار عطا کیے جو دنیا کے لیے، دین کے راہنما تھے، انہیں محروم نہیں رکھا۔ جب انہیں گھر سے نکالا گیا، تو ان کے پاس کوئی ٹھکانہ نہیں تھا، کہیں کوئی جائے پناہ نہیں تھی، کوئی دوست نہیں تھا نہ ہی کوئی کاروبار تھا لیکن اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ہم نے انہیں سنبھالا، گھر بھی دیا، اہلیہ بھی دی بیٹے دیے، پوتے دیے اور اُن کی نسل کو نبوت سے سرفراز کیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ عالی میں ملتا ہے: كَرِيْمُ اِبْنُ الْكَرِيْمِ. اِبْنُ الْكَرِيْمِ یوسف علیہ السلام ابنِ یعقوب علیہ السلام ابنِ اسحاق علیہ السلام ابنِ ابراہیم علیہ السلام، چار نسلیں مسلسل نبوت عطا ہوئی۔ اب اس سے بڑی کیا عظمت ہوگی! گویا دنیا کے حصول کے لیے اللہ کی نافرمانی پر سمجھوتہ نہیں کرنا چاہیے، اگر وقتی طور پر دنیا میں نقصان بھی اٹھانا پڑے تو اٹھا لیا جائے، اللہ قادر ہے بہترین نعم البدل عطا فرماتا ہے۔

رحمت پانے والے لوگوں کا کردار:

حضرت ابراہیم علیہ السلام پر عطا اور کرم کی بارش ہے فرمایا: وَوَهَبۡنَا لَهُمۡ مِّنۡ رَّحۡمَتِنَا وَجَعَلۡنَا لَهُمۡ لِسَانَ صِدۡقٍ عَلِيًّا ۝٥٠ ہم نے اُن کو اپنی رحمت کا حصہ وافر عطا فرمایا، اُن کو اتنا مستغنی کر دیا کہ وہ دنیا میں میری رحمت بانٹتے پھرتے تھے۔ اُن کی زبان میں سچ اس طرح سمو دیا کہ وہ سچ کو بلند کرنے والے تھے، وہ سچ کو ان بلندیوں پر لے گئے کہ اللہ کی کتنی مخلوق اس سے فیض یاب ہوئی، واصل باللہ ہوئی، جہنم سے بچالی گئی اور جنت کے باغوں میں پہنچی۔ اللہ نے اپنی رحمت بانٹنے کا سبب بنایا، اپنی رحمت سے حصہ وافر عطا کیا۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ قرآن کریم کا موضوع تاریخ نہیں ہے، بلکہ یہ قصے صرف اس لیے ارشاد کیے جاتے ہیں کہ ہمیں آئینہ دکھایا جائے تا کہ ہم اپنی زندگی، اپنے کردار اور عقیدے کو جانچ سکیں اس آئینے میں اپنی تصویر دیکھ سکیں کہ ہم کہاں کھڑے ہیں۔ جس نے بھی یہ قصے سن کر، سمجھ کر اپنے کردار کو جانچا، اور جہاں قصور یا غلطی دیکھی اس کی اصلاح کر لی تو وہ مقصد کو پا گیا۔ وعظ سننے کا مقصد یہ ہے کہ سامنے ایک آئینہ آ جائے اور اس میں انسان اپنے خدوخال دیکھے اور قرآن کے ارشادات دیکھے کہ میں ان پر پورا اترتا ہوں یا نہیں۔ اگر کوئی کمی ہے تو توبہ کرے رجوع الی اللہ کرے، اللہ سے بخشش چاہے، تو یہ سننا مفید ہے۔ لیکن اگر وعظ یا بیان سن کر صرف واہ واہ کر دی کہ جی مولوی صاحب نے بڑی عمدہ تقریر کی، لیکن کہتے کیا ہیں؟ معلوم نہیں۔ ایسے ہی جلسے ہوتے ہیں، لوگ بڑے نعرے لگاتے ہیں، بڑے خوش ہوتے ہیں کہ بہت اچھی تقریر تھی جب اُن سے پوچھا جائے کہ کیا کہا گیا تھا تو کسی کو پتا ہی نہیں ہوتا۔ ایسا سننا کہ مفہوم ہی سمجھ نہ آئے سننے کا حاصل نہیں ہے۔

سورۃ مریم رکوع 4 آیات 51 تا 65

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰىٓ ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾ وَنَادَيْنٰهُ
مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿۵۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ
هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿۵۳﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ
رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۴﴾ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ
مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّرَفَعْنٰهُ
مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ
اٰدَمَ ۙ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۡ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۡ وَمِمَّنْ
هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ۭ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ﴿۵۸﴾ ۩
فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ
يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ
وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ﴿۶۰﴾ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ
اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ﴿۶۱﴾ لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۭ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ
فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾ تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ
تَقِيًّا ﴿۶۳﴾ وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا
بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿۶۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا

فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ؕ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿٦٥﴾

اور اس کتاب میں موسیٰ (علیہ السلام) کا ذکر کیجیے بلاشبہ وہ (اللہ کے) خاص کیے ہوئے (بندے) تھے اور وہ پیغمبر (اور) نبیؐ تھے ﴿۵۱﴾ اور ہم نے ان کو طور کی داہنی جانب سے آواز دی اور باتیں کرنے کے لیے انہیں نزدیک بلایا ﴿۵۲﴾ اور اپنی مہربانی سے ان کو ان کا بھائی ہارون نبیؐ بنا کر عطا فرمایا ﴿۵۳﴾ اور اس کتاب میں اسمٰعیل (علیہ السلام) کا ذکر کیجیے بے شک وہ وعدے کے سچے اور ہمارے بھیجے ہوئے (پیغمبر، اور) نبی تھے ﴿۵۴﴾ اور اپنے متعلقین کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم فرماتے تھے اور اپنے پروردگار کے ہاں پسندیدہ تھے ﴿۵۵﴾ اور اس کتاب میں ادریس (علیہ السلام) کا ذکر کیجیے بے شک وہ صدیق (اور) نبیؐ تھے ﴿۵۶﴾ اور ہم نے ان کو اونچی جگہ اٹھا لیا تھا ﴿۵۷﴾ یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے من جملہ دیگر انبیاؑ کے انعام فرمایا۔ آدم (علیہ السلام) کی نسل سے اور ان لوگوں (کی نسل) سے جن کو ہم نے نوح (علیہ السلام) کے ساتھ سوار کیا تھا اور ابراہیم (علیہ السلام) اور یعقوب (علیہ السلام) کی نسل سے اور ان لوگوں میں سے جن کو ہم نے ہدایت فرمائی اور مقبول بنایا، جب ان کے سامنے رحمٰن کی آیات پڑھی جاتیں تو سجدہ کرتے ہوئے اور روتے ہوئے (زمین پر) گر جاتے تھے ﴿۵۸﴾ پھر ان کے بعد (بعض) ایسے ناخلف جانشین ہوئے جنہوں نے نماز کو برباد کیا اور خواہشات (نفسانی) کی پیروی کی، پس یہ لوگ عنقریب خرابی دیکھیں گے ﴿۵۹﴾ ہاں جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے، سو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے اور ان کا ذرا بھی نقصان نہ کیا جائے گا ﴿۶۰﴾ وہ ہمیشہ رہنے کے باغ ہیں جن کا رحمٰن نے اپنے بندوں سے غائبانہ وعدہ فرمایا ہے۔ بے شک اس کی وعدہ فرمائی ہوئی چیز کو یہ لوگ ضرور پہنچیں گے ﴿۶۱﴾ اس میں سلام کے سوا کوئی بیہودہ کلام نہ سنیں گے اور وہاں ان کو صبح اور شام ان کا کھانا ملا کرے گا ﴿۶۲﴾ یہ جنت ہے جس کا ہم اپنے بندوں

میں سے ایسے لوگوں کو مالک بنائیں گے جو پرہیزگار ہوں گے ﴿۶۳﴾ اور (فرشتوں نے عرض کیا) ہم آپ کے پروردگار کے حکم کے بغیر نہیں اتر سکتے۔ جو کچھ ہمارے آگے اور جو کچھ پیچھے اور اس کے درمیان ہے (یعنی سب کچھ) اُسی کا ہے اور آپ کا پروردگار بھولنے والا نہیں ﴿۶۴﴾ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کا پروردگار ہے تو (اے مخاطب!) اسی کی عبادت کرو اور اس کی عبادت پر قائم رہو بھلا تم اس کا کوئی اور ہم نام (ہم صفت) جانتے ہو ﴿۶۵﴾

تفسیر و معارف

رسولؑ اور نبیؑ میں فرق:

فرمایا: وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۡ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾ اور اس کتاب میں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کیجیے بلاشبہ وہ (اللہ) کے خاص کیے ہوئے (بندے) تھے اور وہ پیغمبر (اور) نبیؑ تھے۔

یہود جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اُمتی ہونے کے دعوے دار تھے، انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بہت سی عجیب وغریب کہانیاں تراش رکھی تھیں اور بے شمار قصے خلط ملط کر کے بنا رکھے تھے۔ اسی لیے ارشاد ہو رہا ہے کہ انہیں ذرا موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حقائق بیان فرما دیجیے کہ یہ خود کو جس نبیؑ کا اُمتی اور پیروکار کہتے ہیں اُنؑ کی حقیقتِ حال سے ناآشنا ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام تو اللہ کے خاص کیے ہوئے، چنے ہوئے بندے تھے مُخْلَصًا۔۔۔ سراپا خلوص تھے، اللہ کے خالص بندے تھے جنہیں اللہ نے بنایا ہی ایسا تھا۔ آپ علیہ السلام اللہ کریم کے منتخب بندے تھے اور یہ یہود جو اُن کے اُمتی ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں ان میں تو خلوص ہے ہی نہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ کے نبیؑ اور رسولؑ تھے۔ ہر رسولؑ اللہ کا نبیؑ ہوتا ہے لیکن ہر نبیؑ، رسولؑ نہیں ہو سکتا۔ رسولؑ اور نبیؑ میں فرق یہ ہے کہ جو نبیؑ نئی شریعت کے ساتھ مبعوث ہوتا ہے وہ رسولؑ کہلاتا ہے، اور جو کسی شریعت کو، جو پہلے سے جاری ہوتی ہے، اسی کو جاری رکھتا ہے وہ نبیؑ کہلاتا ہے۔ انبیاؑ و رسلؑ سارے ہی اللہ کے مقرب، معصوم عن الخطا اور مخلوق کو دعوت الی اللہ دینے والے، ہدایت کا مینار ہوتے ہیں۔

اخلاص کی اہمیت:

دین کی روح بھی اخلاص ہے۔ حصولِ اخلاص کے لیے صفائے باطن دین کا اہم شعبہ ہے لیکن اس میں بھی خلوصِ نیت شرط ہے۔

علمائے کرام فرماتے ہیں کہ ذکر اذکار اور تصوف کے لیے خلوص بنیادی شرط ہے، اور خلوص کی بنیاد ہی اس بات پر ہوتی ہے کہ جو کام کیا جائے وہ محض اللہ کی رضا کے لیے کیا جائے اور اس میں کوئی ذاتی مفاد یا غرض نہ ہو۔ بالخصوص اہلِ تصوف اس بات پر خصوصی توجہ دیں کہ جب اللہ کریم کی طرف سے انعامات مشاہدات یا کمالات و مقامات عطا ہوتے ہیں تو عوام میں اہلِ تصوف کی عزت بننا شروع ہو جاتی ہے۔ یہ معاملہ قابلِ توجہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بندہ اس خواہش میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ لوگ مجھے بہت پارسا سمجھیں بہت نیک گمان کریں اور خلوص سے عاری ہو جاتا ہے۔ دوسری برائی یہ پیدا ہو جاتی ہے کہ پھر عقیدت مندوں سے دنیوی مفاد حاصل کرنے لگتا ہے۔ جب یہ کام شروع ہوتے ہیں تو چونکہ یہ تصوف کے منافی ہیں تو کمالات و انعامات رخصت ہو جاتے ہیں اور پیچھے صرف دنیاداری رہ جاتی ہے۔ لہٰذا اہلِ تصوف کو اس کا بہت خیال رکھنا چاہیے کہ اُن کا مجاہدہ خلوص پر مبنی ہو، اس میں للّٰہیت ہو، اللہ کی عظمت کے لیے ہو نہ کہ اپنی بڑائی کے لیے اور اُن کا تعلق لوگوں سے بھی محض اللہ کے لیے ہو۔ اللہ کی مخلوق سے تعلق صرف اللہ کی رضا کے لیے ہو، کسی ذاتی لالچ کے لیے نہ ہو، یہ نہ کیا جائے کہ فلاں شخص نے بہت دیا لہٰذا وہ عزیز ہو گیا اور فلاں تو غریب ہے اس سے بھلا مجھے کیا ملے گا؟ یہ دیکھا گیا ہے تصوف میں محنت مجاہدے کرنے والوں کو جب اپنی پارسائی منوانے کا شوق ہوا تو پھر اس سے آگے بڑھ گئے اور لوگوں سے مفادات حاصل کرنے لگے اور پھر اس میں ہی الجھ گئے اور لوگوں کی درجہ بندی کرنے لگ گئے۔ جو زیادہ دے اُسے اچھا اور جو کم دے اُسے کمتر سمجھنے لگے لہٰذا اُن سے اصل بات رخصت ہو گئی کیونکہ لوگوں سے اُمیدیں وابستہ کرنا بھی شرک کا ایک شعبہ ہے۔ جب لوگوں سے اُمیدیں وابستہ ہوتی ہیں تو ان میں شرک کا شائبہ شروع ہو جاتا ہے اس لیے کہ انسان کی ساری امیدیں صرف ذاتِ باری سے وابستہ ہونی چاہیے۔

نبوت، ایک عظیم نعمت:

اللہ کریم فرماتے ہیں، موسیٰ علیہ السلام کا ذکرِ خیر بھی، اپنی کتاب قرآنِ کریم میں فرما دیجیے کہ وہ اللہ کے خاص کیے ہوئے بندے تھے سراپا خلوص تھے اور تم جو خود کو اُن کا اُمتی کہتے ہو تم تو سراپا فریب ہو۔ وہ تو اللہ کے نبیؑ اور رسولؑ تھے جن پر اللہ نے خاص کرم فرمایا کہ: وَنَادَيْنَٰهُ مِن جَانِبِ ٱلطُّورِ ٱلْأَيْمَنِ وَقَرَّبْنَٰهُ نَجِيًّا ﴿٥٢﴾ انہیں ہم نے طور کی داہنی جانب سے پکار کر ان سے خاص باتیں کرنے کے لیے نزدیک تر بلایا اور انہیں اپنا بہت قرب عطا کیا۔ یہاں وہ واقعہ ارشاد ہو رہا ہے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اثنائے سفرِ طور پر آگ دیکھی اور قریب گئے تو ارشاد

ہوا: اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ۔۔۔(طٰہٰ:14) میں اللہ ہوں۔

موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے اپنا خاص قرب عطا فرمایا اور راز کی باتیں کرنے کے لیے انہیں تنہائی میں بلایا۔ اس پر مفسرینِ کرام فرماتے ہیں کہ یہ دلیل ہے کہ ذکر اذکار اللہ اللہ کرنے کے لیے علیحدگی میں، تنہائی اور پرسکون ماحول میں بیٹھنا چاہیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام تو اللہ کے ایسے مقرب بندے تھے کہ فرمایا: وَوَهَبۡنَا لَهٗ مِنۡ رَّحۡمَتِنَاۤ اَخَاهُ هٰرُوۡنَ نَبِيًّا ۞ ہم نے اُن پر اپنی رحمت فرمائی اور جب انہوں نے اپنے بھائی ہارون (علیہ السلام) کی سفارش کی تو ہم نے قبول فرمالی اور ہارون (علیہ السلام) کو نبوت عطا فرما کر انہیں موسیٰ (علیہ السلام) کا معاون بنا دیا۔

کائنات کا ہر ذرّہ اللہ کریم کی بے پناہ نعمتوں سے مستفید ہو رہا ہے لیکن اللہ کریم کی سب سے بڑی نعمت نبوت ہے۔ انبیاءِ اللہ کریم کے برگزیدہ، پسندیدہ اور مخلص بندے ہوتے ہیں۔ فرمایا، اس کتاب میں ہمارے برگزیدہ بندے اسمٰعیل علیہ السلام کا بھی ذکر خیر فرما دیجیے: وَاذۡكُرۡ فِى الۡكِتٰبِ اِسۡمٰعِيۡلَ ۚ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الۡوَعۡدِ وَكَانَ رَسُوۡلًا نَّبِيًّا ۞ کہ وہ تو وعدے کے سچے تھے اور اُن کی عظمت یہ ہے کہ وہ میرے نبیؑ بھی تھے اور رسولؑ بھی تھے۔ میں نے انہیں نئی شریعت بھی دی اور وہ میرے مقرب بھی تھے۔

مشرکینِ مکہ نے سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام کی پیروی کا دعویٰ بھی کر رکھا تھا اور اُن کے نام پر بہت سی رسومات جاری کر رکھی تھیں اور بہت سے عجیب وغریب افعال کرتے تھے۔ ستم یہ تھا کہ وہ کہتے تھے یہ سب ہم انؑ کی اتباع میں کرتے ہیں تو فرمایا، اسمٰعیل علیہ السلام کا ذکر بھی قرآن میں فرمائیے کہ وہ تو وعدے کے سچے تھے جو وعدہ انہوں نے ازل کو کیا، جو تمام لوگوں نے کیا تھا اللہ سے اللہ کی ربوبیت کے اقرار کا، انہوں نے نبھایا لیکن تم مشرکین اس وعدے سے پھر گئے ہو۔ تم نے وعدہ تو کیا کہ اللہ تو ہی ہمارا پروردگار ہے لیکن آج تم نے کتنے حاجت روا مان رکھے ہیں، کہیں پتھر کے بت بنا لیے، کہیں لکڑی کے بت اور کبھی کسی پہاڑ کو، کبھی جنات، آگ، سورج اور ستاروں کو خدا بنا رکھا ہے۔ اس کردار کے ساتھ تمہارا یہ دعویٰ کہ تم اُن کے اُمّتی ہو ہرگز درست نہیں کہ وہ وعدے کے سچے جبکہ تم وعدہ خلافی کرنے والے لوگ ہو۔

عہدِ الست، رب کی ربوبیت کا اقرار:

اللہ کریم نے ازل میں انسانوں سے وعدہ لیا: اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ۔۔۔ کیا میں تمہارا پروردگار نہیں ہوں؟ سب نے اقرار کیا: قَالُوۡا بَلٰى (الاعراف:172) اللہ کریم بے شک آپ ہی ہمارے ربّ ہیں، ہمارے پالنہار

ہیں۔ یہاں ایک قابلِ غور اور عجیب بات ہے کہ اللہ کریم نے یہ نہیں پوچھا کہ کیا میں تمہارا معبود نہیں ہوں بلکہ یہ پوچھا کہ کیا میں تمہارا ربّ نہیں ہوں، یعنی تمہاری ساری ضروریات پوری کرنے والا وحدہٗ لاشریک نہیں ہوں؟ سچ تو یہ ہے کہ انسان عبادت تو اللہ کی کرتا رہتا ہے لیکن ضروریاتِ دنیا کے معاملے میں بھٹک جاتا ہے، کبھی کسی دروازے پر امیدیں وابستہ کر لیتا ہے کبھی کسی در پر۔ عہد الست جو ازل کو لیا گیا یہی تھا کہ تم دنیا میں جاؤ گے اور تمہاری بے شمار ضروریاتِ دنیا ہوں گی تو تم کس کو پکارو گے، کس کے در سے امیدیں وابستہ کرو گے، کس سے مانگو گے؟ یہی وہ مقام ہے جہاں اکثریت بھٹک جاتی ہے اور اپنی امیدیں مخلوق سے وابستہ کر لیتی ہے۔ کبھی حکمرانوں سے امیدیں لگا لیتے ہیں، کبھی امرا سے اور حد تو یہ ہے کہ کبھی غائبانہ قوتوں سے مدد مانگتے ہیں۔ کیسے عجیب لوگ ہیں! فرمایا، جب تمہارا پروردگار، تمہارا ربّ اللہ ہے جو ربّ العالمین ہے، ہر مخلوق کی ہر ضرورت ہر آن پوری فرما رہا ہے تو تم اس سے مانگو، اپنے ربّ سے درخواست کرو کہ میری یہ ضرورت ہے پوری فرما دیجیے۔ جب ربّ العالمین ہر ایک کی ضرورت پوری فرما رہا ہے تو پھر کسی اور سے مانگنے کی کیا ضرورت ہے؟ لوگ ہیں کہ ربّ کو چھوڑ کر عارضی سہارے پکڑتے ہیں۔ اپنی امیدیں غائبانہ قوتوں سے منسوب کر لیتے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ میرے پاس جن ہوتے تو میرے سارے کام ہو جاتے، کبھی ہمزاد قابو کرنے میں ساری عمر لگا دیتے ہیں اس امید پر کہ ہمزاد ہوتا تو کتنی ضرورتیں پوری کر دیتا۔ حالانکہ حقیقی کارساز صرف اللہ ہے۔ جنات ہوں یا شیاطین وہمزاد سب اس کی مخلوق اور مملوک ہیں۔

ہمزاد:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ عالی کے مطابق جب کوئی انسان پیدا ہوتا ہے تو ایک شیطان بھی پیدا ہوتا ہے جو اس کے ساتھ لگ جاتا ہے اور پھر ساری زندگی اُسی انسان کے ساتھ رہتا ہے۔ جب وہ انسان مر جاتا ہے تو یہ شیطان اس کی قبر پر بیٹھا رہتا ہے۔ یہ شیطان ہمزاد ہے۔

ارواح کو بلانا ممکن نہیں:

آج کل مغرب میں اس بات کا بہت دور دورہ ہے۔ کچھ لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ وہ مرنے والوں کی روح کو بلا سکتے ہیں۔ وہ اس کا برملا اعلان کرتے ہیں کہ فلاں حکمران کی روح کو بلا لیا اور فلاں کی روح کو بلا لیا لیکن حق یہ ہے کہ ارواح کو بلانا ممکن نہیں ہے۔ ارواح کو بلانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ ارواح دو میں سے ایک حالت میں ہوتی ہیں۔ ثواب پاتی ہیں یا عذاب۔ ارشادِ نبوی ہے: اَلْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ اَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ۔۔۔ قبر یا تو جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے

ایک گڑھا ہے۔ اب جو برزخ میں ہیں اور اہل جنّت میں سے ہیں تو اگر اہلِ دنیا انہیں کسی طریقے سے کھینچ کر پیچھے بلا سکتے ہوں تو پھر انہیں جنّت کا کیا فائدہ اور اُن کے لیے کیا راحت ہوگی؟ اُن کے لیے تو مصیبت ہوگی کہ جس کا جی چاہے انہیں جنّت سے کھینچ کر لے آئے۔

دوسری طرف جو عذابِ دوزخ میں گرفتار ہیں، اگر اہل دنیا انہیں بلا سکیں تو اُن کی تو بہت موج ہوگئی کہ اتنی دیر تو کم از کم دوزخ سے نکل آئے۔ واضح ہو کہ یہ سفر تو آگے کی طرف ہے پیچھے کی طرف کوئی نہیں لا سکتا لہٰذا یہ بات تو طے ہے کہ ارواح واپس نہیں آسکتیں اور برزخ سے واپس دنیا میں کوئی نہیں آتا۔ جو عامل روح کو بلاتے ہیں، دراصل اُن کے بلانے پر ہمزاد آتا ہے، وہی شیطان جو مرنے والے کے ساتھ زندگی بھر رہتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر رہتا ہے۔ چونکہ وہ اس شخص کی پوری زندگی سے واقف ہوتا ہے اس کے لب و لہجے اور حلیے سے واقف ہوتا ہے لہٰذا اس کی آواز اور حلیہ بھی ویسا ہی ہوتا ہے۔ عامل کے بلانے پر شیاطین حاضر ہوتے ہیں، ارواح نہیں آتیں۔

اہل اللہ کے کمالات:

اللہ کریم کے بعض مقرب بندوں کو منجانبِ اللہ کمالات عطا ہوتے ہیں، مشاہدات عطا ہوتے ہیں۔ جن اہل اللہ کو یہ کمال نصیب ہوتا ہے کہ وہ ارواح سے کلام کر سکتے ہیں وہ ارواح کو بلاتے نہیں بلکہ اہل اللہ کی ارواح برزخ میں جا کر اُن سے کلام کرتی ہیں۔

اپنے اہل و عیال کو عبادات کی تلقین کرنی چاہیے:

مشرکینِ مکہ کا یہ حال تھا کہ دوسروں کو عبادت کی دعوت دیتے تھے اور خود اپنے لیے رعائتیں رکھی ہوئی تھیں۔ خود ساختہ عبادت کے نام پر جو رسومات بنا رکھی تھیں وہ بھی خود پوری نہیں کرتے تھے اور دوسروں کو کہتے کہ عبادت کرو بلکہ حج کے موقع پر عرفات میں بھی حاضر نہیں ہوتے تھے مزدلفہ سے ہی لوٹ جاتے عبادات میں کمی کرتے اور کہتے کہ ہمارے لیے ساری رسومات ادا کرنا ضروری نہیں ہیں۔ مشرکینِ مکہ خود کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل السلام کے پیروکار بھی کہتے تھے تو ارشاد ہوتا ہے: وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ﴿۵۵﴾ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام تو اللہ کے مقرب بندے تھے جو اپنے اہلِ خانہ کو بھی عبادات کی تلقین کرتے تھے۔ وہ اپنے بیوی بچوں اور متعلقین کو بھی نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے اور وہ اللہ کے بہت پسندیدہ اور مقرب بندے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ بندے کو اپنے ساتھ ساتھ اپنے بیوی بچوں، اور دیگر اہلِ خانہ کا بھی خیال رکھنا چاہیے اور اولاد کی تربیت اس طرح کرنی چاہیے کہ اُن کے دلوں میں عظمتِ الٰہی ہو اور اللہ کی عبادت پر راسخ ہو

جائیں۔ اُنہیں ذکر اللہ کی تلقین کی جائے اور فرائض سنن واجبات اور نوافل ادا کرنے کا عادی بنایا جائے۔

نبیؑ کا اُمتی ہونے کا معیار:

یہ باتیں جو بیان کی جا رہی ہیں، انبیائے کرام اور اُن کی قوموں کے حالات ارشاد ہو رہے ہیں۔ ان میں ایک اصول واضح کر دیا گیا ہے کہ کسی بھی نبیؑ کی اُمّت کہلانے کے لیے اپنے کردار کو اس نبیؑ کی اطاعت میں ڈھالنا ہوگا۔ جیسے گزشتہ آیات میں یہود کو مخاطب کیا گیا کہ تمہارا کردار اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام سے کتنا مختلف ہے، ایسے ہی مشرکینِ مکہ کو کہا گیا کہ تم اسمٰعیل علیہ السلام کی اُمّت ہونے کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہو جبکہ تمہارا کردار اُنؑ سے بالکل الگ ہے۔ انسان لاکھ دعویٰ کرتا رہے کہ وہ اپنے نبیؑ کا اُمّتی ہے، اس سے بات نہیں بنے گی جب تک اس کا عقیدہ، ایمان و یقین اور عمل نبیؑ کی متابعت میں نہ ہوں۔

آج ہم بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی اُمّت ہیں لیکن ہم اپنے عقائد و نظریات کی پروا ہی نہیں کرتے اور اپنے کردار کو بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی اطاعت میں نہیں ڈھالتے تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی اُمّت کیسے بن سکتے ہیں؟ قرآن کریم ہمیں گزشتہ اُمّتوں کے حالات اس لیے ارشاد فرما رہا ہے تاکہ ہم بھی اپنے عقیدے، نظریات اور کردار پر غور کریں اور کردار کو جانچیں کہ کیا ہمارا کردار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے تابع ہے؟

حضرت ادریس علیہ السلام:

فرمایا: وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِدْرِيْسَ ۫ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ﴿۵۶﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿۵۷﴾ اس قرآن میں ادریس (علیہ السلام) کا ذکر بھی فرمائیے، وہ صدیق بھی تھے اور نبیؑ بھی تھے۔ یہ بحث گزشتہ اسباق میں گزر چکی ہے کہ صدیق سچے کو بھی کہتے ہیں اور یہ ایک منصب بھی ہے۔ انبیاؑ میں جو صدیق ہیں وہ بحیثیت نبیؑ ہیں اور اولیا میں جو اس منصب پر فائز ہوتا ہے وہ بحیثیت ولی ہوتا ہے، یہ فرق ہوتا ہے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق۔ بہرحال صدیقیت ایک بہت اعلیٰ منصب ہے جو خاص خاص انبیاؑ کو عطا ہوا اور امتیوں میں اللہ کے خاص خاص بندوں کو ملا لیکن ایسے لوگ صدیوں میں کہیں ملتے ہیں۔ فرمایا: ادریس (علیہ السلام) کا ذکر کیجیے وہ صدیق بھی تھے اور نبیؑ بھی تھے اور پھر ہم نے اُن پر اتنا کرم فرمایا کہ انہیں بہت بلندی پر، بہت اونچی جگہ پر اٹھا لیا۔ مفسرین کرام نے یہاں یہ مراد لیا ہے کہ انہیں زندہ آسمانوں پر اٹھایا گیا اور باقی زندگی انہوں نے چوتھے آسمان پر پوری کی اور چوتھے آسمان پر ہی اُن کا وصال ہوا۔ معراج شریف سے متعلق حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی ملاقات حضرت ادریس علیہ السلام سے چوتھے آسمان پر ہوئی۔

یہاں سے یہ بھی مراد لیا جا سکتا ہے کہ ہم نے انہیں بہت ہی بلند منصب عطا کیا کہ وہ نبیؑ بھی تھے اور صدیق بھی تھے۔

انبیاؑ کی بشریت:

فرمایا: اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ۔۔۔ یہ سب انبیاؑ وہ ہیں جن پر اللہ کریم نے بہت انعام فرمائے، بہت احسان فرمائے کہ اُنؑ کو نبوت و رسالت عطا فرمائی، کتاب اور شریعت عطا فرمائی اور وہ مخلوق کے لیے ہدایت کا سبب بنے۔ اللہ کریم نے ان حضراتؑ کو بہت بلند درجات عطا کیے اور صدیقیت تک عطا فرمائی لیکن یہ سب انبیاؑ: مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ۔۔۔ حضرت آدم (علیہ السلام) کی اولاد تھے، سب انسان تھے اور اللہ کی مخلوق تھے۔ اللہ کی ذات کا حصہ نہیں تھے بلکہ سب (آدم علیہ السلام) کی اولاد میں سے تھے، بشر تھے۔ چونکہ لوگوں نے انبیاؑ کے متعلق عجیب وغریب قصے گھڑ رکھے تھے اور انبیاؑ کی پرستش شروع کر رکھی تھی اُن کی قبروں کو سجدے کرتے تھے لہٰذا یہاں اصلاح فرما دی کہ یہ تمام حضراتؑ انسان تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ یہود و نصاریٰ نے تو اپنے انبیاؑ کی قبروں کو سجدے کرنے شروع کر دیے تھے لیکن تم میری قبر کو ہرگز سجدہ گاہ نہ بنانا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

یہاں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ نے ان ہستیوں پر بہت انعامات فرمائے، بلند درجات عطا کیے لیکن یہ سارے انبیاؑ، آدمؑ کی اولاد میں سے تھے، سب بشر تھے، انؑ کی بشریت غیر نبیؑ کی بشریت کی طرح نہیں تھی۔ انبیاؑ بشریت کی کمال پر ہوتے ہیں اور غیر نبیؑ اُن کی بشریت کو نہیں پا سکتا۔ آج یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ انبیاؑ بشر نہیں ہوتے، تو اس کی وجہ یہ ہے ہم خود کو بشر سمجھے بیٹھے ہیں اور اس پر قیاس کرتے ہوئے انبیاؑ کی بشریت کا ہی انکار کر دیتے ہیں۔ ہم تو اپنے کردار کی خرابیوں کے باعث شاید حیوانوں سے بھی بدتر ہوں جبکہ انبیاؑ تو کامل بشر ہوتے ہیں۔

فرمایا: وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۙ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۙ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا۔۔۔ کچھ نوح (علیہ السلام) کی اولاد میں سے انبیاء ہوئے، جن لوگوں کو اللہ کریم نے حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ کشتی میں سوار کیا تھا لیکن وہ بھی اور بعد میں بھی جتنے انبیاؑ بھیجے گئے وہ سب بھی بشر تھے لائق عبادت نہیں تھے۔ لوگوں کو اُن کی پرستش نہیں بلکہ پیروی کرنی ہے، اُن کا اتباع کرنا چاہیے تھا کہ وہ ایسے لوگ تھے کہ اُن کے قلوب انوارات و برکات اور قربِ الٰہی سے لبریز تھے۔ ان برگزیدہ ہستیوں کو اتنا قربِ الٰہی نصیب تھا کہ: اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ۔۔۔ جب اُن کے سامنے اللہ کی آیات تلاوت کی جاتیں: خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۩ ﴿٥٨﴾ تو وہ

روتے ہوئے سربسجود ہوجایا کرتے، اُن کے اشک رواں ہوجاتے اور ہچکیاں بندھ جایا کرتی تھیں۔ اُن کے قلوب میں عظمتِ الٰہی اس قدر موجزن تھی کہ کلامِ الٰہی سن کر روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے تھے اور تم جو اُن کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہو تم پر تو کلامِ الٰہی کا کوئی اثر ہی نہیں ہوتا۔ تم کلامِ الٰہی سنتے نہیں، سن لو تو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے اور سمجھ لو تو اس کی مخالفت کرتے ہو اور مخالفت میں دلائل دیتے ہو۔ اپنے اس کردار کے ساتھ انبیاؑ کی اُمت ہونے کا دعویٰ بھی رکھتے ہو، یہ کتنا بڑا جھوٹ ہے۔

مرورِ زمانہ کا اثر:

مرورِ زمانہ بھی اپنے عجیب اثرات رکھتی ہے کہ یہ فاصلے پیدا کر دیتی ہے اور زمانے کی گردش سے حالات بدلنے لگتے ہیں، انسانوں کے نظریات اور کردار بدل جاتے ہیں۔ ایسے ہی جب اللہ کے یہ اولوالعزم رسولؑ جو نبیؑ اور صدیق تھے، صاحبِ کتاب اور صاحبِ شریعت تھے، اللہ کے مقرب اور پسندیدہ تھے اور ایسے منور اور رقیق القلب کہ جب اللہ کی آیات سنتے تو روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے، دنیا سے پردہ فرما گئے تو: فَخَلَفَ مِنۢ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوۡفَ يَلۡقَوۡنَ غَيًّا ﴿۵۹﴾ اُن کے بعد ایسے ناخلف لوگ اُن کے جانشین بن بیٹھے جنہوں نے نمازیں ضائع کیں اور خواہشاتِ نفس کی پیروی میں لگ گئے۔ ان نااہل لوگوں نے غلط راستہ اختیار کیا لہٰذا عنقریب یہ لوگ تباہی و بربادی دیکھیں گے۔

جانشینی کے لیے اہلیت شرط ہے:

یاد رہے انبیاؑ کی وراثت اُن کے علوم اور برکات ہوتی ہیں، اُن کے انوارات ہوتے ہیں، اسی لیے علمائے کرام کو انبیاؑ کا وارث کہا گیا ہے کہ اُن کے پاس انبیاؑ کے علوم ہوتے ہیں، برکات و انوارات ہوتے ہیں۔ فرمایا گیا: اِنَّ الۡعُلَمَآءَ وَرَثَةُ الۡاَنۡبِيَآءِ (ابن ماجه) بیٹے کا وارث ہونا یا جانشین ہونا درست ہے مگر شرط یہ ہے کہ بیٹے میں وہ اہلیت ہو، اُس میں استعداد ہو اور اس نعمت کا حامل ہو۔ انبیاءؑ کے بیٹے بھی اُن کے وارث ہوئے ہیں جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام اُن کے وارث ہوئے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وارث حضرت اسحٰق علیہ السلام ہوئے اُن کے وارث حضرت یعقوب علیہ السلام اور اُن کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام آئے اور یوں یہ وراثت چلی، لیکن سب میں اہلیت و استعداد تھی اور سب کے پاس نورِ نبوت تھا۔ ورنہ محض کسی کا بیٹا ہونا کمال نہیں ہے کہ نوح علیہ السلام بھی اللہ کے نبیؑ تھے اور آدم ثانی کہلائے لیکن اُن کا بیٹا ہی تھا جو کفار کے ساتھ طوفان میں غرق ہوا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا، بارِالٰہا آپ کا وعدہ تھا کہ میرے گھر والوں کو بچالیں گے تو یہ میرا بیٹا!

فرمایا یہ آپؑ کا بیٹا آپؑ کے اہل میں سے نہیں ہے اس لیے کہ: اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ (ھود:46) اس کا کردار صحیح نہیں تھا، یہ آپ کا کچھ نہیں لگتا۔

ولایت میں جانشینی کے لیے بھی یہی شرط ہے کہ اگر بیٹا جانشین بنے تو اس میں استعداد و اہلیت ہونی چاہیے، وہ کمال حاصل کیا ہو جس سے مخلوق کی اصلاح کر سکے، مخلوق کو وہ نعمت پہنچا سکتا ہو۔ اگر یہ اہلیت ہو تو بیٹے کا جانشین بننا مناسب ہے، بری بات نہیں ہے۔ لیکن محض بیٹا ہونے کی وجہ سے جانشین بن جانا درست نہیں ہے کہ کسی کا بیٹا ہونا کوئی کمال نہیں ہے۔ اہل اللہ کے ساتھ کردار کا رشتہ شرط ہے، جو کمال اُن میں ہے وہ کمال حاصل کرے جو کام وہ کر رہے تھے اسی طرح مخلوق کی اصلاح کا کام کرے تو بیٹا جانشین ہو سکتا ہے۔ ورنہ کوئی ذی استعداد فرد اُن کی بنائی ہوئی جماعت میں سے جانشین مقرر ہو سکتا ہے۔ مروجہ نظام کہ باپ کے مرنے کے بعد نااہل بیٹا جانشین ہو گیا یہ بالکل غلط ہے اور نااہل اگر جانشین بنے گا تو وہ نعمتیں ضائع کرے گا، عبادات میں بھی نقصان کرے گا اور برکات میں بھی نقصان کرے گا، اور پھر جب مخلوق اس کے پیچھے لگے گی تو وہ خواہشاتِ نفس میں مبتلا ہو جائے گا۔ جو لوگ انبیا، صلحا اولیا اللہ کے جانشین بن گئے لیکن وہ استعداد حاصل نہ کی، اُن سے برکات حاصل نہ کیں اُن کے دل میں نورِ ایمان کا اور ہدایت کا وہ درجہ نہیں تھا لہٰذا گمراہ ہو گئے۔ یہ نااہل لوگ خواہشاتِ نفس کی پیروی کرنے لگے اور عبادات میں نقصان کیا اور اپنے متعلقین کو بھی گمراہ کر دیا۔

کسی کو گمراہ کرنے کا وبال:

ایسے نااہل پیشوا خود گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا تو: فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿59﴾ ایسے لوگ عنقریب بہت بڑی تباہی اور بربادی میں جا پڑیں گے۔ ان لوگوں کو صرف اپنے گناہوں کی سزا ہی نہیں ہو گی بلکہ جتنے لوگوں کو گمراہ کیا اُن کی گمراہی اور اس کی وجہ سے ہونے والے گناہوں کا وبال بھی ان پیشواؤں پر پڑے گا۔ جتنی سزا پیروکار کو ملے گی اتنی ہی سزا پیشوا کو بھی بھگتنی ہو گی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ عالی ہے کہ اگر کوئی نیک کام کرتا ہے اور لوگوں کو نیکی پر لگاتا ہے اور وہ لوگ مزید اس نیکی کو پھیلاتے ہیں تو جب تک وہ نیکی چلتی رہے گی اس پہلے شخص کو بھی وہ درجہ ثواب ملتا رہے گا۔ کوئی کسی کو برائی پر لگاتا ہے تو جب تک وہ برائی چلتی جائے گی جتنا گناہ ان لوگوں کو ملے گا اتنا اُس اکیلے شخص کو ملے گا جس نے برائی پر لگایا۔

توبہ:

اللہ بہت کریم ہیں ان کے کرم کا در یہاں بھی وا ہے، فرمایا: اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا

فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۝٦٠ ہاں اُن کو معاف کردوں گا جو توبہ کریں گے۔ اتنی بڑی برائی کے بعد کہ کسی نیک بندے کا جانشین بنے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلاتا رہا، اس پر انہوں نے خاک ڈال دی اور لوگوں کو گمراہ کر دیا برائی پر لگا دیا۔ ایسے ظالموں کے لیے بھی اللہ کریم نے توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا، یہ اس کے کرم کی ایک جھلک ہے کہ اگر کوئی اتنے ظلم کے بعد بھی موت سے پہلے توبہ کرے گا تو اللہ اُسے معاف کر دے گا۔ توبہ کا دروازہ کسی کے لیے بند نہیں کیا اور توبہ کی تعریف فرما دی: وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا۔۔۔ ایمان بھی صحیح ہو، عقیدہ بھی صحیح کرے اور عمل بھی درست کرے۔ توبہ کے دو جز ہیں، سب سے پہلا ہے عقیدے کی اصلاح، کہ عقیدے میں جو خرابی آ گئی ہے اس کی اصلاح کرے اور عقیدہ صحیح کرے۔ دوسرا جز ہے کہ اپنا عمل درست کرے سُنّت کے مطابق کرے تو اس کی توبہ قبول ہو جائے گی۔ اللہ کریم فرماتے ہیں پھر ایسے لوگوں کو بھی اگر وہ توبہ کر لیں گے تو میں جنّت میں داخل کر دوں گا۔ یہ کتنا کرم ہے اللہ کا کہ ایسے ظالموں کے لیے بھی توبہ کا دروازہ بند نہیں کیا گیا اور جس کا بھی احساس زندہ ہو جائے اور وہ توبہ کر لے اور اپنا عقیدہ اور کردار درست کر لے تو اللہ کریم اسے بھی جنّت میں داخل کر دیں گے۔ فرمایا: ''کسی کے ساتھ ذرّہ برابر زیادتی نہیں ہوگی۔''

ہمارا تو یہ حال ہے کہ ہم زبانی توبہ توبہ کہتے رہتے ہیں، نہ ایمان کی فکر کرتے ہیں نہ عمل کی، یہ درست نہیں ہے۔

اللہ کے بندے:

اللہ توبہ کرنے والے ان لوگوں کو اُن ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں داخل فرمائے گا جن کا وعدہ اللہ رحمٰن نے اپنے بندوں سے غائبانہ کر رکھا ہے، فرمایا: جَنّٰتِ عَدْنِ ِۨالَّتِيْ وَعَدَ الرَّحْمٰنُ عِبَادَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّهٗ كَانَ وَعْدُهٗ مَاْتِيًّا ۝٦١ اللہ کریم نے اپنے بندوں سے عِبَادَهٗ۔۔۔ یعنی جنہوں نے ثابت کیا کہ ہم اللہ کے بندے ہیں، ہم خواہشاتِ نفس کے بندے نہیں، شیطان کے بندے نہیں، دنیا کے بندے نہیں ہیں بلکہ صرف اللہ رب العالمین کے بندے ہیں، اُن سے غائبانہ وعدہ کر رکھا ہے۔ کسی نے جنّت دیکھی نہیں کوئی وہاں گیا نہیں لیکن اللہ پر غائبانہ ایمان ہے اور اللہ کے وعدے پر اللہ کے بندوں کو یقین ہے کہ اللہ انہیں یہ منصب اور یہ نعمت ضرور عطا فرمائے گا۔ اللہ انہی بندوں کے ساتھ توبہ کرنے والوں کو بھی داخل کر دیں گے اور بے شک اللہ کے وعدے کھرے، سچے اور پکے ہیں اور اُن پر عمل ہونے والا ہے، وہ اپنے منطقی انجام کو پہنچنے والے ہیں۔ اللہ کریم کا کوئی وعدہ ایسا نہیں ہے جو ادھورا رہ جائے یا جس کی خلاف ورزی ہو جائے۔

جنّت کی ایک اعلیٰ خصوصیت:

اللہ کریم کا وعدہ سچا ہے اور وہ لوگ جنتوں میں داخل ہو جائیں گے۔ فرمایا: لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ؕ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾ جس میں بے پناہ نعمتیں ہوں گی اور جنّت کی سب سے اعلیٰ خصوصیت یہ ہوگی کہ وہاں کوئی فضول بات سننے کو نہیں ملے گی۔ فضول یا لغو بات اُس بات کو کہتے ہیں جو غیر نافع ہو جس کا کوئی فائدہ نہ ہو۔ جنّت میں جو بات بھی سننے کو ملے گی اس میں عظمتِ الٰہی ہوگی، خیر ہوگی، نیکی اور بھلائی ہوگی، خوشی اور راحت اور سکونِ قلب ہوگا۔ وہاں کوئی فضول کلمہ نہیں ہوگا۔

دنیا میں سُکھی رہنے کا ایک نسخہ:

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر دنیا میں بھی کوئی آرام اور سکون میں رہنا چاہے تو اُسے چاہیے کہ اپنی زبان اور کان دونوں کی حفاظت کرے، نہ فضول بات کرے اور نہ ہی سُنے تو اس کی زندگی آرام سے گزرے گی۔ ہم ساری زندگی شکایت کرتے رہتے ہیں کہ ہم بہت پریشان ہیں اور ہمیں پریشانیوں نے گھیر رکھا ہے، تو اس کا آسان ساحل ہے کہ ہم لوگوں سے وہ تمام باتیں سننا چھوڑ دیں جن باتوں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے اور اپنی زبان سے غیر ضروری باتیں کرنا چھوڑ دیں تو زندگی کی ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں گی۔ میرے پاس سرحد سے ایک سیکرٹری صاحب تشریف لائے جو سلسلہ سے منسلک تھے اور ذکر کرتے تھے، کہنے لگے کہ بہت پریشان ہوں، بات کرنا چاہتا ہوں۔ غالباً دن بھر مصروفیت تھی تو اُن سے کہا کہ شام کو آپ سے بات ہوگی پھر رات آپ یہیں قیام کر لیجیے گا۔ لیکن شام تک آپ ایک کام کیجیے کہ جتنی پریشانیاں آپ کی اپنی ذات سے وابستہ ہیں وہ الگ کر لیں اور جتنی پریشانیاں آپ نے دوسروں کی سمیٹ رکھیں ہیں کہ فلاں نے یہ کہہ دیا، فلاں نے وہ کہہ دیا، فلاں وہ کر رہا ہے، وہ الگ کر دیں کہ اُن سے آپ کا تعلق نہیں۔ البتہ جو آپ کی پریشانیاں ہیں اُن پر ضرور بات ہوگی۔ خیر اگلے روز آئے اور کہنے لگے کہ میں نے ساری رات سوچا کہ میری تو کوئی پریشانی ہی نہیں ہے میں نے تو خوامخواہ ہی ارد گرد کی سمیٹ رکھی ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ کا تو مسئلہ ہی حل ہو گیا بس آپ ذکر کریں اور متوجہ الی اللہ رہیں اور اللہ سے دعا کریں کہ آئندہ بھی کوئی پریشانی نہ ہو۔

ہم کانوں اور زبان کی وجہ سے پریشانیاں اکٹھی کرتے ہیں، کبھی ہم ایسی غیر ضروری بات کہہ دیتے ہیں جس سے باہم رنجشیں بڑھتی ہیں، ناراضگیاں بڑھ جاتی ہیں اور دشمنیاں بن جاتی ہیں۔ کبھی ہم ایسی بات سُن لیتے ہیں اور خوامخواہ کُڑھتے رہتے ہیں حالانکہ اس بات سے ہمارا کوئی واسطہ یا نفع نقصان نہیں ہوتا۔ ہم نے ننانوے فیصد

پریشانیاں یا بات کرکے یا بات سُن کر پیدا کی ہوتی ہیں۔ اگر تنہائی میں بیٹھ کر تجزیہ کیا جائے کہ میری ذاتی پریشانی کیا ہے تو ایک بھی نہیں ملتی۔ اللہ تعالیٰ نے گھر دیا ہے، اولاد دی ہے، ماں باپ کی خدمت کررہے ہیں، دال روٹی مل رہی ہے، عزت وآبرو سے گزربسر ہورہی ہے۔ اللہ کا نام لیتے ہیں ذکراذکار کرتے ہیں، نمازیں ادا کرتے ہیں، اس میں کیا پریشانی ہے؟ لیکن جب سنتے ہیں فلاں نے یہ کہا تو خوامخواہ آگ بگولا ہو جاتے ہیں، یہ غیر ضروری بات سننے کی کیا ضرورت ہے؟ اسی طرح کسی کے بارے میں کوئی ایسی بات کہہ دیتے ہیں جو آگے ناراضگیوں کا سبب بن جاتی ہے، پریشانی بن جاتی ہے۔ دنیا میں انسان اگر اپنی گویائی اور سماعت پر قابو پالے تو بے شمار پریشانیوں سے بچ سکتا ہے۔

جنّت کی نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ کوئی پریشانی والی بات، کوئی فضول بات نہیں ہوگی بلکہ ہر بات ہی سلامتی والی، نفع والی اور سکونِ قلب والی ہوگی جو اہل جنّت سنیں گے۔ جنّت کی یہ خصوصیت بیان کرنا کہ وہاں کوئی فضول بات نہیں سنائی دے گی اور سلامتی کی بات ہوگی کوئی پریشانی نہیں ہوگی، اس بات کی دلیل ہے کہ دنیا کی ایک بہت بڑی پریشانی فضول، لغو باتیں ہیں اور اس کا علاج اس طریقے سے کرنا چاہیے کہ زبان کو فضول باتوں سے، اور کانوں کو فضولیات سننے سے روکنا چاہیے۔

اہلِ جنّت کا رزق:

فرمایا: وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿۶۲﴾ انہیں صبح شام بے حد عمدہ کھانا ملے گا۔ اہل جنّت کو جو کھانا پیش کیا جائے گا اس کی خاصیت یہ ہوگی کہ ہر لمحے جو کھایا جائے گا وہ گزشتہ لمحے کے کھانے سے زیادہ لذیذ ہوگا۔ جنّت میں اہل جنّت کے یہ مزے بھی ہوں گے کہ ہر لقمہ، اسی کھانے کا پہلے لقمے سے زیادہ لذیذ ہوگا۔ اگر پھل کھائیں گے تو بھی دوسرا پھل پہلے سے لذیذ ہوگا یعنی ہر آن نعمتوں میں ترقی ہوتی رہے گی۔

جنّت اللہ کے متقی بندوں کی میراث ہے:

فرمایا: تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾ یہ وہ جنّت ہے جو ہم نے اپنے پرہیز گار بندوں کی وراثت بنادی ہے، کہ یہ اُنہی کی ہے، اُنہی کے لیے بنائی گئی ہے۔ جس طرح وراثت ایک قانونی حق ہے، ایک ٹھوس حقیقت ہے اسی طرح جنّت اُن کا حق ہے، شرط یہ ہے کہ مِنْ عِبَادِنَا میرے بندوں کے لیے، دنیا کے بندوں کے لیے نہیں، نفس اور خواہشات کے بندوں کے لیے نہیں۔ میرے بندوں کی صفت ہے کہ وہ كَانَ تَقِيًّا ﴿۶۳﴾ پرہیز گار ہوتے ہیں متقی ہوتے ہیں، جو زندگی اس انداز میں گزارتے ہیں کہ اللہ کو راضی رکھیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کریں۔

تقویٰ ایک احساس ہے:

تقویٰ کیا ہے؟ تقویٰ اتباعِ رسالت پناہی صلی اللہ علیہ وسلّم کا نام ہے، جس سے اتنا قربِ الٰہی نصیب ہوجائے کہ پھر بات کرتے وقت بھی یہ احساس ہو کہ ایسی بات نہ کروں جو میرے اللہ کو پسند نہ ہو۔ ہر کام کرتے وقت یہ احساس ہو کہ ایسا کوئی کام نہ کروں جو میرے اللہ کو ناراض کردے یہ کیفیت تقویٰ کہلاتی ہے۔

ہم دنیا میں یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ کسی معاملے میں کہہ دیتے ہیں کہ بھائی صاحب امریکہ یا برطانیہ میں رہتے ہیں اُن سے پوچھے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے۔ اُن سے بات کریں گے پھر فیصلہ کریں گے، اُن سے مشورہ کیے بغیر ہی کردیا تو کہیں وہ خفا نہ ہوجائیں۔ ایسا رشتہ جب ربّ العالمین سے بن جائے کہ انسان یہ سوچے کہ میں جو بات منہ سے نکالنے والا ہوں کہیں یہ اللہ کو ناپسند تو نہیں اور رک جائے کہ میں ایسی بات نہیں کروں گا۔ کوئی کام کرنے سے پہلے یہ سوچے کہ کام گناہ تو نہیں، اللہ کی نافرمانی کا کام تو نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی شریعت کے خلاف تو نہیں اور اگر خلاف ہو تو کام کرنے سے رک جائے کہ میں اللہ کریم اور اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو ناراض نہیں کرسکتا۔ یہ کیفیت جو انسان کو روک دینے والی ہے اسے تقویٰ کہتے ہیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ میرے بندے وہ ہیں جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔

اللہ کائنات کے ہر ذرّے کا ربّ ہے:

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ان کفار کو بتادیجیے: وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ﴿۶۴﴾ کہ فرشتہ ویسے ہی وحی نہیں لاتا بلکہ ربّ العالمین کے حکم سے نازل ہوتا ہے اور اس میں ذرّہ برابر بھی گھٹانے بڑھانے کا اختیار نہیں رکھتا کہ اس کے چہار طرف ہر چیز کا اور خود اس کا مالک اللہ ہے جو کبھی بھولتا بھی نہیں۔ فرمایا: رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ۚ هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿۶۵﴾ تمہارا ربّ تو اتنی شان والا ہے اتنی عظمتوں والا ہے کہ وہ کائنات کے ہر ذرّے کا ربّ ہے، ہر ذرّے کا خالق اور مالک ہے۔ جو کچھ زمینوں اور آسمانوں میں ہے اور جو کچھ اُن دونوں کے درمیان ہے وہ اُن سب کا ربّ ہے۔ جب ذرّے ذرّے کی بات ہورہی ہے تو آخر ذرّے میں کیا ہے؟ ہر ذرّے میں ایک جہان بستا ہے اور یہ بہت عجیب بات ہے کہ جدید سائنس نے قرآن کریم کی تشریح کی ہے اور یہ فائدہ ہوا ہے کہ مزید تفصیل اور تشریح ہوجاتی ہے۔ افسوس کہ اکثر سائنسدان خود بھی سمجھ نہیں پاتے اور محروم رہ جاتے سوائے اللہ کے بندوں کے لیکن یہ بہت دلچسپ حقیقت ہے کہ جوں جوں سائنس ترقی کررہی ہے قرآن کی تصدیق ہورہی ہے،

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادات کی تصدیق ہورہی ہے۔ایک سائنسدان نے تجربہ کیا ہے، اس نے ایک ایسی خوردبین بنائی ہے جو چیز کو چار سو گنا بڑا کر کے دکھاتی ہے۔اس خوردبین سے اس نے ریت کے ذرّوں کو تلاش کیا اور دیکھا کہ ہر ذرّے میں ایک جہان ہے اور اگر ذرّے کے اندر چیزوں کو مزید بڑا کر کے دیکھنے والی خوردبین ہو اور اس کی تصویر کھینچی جائے تو نجانے ان چیزوں کے اندر اور کیا کچھ ہوگا؟ صحرا کی ریت کے ایک ذرّے میں کتنی قسم کی مخلوق ہے اور مستقبل میں امید ہے کہ ایسی خوردبینیں ایجاد ہو جائیں گی جو آگے تجزیہ کریں گی کہ اس میں اور کیا ہے۔فرمایا تمہارا ربّ تو زمینوں اور آسمانوں کا ربّ ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اس کا بھی ربّ ہے اور اس کی شان تو یہ ہے کہ وہ وہاں وہاں چیزوں کو پیدا کر رہا ہے، پال رہا ہے اور انجام کو پہنچا رہا ہے جہاں تمہاری نگاہ نہیں پہنچتی۔ایک ریت کے ذرّے میں ایک جہان آباد ہے اور ایک انسان کے وجود میں دس کھرب سیل (Cell) ہیں اور ہر سیل میں موت وحیات جاری ہے ایسے ہی دوسرے جانداروں میں کتنے سیل ہوں گے، جانوروں میں، جمادات ونباتات دھاتوں میں کتنے سیل ہوں گے اور سب میں موت وحیات جاری ہے۔سائنسدانوں نے ایک ذرّہ ریت کا ہی پھاڑا اور ایٹم بم بن گیا تو ابھی اور کتنی مخلوق پڑی ہے اور پتا نہیں اس میں کتنے ایٹم پڑے ہیں اور اس کے کتنے اور پہلو ہیں اور وہ سب کا ربّ ہے۔تمہارا بھی وہی ربّ ہے، وہ جو اتنی مخلوق کی نگاہ داری کر رہا ہے کیا تم اس کی نگاہ سے اوجھل ہو گئے ہو، کیا وہ تمہارا ربّ نہیں ہے؟ اس کی ہستی تو عظیم ہے سو وَاصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِهٖ۔۔۔اس وحدہٗ لاشریک کی عبادت پر جم جاؤ، اس کی اطاعت پر جم جاؤ اور اس کی نافرمانی نہ کرو، اس کی دشمنی مول نہ لو کہ تمہارا ربّ آسمانوں اور زمینوں کا ربّ ہے۔اس کے سوا کوئی دوسرا ان جہانوں کو پیدا کرنے والا، قائم رکھنے والا، پالنے والا، مٹانے والا نہیں ہے تو تم اس ربّ کو چھوڑ کر مخلوق کے پیچھے بھاگتے ہو، کبھی کسی جادوگر کے پاس کبھی کسی عامل کے پاس جاتے ہو۔کبھی بتوں کے آگے جھکتے ہو کبھی حکمرانوں کے سامنے جبکہ یہ سب محتاج ہیں، ان کا روآں روآں محتاج ہے۔لہٰذا ڈٹ جاؤ اپنے رب العالمین کی عبادت پر، اُسی سے ہر چیز مانگو، وہی عطا کرنے والا ہے۔اس کی عبادت پر قائم ہو جاؤ اور گھاس کی طرح نہ جھولو کہ یہ مسلمانی نہیں ہے۔جینا مرنا اٹھنا بیٹھنا، زندگی کا ہر لمحہ اسی کی اطاعت کے مطابق ڈھال لو۔فرمایا: هَلۡ تَعۡلَمُ لَهٗ سَمِيًّا ﴿۶۵﴾ کیا تم اس کا کوئی ہم نام جانتے ہو، کیا کوئی اور اللہ ہے، کیا کوئی اور اتنی قدرت کا، اتنے کمال کا مالک ہے؟ ہرگز نہیں، تمہارا پروردگار بہت بڑی رحمت کا، بہت ہی بڑی قدرت کا مالک ہے، بہت بڑے کمال کا مالک ہے اس کا کوئی ثانی نہیں کوئی شریک، کوئی ہمسر نہیں ہے۔

مومن، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا سفیر ہے:

اللہ کی اطاعت کا پیغام اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلّم نے دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ عالی ہے بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَةً اوکما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم یعنی تم سب میرے سفیر ہو تم نے صرف عمل ہی نہیں کرنا بلکہ اس طرح اطاعت کرنی ہے کہ تم سراپا اطاعت بن جاؤ اور پھر دوسروں تک بھی یہ پیغام پہنچاؤ۔ تمہارے پاس میرا ایک جملہ ہو تو وہ امانت ہے وہ دوسروں کو بھی پہنچاؤ کہ تم سفیر ہو۔ ایک بات جس پر بندہ خود عمل پیرا نہیں اس کام کی دعوت وہ دوسرے کو نہیں دے سکتا۔ جو کام وہ خود کرتا ہی نہ ہو وہ کسی دوسرے کو کیسے کہہ سکتا ہے کہ یہ کام کرو۔ البتہ جو کام وہ خود کرتا ہے تو دوسرے کو کہتا ہے کہ یہ کام اچھا ہے تم بھی کرو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ہر مومن کو یہ اعزاز بخشا ہے کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشاداتِ عالی کا امین ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا سفیر ہے لہٰذا اس کے ذمہ ہے کہ خود بھی دین پر زندہ رہے اور دین کو دوسروں تک پہنچائے۔

تبلیغ کی برکت:

ایک مرتبہ کسی بزرگ سے کسی نے عرض کیا کہ یہ گناہ مجھ سے چھوٹ نہیں رہا میری راہنمائی فرمائیے۔ انہوں نے فرمایا، تم اس گناہ کے خلاف وعظ کیا کرو، اس کے خلاف تبلیغ کرو۔ ایسا کرنے سے اللہ تمہیں توفیق دے دیں گے اور تم سے یہ گناہ چھوٹ جائے گا۔ یہ تبلیغ کی برکت ہے کہ اللہ تعالیٰ توفیقِ عمل عطا فرما دیتے ہیں۔ اللہ کے دین پر عمل کرو، جب انسان خود باعمل ہو جاتا ہے تو وہ پیغام آگے پہنچانے کے قابل ہو جاتا ہے کہ جب کوئی گھڑا بھر جاتا ہے تو وہ آگے پانی پہنچاتا ہے۔

سورۃ مریم رکوع 5 آیات 66 تا 82

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيَقُوْلُ الْاِنْسَانُ ءَاِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ اُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ اَوَلَا يَذْكُرُ
الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْـًٔا ﴿٦٧﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ
وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ
شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾ ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى
بِهَا صِلِيًّا ﴿٧٠﴾ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾ ثُمَّ
نُنَجِّي الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِيْنَ فِيْهَا جِثِيًّا ﴿٧٢﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا
بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا
وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ﴿٧٣﴾ وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿٧٤﴾
قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰىٓ اِذَا رَاَوْا مَا
يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ۭ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا
وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ﴿٧٥﴾ وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ۭ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ
خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿٧٦﴾ اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ
لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿٧٧﴾ اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿٧٨﴾ كَلَّا ۭ
سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿٧٩﴾ وَّنَرِثُهُ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا
فَرْدًا ﴿٨٠﴾ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾ كَلَّا ۭ
سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾

اور (بعثت کا منکر) انسان کہتا ہے بھلا جب میں مر جاؤں گا تو کیا پھر زندہ کر کے (قبر سے) نکالا جاؤں گا ﴿٦٦﴾ کیا انسان اس بات کو نہیں سمجھتا کہ بے شک ہم نے اس کو پہلے بھی تو پیدا فرمایا تھا اور وہ کچھ بھی نہ تھا ﴿٦٧﴾ سو قسم ہے آپ کے پروردگار کی ہم ان کو ضرور جمع فرمائیں گے اور شیاطین کو بھی پھر ان کو ضرور جہنم کے گرد حاضر کریں گے (اس حال میں) کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہوں گے ﴿٦٨﴾ پھر ہر گروہ سے ضرور ایسے لوگوں کو الگ کر لیں گے جو رحمٰن سے سخت سرکشی کرتے تھے ﴿٦٩﴾ پھر ہم ان لوگوں سے خوب واقف ہیں جو اس (جہنم) میں داخل ہونے کے زیادہ لائق ہیں ﴿٧٠﴾ اور تم میں سے کوئی نہیں مگر اسے اس پر سے گزرنا ہوگا یہ آپ کے پروردگار پر لازم (اور) مقرر ہے ﴿٧١﴾ پھر ہم پرہیزگاروں کو نجات دیں گے اور ظالموں کو اس میں گھٹنوں کے بل پڑا ہوا چھوڑ دیں گے ﴿٧٢﴾ اور جب ان (کفار) کے سامنے ہماری کھلی کھلی آیات پڑھی جاتی ہیں تو یہ کافر لوگ ایمان والوں سے کہتے ہیں کہ کس فریق کے مکان اچھے اور کس کی محفل اچھی ہے؟ ﴿٧٣﴾ اور ہم نے ان سے پہلے بہت سی امتیں ہلاک کر دیں جو سامان اور نمود و نمائش میں ان سے بھی اچھی تھیں ﴿٧٤﴾ فرما دیجیے جو شخص گمراہی میں پڑا ہو پس رحمٰن (اللہ) اس کو آہستہ آہستہ مہلت دیے جاتے ہیں یہاں تک کے جب اس چیز کو دیکھ لیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے خواہ عذاب اور خواہ قیامت، تو (اس وقت) جان لیں گے کہ مکان کس کا برا ہے اور لشکر کس کا کمزور ہے ﴿٧٥﴾ اور اللہ ہدایت والوں کو (دنیا میں) ہدایت زیادہ کرتے ہیں اور (آخرت میں پتہ چلے گا کہ) جو نیک کام ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ وہ آپ کے پروردگار کے نزدیک ثواب (بدلہ) میں بہتر ہیں اور انجام میں بھی بہتر ہیں ﴿٧٦﴾ بھلا آپ نے اس شخص کو دیکھا جس نے ہماری آیات سے کفر کیا اور کہتا ہے مجھ کو ضرور (آخرت میں) مال اور اولاد دملیں گے ﴿٧٧﴾ کیا اس نے غیب کی خبر پا لی یا اس نے رحمٰن (اللہ) سے (اس بات کا) عہد لے لیا

ہے؟ ﴿۷۸﴾ ہرگز نہیں! ہم اس کا کہا ہوا لکھ رکھیں گے اور اس کے لیے آہستہ آہستہ عذاب بڑھاتے جائیں گے ﴿۷۹﴾ اور یہ جو (چیزیں) بتاتا ہے، اس کے وارث ہم ہوں گے اور یہ اکیلا ہمارے سامنے آئے گا ﴿۸۰﴾ اور ان لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر معبود بنا لیے ہیں تاکہ ان کے لیے (اللہ کے پاس) وہ باعثِ عزت ہوں ﴿۸۱﴾ ہرگز نہیں! وہ (معبود) ان کی پرستش سے انکار کریں گے اور ان کے مخالف ہوں گے ﴿۸۲﴾

تفسیر و معارف

فرمایا: وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ ءَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾ انسان کیسی عجیب بات زبان پر لاتا ہے کہ جب میں مر جاؤں گا، گوشت پوست گل سڑ جائے گا، ہڈیاں خاک ہو جائیں گی اور کچھ بھی نہیں بچے گا تو کیا پھر سے میں زندہ کیا جاؤں گا؟ یعنی یہ اُسے بہت مشکل نظر آتا ہے کہ انسان دوبارہ کیسے زندہ ہو سکتا ہے اور کیسے پھر سے کھڑا کیا جائے گا!

انسان پیدا ہونے سے پہلے زیادہ منتشر تھا:

فرمایا: أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿٦٧﴾ کیا انسان یہ بات بھول گیا، اسے یہ یاد نہیں ہے کہ ہم نے اسے اس حال میں پیدا فرمایا کہ وہ کچھ بھی نہیں تھا، مادہ بھی نہیں تھا، اسے عدم سے وجود بخشا۔ اللہ کریم نے مادہ تخلیق کیا اور پھر اس مادے کو کتنے مرحلوں سے گزار کر، کہاں کہاں سے اس کے ذرّات جمع کر کے انسانی وجود ترتیب دیا، یہ وجود اسی کی تخلیق ہے۔ جب کچھ نہیں تھا تو اس نے بنا دیا۔ اب اگر یہ وجود مر بھی جائے، جل بھی جائے، یا اسے مٹی کھا جائے تو بھی مادے کی کوئی نہ کوئی صورت تو باقی رہے گی۔ مر کر یہ جتنا بھی فنا ہو گا جلا دیا گیا ہو، یا خاک بن جائے، سمندروں میں ڈوب جائے، مچھلیاں کھا جائیں یا درندوں کی غذا بن جائے پھر بھی مادے کی کوئی نہ کوئی شکل موجود ہو گی۔ جس نے خود مادے کو پیدا فرمایا اور اس مادے سے انسانی وجود کو تخلیق فرمایا، تو کیا وہ قادر پھر سے نہیں بنا سکے گا؟ یقیناً ایسا ہو گا۔

اعمال پر نتائج مرتب کرنا ربوبیت کا تقاضا ہے:

فرمایا: فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾
آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پروردگار کی قسم کہ ہم ان سب کو ضرور جمع کریں گے اور ان کے شیطانوں کو بھی ان کے ساتھ جمع کریں گے۔ یہاں اللہ کریم نے اپنی صفتِ ربوبیت کی قسم کھائی ہے کیونکہ ربوبیت کا تقاضا ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ عطا فرمائے۔ یہ صفتِ ربوبیت ہی ہے جو تخلیق کرتی ہے، پرورش کرتی ہے اور انجام تک پہنچاتی ہے اور انسان کے اعمال کا ایک حصہ، ایک نتیجہ دنیا میں دیتی ہے اور حتمی نتیجہ آخرت کو دے گی۔ یہاں اللہ کریم نے اپنی صفتِ ربوبیت کو اس بات پر شاہد قرار دیا ہے کہ جو عمل بھی کوئی کرتا ہے اللہ کی ربوبیت اسے اس کا نتیجہ عطا کرتی ہے سو تقاضائے ربوبیت ہے کہ اللہ کریم سب کو ضرور جمع کریں گے۔

قسم سے کیا مراد ہے؟

قسم سے مراد یہ ہے کہ جس کی قسم دی جائے اُسے اس بات پر گواہ کہا جاتا ہے، اس لیے شرعی قاعدہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی قسم نہ دی جائے۔ یہ رواج جو عام ہے کہ ماں کی قسم دی جاتی ہے یا کہا جاتا ہے تمہارے سر کی قسم یہ شرعاً غلط ہے۔ صرف اللہ کی قسم دی جاسکتی ہے کہ صرف وہی ہر چیز پر گواہ ہے۔

فرمایا، اللہ کی ربوبیت اس بات پر گواہ ہے کہ اللہ سب انسانوں کو ضرور جمع کریں گے اور اُن کے ساتھ اُن کے شیطانوں کو بھی جمع کریں گے۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ ہر پیدا ہونے والے انسان کے ساتھ ایک شیطان بھی پیدا ہوتا ہے اور وہ ساری زندگی اُس کے ساتھ رہتا ہے۔ یہاں انہی شیطانوں کا ذکر ہے کہ جمع کیے جائیں گے۔ کافر کی بدنصیبی یہ ہے کہ اللہ وہی شیطان اس پر مسلط کر دیتے ہیں، کفر کی وجہ سے وہ اس پر غالب آ جاتا ہے چونکہ شیطانوں کی عمریں ہزاروں برس ہوتی ہیں بندہ مرجائے تو جہاں اس کی خاک ہو، قبر ہو یا جلا دیں تو جہاں اس کے وجود کے ذرّات ہوں گے وہ شیطان وہیں بیٹھا رہتا ہے اور ساری عمر اس کا رابطہ کسی اور سے نہیں ہوتا۔

معیتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال:

اگر انسان کو نورِ ایمان نصیب ہو جائے، تو بھی یہ شیطان مومن کے ساتھ تو رہتا ہے مگر اللہ نورِ ایمان سے مومن کی مدد فرماتے ہیں اور مومن اس کا کہا نہیں مانتا، اور شیطان سے اس کا مقابلہ چلتا رہتا ہے۔ جب حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی تو عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ کے ساتھ بھی شیطان ہے؟ فرمایا میرے

ساتھ بھی تھا لیکن میرا شیطان مسلمان ہو گیا۔ کیسی عجب شانِ کریمی ہے کہ جو شیطان ساتھ تھا وہ بھی مسلمان ہو گیا! الحمدللہ ہم سب کا بھی دعویٰ ہے کہ ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے خادم ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں بلکہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے محبت کا بھی دعویٰ کرتے ہیں، عاشق ہونے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں، پھر ہم مسلمان کیوں نہیں بنے؟ معیتِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم کا کمال تو یہ ہے کہ شیطان کو معیت نصیب ہوئی تو وہ مسلمان ہو گیا تو پھر ہمیں بھی یہ سوچنا چاہیے اور اپنی مسلمانی کا جائزہ لینا چاہیے۔ اگر برکاتِ نبوت صلی اللہ علیہ وسلّم ہمیں نصیب ہیں تو ہمارے کردار سے، ہماری گفتار سے ہمارے ہر عمل سے نورِ اسلام ہویدا ہونا چاہیے اس لیے کہ وہاں تو کرم کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

انسانوں کی نسبت شیاطین وجنات کی تعداد:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ارشادِ عالی کے مطابق انسانوں سے نو گنا زیادہ جنات ہیں اور جنات سے نو گنا زیادہ شیاطین ہیں، گویا شیاطین کے تو لشکر پھر رہے ہیں اور ایک وہ بھی شیطان ہے جو ہر بندے کے لیے خاص ہوتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے اس ارشادِ عالی کو بھی ساڑھے چودہ سو سال بیت گئے، اس عرصے میں انسانی آبادی میں کتنا اضافہ ہوا تو جنات اور شیاطین بھی تعداد میں کتنے بڑھ چکے ہوں گے اور شیاطین کے بے شمار لشکروں سے فضا بھری ہوئی ہے، ایک ایک بندے کے ساتھ متعدد لگے ہوئے ہوتے ہیں۔

زیر بحث آیۂ مبارکہ میں جس شیطان کا تذکرہ ہے یہ وہ ہے جو ہر بندے کے ساتھ مستقل طور پر ساری زندگی رہتا ہے تو فرمایا: آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے پروردگار کی قسم ہم ان سب کو جمع کریں گے اور ان کے ساتھی شیاطین کو بھی۔ فرمایا: لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾ یعنی کفار کو اور ان کے شیاطین کو اس حال میں لایا جائے گا کہ جہنم کے گرد وہ گھٹنوں کے بل پڑے ہوں گے اُن میں کھڑے ہونے کی بھی سکت نہیں ہوگی۔

اللہ کی رحمانیت سے سرکشی کرنے والے:

فرمایا: ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾ پھر ہم ہر گروہ سے ضرور پوچھیں گے کہ تم میں سے کون رحمٰن کا سرکش ہے اور کتنی سرکشی کر سکتا ہے؟ ذرا اب سرکشی کر کے تو دکھائے، اور جو دعوے دنیا میں کرتے تھے اب کوئی دعویٰ ہی کر کے دکھائے۔ اللہ تو دنیا میں رحمٰن تھے، تمہیں ہر طرح کی نعمتیں دیتے تھے، تمہیں زندگی عطا کی، وجود عطا کیا، مال و دولت دیا، اولاد عطا کیں، عزت وعہدے عطا کیے تو اللہ تو تمہارے لیے رحمٰن تھے۔ اللہ کریم کی صفتِ رحمت رحمانیت کے انداز میں دنیا میں ہر ایک کے لیے عام ہے لہٰذا کافر کو بھی تمام مادی نعمتیں نصیب ہوتی ہیں۔ رحمانیت دنیا کے لیے ہے لہٰذا مومن کو، کافر کو سب کو کھانا، پانی، لباس گھر بار اور اولاد وغیرہ مل رہا

ہے۔ جو کفر و شرک کرتا ہے اُسے بھی مل رہا ہے اور جو توحید پر قائم ہے اسے بھی مل رہا ہے لیکن جب یہ دنیا ختم ہو جائے گی تو قیامت کو اللہ کی رحمت کا ظہور رحیمیت سے ہوگا اور وہاں اللہ الرَّحِیْمِ ہوں گے مومن کو اُخروی نعمتیں نصیب ہوں گی اور نافرمانوں کو عذاب جہنم ملے گا۔ دنیا میں انہوں نے اپنے لیے یہی راستہ پسند کیا تھا۔ فرمایا، اللہ تمہارے لیے دنیا میں رحمٰن تھے، اس کی عطا کا دروازہ وا تھا اور بے شمار نعمتیں تمہیں عطا کر رکھی تھیں جو تم استعمال کر رہے تھے؟ ان سے پوچھا جائے گا جو ان کے سربراہ یا لیڈر بنے ہوئے تھے اور اللہ کے دین کے خلاف سرگرمِ عمل رہے اور گستاخیاں کرتے رہے کہ تم رحمٰن کے بے شمار انعامات سے تو بہرہ ور ہوتے رہے، اب کہو کیا حال ہے جبکہ جہنم کے گرد گھٹنوں کے بل گرے ہوئے ہو، اب ذرا کوئی کھڑا ہو کر اعلان کرے کہ میں اللہ کے خلاف ہوں، اللہ کے دین کے خلاف ہوں یا توحید کا انکار کرتا ہوں۔ اب ذرا اٹھ کر دکھاؤ، ذرا اکڑ کے دکھاؤ۔

لفظ 'شیعہ':

قرآن کریم میں لفظ 'شیعہ' غالباً آٹھ مقامات پر آیا ہے۔ شیعہ کا لفظی مطلب ہے 'گروہ'، جیسے کوئی ہم خیال طبقے کے گروہ ہوتے ہیں لیکن قرآن کریم کی اصطلاح میں شیعہ صرف اُن گروہوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو قطعاً کافر تھے، گمراہ تھے لیکن اپنے آپ کو حق پر سمجھتے تھے، ہدایت یافتہ سمجھتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ جو ہم کہتے ہیں وہی حق ہے۔

اللہ کریم کا علم ازلی ہے:

فرمایا: ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِيْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِيًّا ۝ ہم ان لوگوں سے خوب واقف ہیں جو جہنم میں داخل ہونے کے ہی قابل ہیں، جو اسی لائق ہیں کہ انہیں جہنم میں ہی دھکیلا جائے اور وہ سزائیں بھگتتے رہیں۔ اللہ اس بات کے محتاج نہیں ہیں کہ یہ لوگ قیامت کو اٹھ کر بتائیں کہ ہم سرکشی کرتے تھے یا نہیں بلکہ اللہ کریم کا علم تو ازلی ہے۔ یہ سوال تو ان گروہوں کی جرأت کا اندازہ کرنے کے لیے ہوگا کہ اب تو معاملات سامنے آگئے، حقیقت واضح ہو گئی اور جو باتیں اللہ کے نبی اور رسولؐ فرماتے تھے، جو باتیں کتاب اللہ میں تھی سب سچ ہو گئیں دنیا میں تم ان سب کی تردید کرتے رہے، تم دنیا میں ان کے مقابلے میں اکڑتے رہے تو آج وہ سب باتیں سچ ہو گئیں، آج اکڑ کر دکھاؤ۔ آج تو جہنم تمہارے سامنے ہے اور تم جہنم کے گردا گرد گھٹنوں کے بل گرے پڑے ہو تو اب جرأت کرو انکار کرنے کی، اب ذرا بتاؤ کہ تم کتنے مضبوط ہو۔ اللہ کریم محتاج نہیں ہیں کہ کوئی بتائے گا تو جانیں گے، فرمایا ہم خود جانتے ہیں کہ کون لوگ دوزخ کے زیادہ مستحق ہیں، اس قابل ہیں کہ انہیں دوزخ میں رکھا جائے۔

ہر انسان کو دوزخ کے اوپر سے گزرنا ہوگا:

فرمایا: وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾ ورنہ تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جسے دوزخ پر سے گزرنا نہ پڑے۔ ہر انسان کو پل صراط سے گزرنا ہوگا جو دوزخ کے اوپر ہے۔ یہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے رب کا لازم، حتمی اور مقرر کردہ فیصلہ ہے کہ ہر انسان دوزخ کے اوپر سے ایک دفعہ گزرے گا۔

اس کی تفصیل احادیثِ مبارکہ میں اس طرح سے بیان ہوئی ہے کہ لوگ میدانِ حشر میں جمع ہوں گے، پھر ان کے اعمال کا حساب ہوگا اور نیکیاں اور گناہ میزانِ عدل پر تولے جائیں گے پھر اس کے بعد پل صراط سے گزرنا ہوگا جس کے آگے اعراف ہوگا، اور اعراف سے آگے جنّت ہوگی۔ جب لوگ پل صراط سے گزریں گے تو کچھ ہستیاں ہوں گی جو بجلی کی طرح گزر جائیں گی، کچھ افراد ایسے ہوں گے جو گھوڑے کی رفتار سے گزر جائیں گے، کچھ پیدل چل کر گزر جائیں گے اور کچھ گرتے پڑتے گزر جائیں گے لیکن کافر پل پر قدم بھی رکھے گا تو جہنم کے کنارے جائے گا تو گرِ جائے۔ کیونکہ کافر ایمان سے خالی ہے لہٰذا جہنم میں گر جائے گا۔ جن لوگوں میں ایمان تو ہے لیکن اعمال کافی نہیں ہیں تو جہاں تک نیکیاں ساتھ دیں گی اتنا وہ پل پر چلتا جائے گا، جہاں نیکی ختم ہو جائے گی وہاں وہ گر جائے گا اور نیچے جہنم ہے، اب اسے وہاں سے پیدل نکلنا ہے، گزرنا ہے، اس پر کتنی صدیاں لگیں گی یہ اللہ کریم ہی بہتر جانتے ہیں۔ گویا نورِ ایمان ہوگا تو جہنم سے بالآخر نکل جائے گا۔

حدیث شریف میں ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ ایک شخص پل صراط پر ہوگا، کبھی چلے گا کبھی لڑکھڑا جائے گا، گرے گا نہیں، چمٹا رہے گا اور گرتا پڑتا بالآخر دوسرے کنارے تک پہنچ جائے گا وہاں بیٹھا ہوگا، نیچے جہنم نظر آرہی ہو گی اور دور جنت ہوگی۔ وہ دعا کرے گا کہ اے اللہ! میں اور کچھ نہیں مانگوں گا بس اتنی مہربانی فرما، مجھے دوزخ سے دور کردے اور دوسرے کنارے تک پہنچا کر جنّت سے قریب کردے۔ ارشاد ہوگا کہ اے انسان! تُو غلط کہتا ہے کہ پھر نہیں مانگے گا، تُو مانگنے سے باز نہیں آئے گا، میں تیری آرزو پوری کرتا ہوں۔ اللہ کریم اُسے دوزخ سے دور کر دیں گے۔ پھر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد وہ پھر دعا کرے گا کہ اے اللہ! آپ نے بڑا کرم کیا، مجھے دوزخ سے دور کیا تو مہربانی فرما کر مجھے جنّت کے قریب کردے پھر میں اور کچھ نہیں مانگوں گا۔ پھر ارشاد ہوگا کہ تُو جھوٹ بول رہا ہے۔ تُو پھر مانگے گا لیکن میں تیری دعا قبول کرتا ہوں، اور اسے جنّت سے قریب کردیا جائے گا۔ کچھ عرصہ گزرے گا تو وہ پھر ہاتھ اٹھائے گا کہ یا اللہ! اتنی وسیع جنّت ہے، اس کی وسعت کی تو کوئی سمجھ ہی نہیں آتی کہ کہاں سے شروع ہوتی ہے، کہاں ختم ہوتی ہے، تو یہ جو ایک درخت دیوار پر سے نظر آرہا ہے مجھے جنّت کی حد میں یہ ایک درخت عطا کردے، اتنی مجھے سر

چھپانے کی جگہ دے پھر میں اور کچھ نہیں مانگوں گا۔ ارشاد ہوگا تو ہر بار یہ دہراتا ہے کہ اور نہیں مانگوں گا لیکن میں تیری دعا قبول کرتا ہوں یہ درخت میں تجھے عطا کرتا ہوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اس درخت کے نیچے ستر ہزار محل ہوں گے اسی کے مطابق خادم اور کنیزیں اور جنت کی نعمتیں ہوں گی۔

نجات کا مدار تقویٰ پر ہے:

فرمایا، ویسے تو ہر انسان، مومن و کافر کو پل صراط پر سے گزرنا ہوگا، جہنم پر سے گزرنا ہوگا: ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ۝ تو جن لوگوں نے اللہ کا تقویٰ اختیار کیا، اللہ سے تعلق استوار کیا اور خلوصِ دل سے اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کی اُن کو اللہ کریم پار پہنچا دیں گے، اُن کو نجات دے دیں گے۔ وہ پل صراط سے خیر و عافیت کے ساتھ گزر جائیں گے اور جنت میں چلے جائیں گے۔ لیکن جنہوں نے ظلم کیا، شرک کیا، کہ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لُقمٰن:13) سب سے بڑا ظلم اللہ کے ساتھ شرک کرنا ہے، جن کی عمریں شرک و کفر میں اور اللہ کی نافرمانی میں بسر ہو گئیں انہیں جہنم میں ہی رہنے دیں گے، وہیں پڑے رہیں گے۔

دولتِ دنیا کا کوئی اعتبار نہیں:

فرمایا: وَإِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّاَحْسَنُ نَدِيًّا ۝ جب اللہ کی آیات جو واضح اور کھلی ہیں ان پر پڑھی جاتیں ہیں تو کافر مومنین سے کہتے ہیں کہ ذرا دیکھو ہم میں سے زیادہ خوشحال کون ہے، تم یا ہم؟ ہمارے پاس مال و دولت ہے اولاد ہے، عہدے ہیں، مرتبے ہیں تو اگر تم اللہ کے مقرب ہوتے تو یہ نعمتیں تمہارے پاس زیادہ ہوتیں۔ اگر تم حق پر ہوتے، تم اللہ کے پیارے ہوتے تو تمہارے پاس دولت ہوتی، تم تو ہم سے کمتر ہو کہ تمہارے پاس قوت بھی ہم سے کم ہے اور دولت بھی ہم سے کم ہے۔ کافر کہتے ہیں کہ دیکھو کون سا شخص خوشحال ہے، اچھے مقام پر ہے اور کس کی محفل میں خوشحال لوگ مرتبے والے لوگ بیٹھتے ہیں؟ کفار دنیا کی خوشحالی کو بہت خوبی اور کمال سمجھ رہے ہیں تو انہیں بتایئے کہ دولتِ دنیا کا کوئی اعتبار نہیں۔ دنیا کا مل جانا اللہ کی رضا کی دلیل نہیں ہے۔ اللہ ایمان عطا کرے، اعمال صالح ہوں حلال رزق سے دنیا کی نعمتیں ملیں تو یہ اللہ کا انعام ہے۔ ناجائز ذرائع سے، چوری، ڈاکے سے یا کفر و شرک کر کے دنیا جمع ہو جائے تو وہ مزید عذاب کا سبب ہے لہٰذا دنیا کا اعتبار نہیں کہ تم سے پہلے کتنے لوگ جو نمود و نمائش میں زیادہ تھے ہلاک کر دیئے گئے۔ فرمایا: وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ۝ ذرا اپنے سے پہلے گزرے ہوئے کافروں کا انجام تو دیکھو، جن کے پاس بڑے لاؤ لشکر

اور حکومتیں تھیں۔ فرعون، نمرود اور شداد جیسے مطلق العنان بادشاہ جنہوں نے خدائی دعوے کیے اور لوگوں سے سجدے کروائے، آج وہ لوگ کہاں ہیں؟ اُن کے لاؤلشکر اور فوجیں اُن کے کس کام آئیں، اُن کی دولت اور خوشحالی نے کیا فائدہ دیا، ہم نے اُن کو ہلاک کر دیا، تباہ کر دیا، لہٰذا دنیا کا اعتبار نہیں تم سے پہلے تم سے زیادہ طاقتور، نمود و نمائش میں زیادہ اچھے اور تم سے زیادہ دولت مند لوگ انجامِ کار ہلاک ہوئے۔

دنیا میں کافر بھی بعض نیکی کے کام کرتے ہیں مثلاً ہسپتال بنا دیتے ہیں، کنویں بنوا دیتے ہیں، سڑکیں بنوا دیتے ہیں، خیرات کرتے ہیں، لوگوں کی مدد کرتے ہیں تو اللہ کریم کسی کی نیکی ضائع نہیں فرماتے بلکہ بصورتِ دولتِ دنیا کافروں کو لوٹا دیتے ہیں۔ چونکہ کافر آخرت پر ایمان نہیں رکھتا لہٰذا وہ دنیا کے لیے ہی کام کرتا ہے، یا وہ شہرت کا طالب ہوتا ہے یا جان و مال کے نقصان سے بچنے کے لیے کرتا ہے۔ اللہ کریم اتنی رعایت فرماتے ہیں کہ کافر کو وہ چیزیں دنیا میں عطا کر دیتے ہیں جس غرض سے وہ نیکی کا کام کرتا ہے تو عموماً کافروں کے پاس اس اعتبار سے دنیا زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن جب آنکھ بند ہو گی تو دنیا تو رہ جائے گی آخرت میں اس کے لیے کچھ نہیں ہو گا۔

مسلسل گناہ کرنے کا نتیجہ:

فرمایا: قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۔۔۔ ان سے فرما دیجیے کہ جو شخص زیادہ گمراہی میں پڑ جائے، اللہ جو رحمٰن ہیں اسے مہلت دے دیتے ہیں اور وہ آہستہ آہستہ گناہ میں آگے بڑھتا رہتا ہے۔ یہ بھی ابتلاءِ الٰہی ہے کہ انسان گناہ کرتا رہے، کفر کرتا رہے اور اس پر کوئی گرفت نہ ہو۔ کافر پر جو اللہ کی طرف سے گرفت آتی ہے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ ہو سکتا ہے اس کی وجہ سے وہ توبہ کرے، اس کو خیال آ جائے کہ میں کمزور ہوں، فانی ہوں اور اللہ قادر ہے اس کی گرفت بڑی ہے۔ مگر بدنصیبی یہ ہوتی ہے کہ کافر کو یہ بھی سمجھ نہیں آتی اور وہ کفر اور گناہ میں آگے ہی بڑھتا چلا جاتا ہے۔ فرمایا اللہ کا یہ عجیب نظام ہے، اللہ رحمٰن ہے اور کافر کو، برائی کرنے والے کو آہستہ آہستہ مہلت دیے رکھتا ہے۔

مومن پر کسی گناہ کے سبب گرفت آتی ہے تو اُسے توبہ نصیب ہو جاتی ہے، وہ اللہ سے ڈرتا ہے رجوع الی اللہ کرتا ہے اور اس برائی کو چھوڑ دیتا ہے۔

اللہ کریم کافر کی رسی ڈھیلی کرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ وہ وقت آ جاتا ہے، نزع کا عالم آ جاتا ہے، موت کا وقت آ جاتا ہے۔ فرمایا: حَتّٰى إِذَا رَأَوْا مَا يُوعَدُونَ إِمَّا الْعَذَابَ وَإِمَّا السَّاعَةَ ۚ فَسَيَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّأَضْعَفُ جُنْدًا ۝ زندگی ختم ہو جاتی ہے، برزخ کھل جاتا ہے اور ہر چیز ان کے سامنے آ جاتی ہے۔ اس

وقت توبہ کی فرصت نہیں رہتی، موت کے فرشتے نظر آتے ہیں اور یہ فرشتے کافروں سے بھی بات کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں آتا ہے کہ فرشتے کافر کی جان قبض کرتے ہوئے اس سے سوال کرتے ہیں: فِيمَ كُنتُمْ ۔۔۔(النسآء:97) تم کیا کرتے رہے ہو، تم نے تو سارا کفر، ساری غلاظتیں، ساری نحوستیں جمع کرلیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب دیکھنے والا کہتا ہے کہ مرنے والے کی نظر رک گئی ہے یا چھت سے لگ گئی ہے دراصل وہ فرشتوں سے بات کررہا ہوتا ہے۔ جب اُدھر کچھ نظر آتا ہے تو پھر نظر اِدھر پھرتی ہی نہیں، تو کافر فرشتوں کو جواب میں کہے گا: قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ۔۔۔ ہم غریب لوگ تھے، کمزور لوگ تھے، جدھر بڑے لوگ چلتے رہے یا جدھر معاشرہ لے گیا ہم بھی چلتے رہے۔ فرشتے کہتے ہیں: قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا (النسآء:97) تم وہاں سے نکل کیوں نہ گئے، بدکاروں کا ساتھ چھوڑ دیتے، ایسی جگہ چلے جاتے جہاں اچھے لوگ تھے۔ آج تو دنیا چھوڑ کر جارہے ہو اُس وقت تو صرف گھر چھوڑنا تھا یا ملازمت چھوڑنا تھی تو چاہیے تھا کہ آج کے دن کے لیے سامان کرتے بدکاروں کو چھوڑ کر نیک لوگوں کے پاس چلے جاتے۔ یہ باتیں بندہ زندہ ہوتا ہے تو موت کے فرشتے اس سے کررہے ہوتے ہیں۔ فرمایا، اس وقت اُسے سامنے برزخ میں جہنم بھی نظر آرہا ہوتا ہے، عذاب بھی نظر آرہے ہوتے ہیں اور فرشتے بھی بہت ڈراؤنے ہوتے ہیں، ان کے پاس جہنم کا لباس، جہنم کے گرز اور جہنم کی زنجیریں ہوتی ہیں۔ جب عذابِ جہنم اور قیامت کا منظر دکھائی دے گا تب انہیں سمجھ آئے گی کہ کس کا مرتبہ بہت کم تھا، بہت نیچا تھا، بہت بُرا درجہ تھا اور کس کا مقام اچھا تھا، کس کے ساتھ اللہ کی نصرت تھی کون طاقتور تھا اور کون کمزور تھا! اس وقت سمجھ آئے گی کہ کس کے ساتھ اللہ کے فرشتے کھڑے ہو گئے ہیں اور اُسے عزت واحترام سے جنت کے لباسوں میں، جنت کی خوشبوؤں میں اور جنت کے پھولوں میں لپیٹ کر لے جایا جارہا ہے اور کون ذلیل ہورہا ہے، رسوا ہورہا ہے، کس کو مارا پیٹا جارہا ہے، کس پر عذاب وارد ہورہا ہے!

ایمان بالغیب ہی نجات کا باعث ہے:

جب زندگی ختم ہوجاتی ہے تو برزخ کھل جاتا ہے، ہر چیز سامنے آجاتی ہے اور توبہ کی فرصت ختم ہوجاتی ہے۔ جب فرعون کو بھی غوطے آئے اور موت کے فرشتے نظر آئے، برزخ نظر آیا، دہکتا ہوا دوزخ نظر آیا تو اس نے بھی کہا کہ میں موسیٰؑ اور ہارونؑ کے ربّ کو مانتا ہوں، میں مسلمان ہوتا ہوں تو فرمایا، اب مسلمان ہوتا ہے، برزخ منکشف ہوگیا، دوزخ اور عذاب کو دیکھ کر مسلمان ہوتا ہے! جب میرے نبیؑ پیغام دیتے تھے تو تُو کفر پر اکڑتا تھا۔ میرے نبیؑ کے کہنے پر مسلمان ہوتا تو بات بنتی، ایمان بالغیب چاہیے تھا، اب وہ وقت گزر گیا لہٰذا اب تیری توبہ قبول نہیں ہوگی۔

تیرے وجود کو سمندر سے باہر نکال کر پھینک دیا جائے گا اور آنے والی نسلوں کے لیے صدیوں تک سامانِ عبرت بنا دیا جائے گا۔ تیری لاش کو لوگوں کے لیے عبرت بنا کر رکھیں گے کہ یہ بھی اپنے آپ کو خدا کہلواتا تھا، لوگوں سے خود کو سجدے کرواتا تھا، اس کے پاس بہت بڑی سلطنت، بہت زیادہ دولت تھی بہت خزانے اور لاؤ لشکر تھا، اب اس کا انجام دیکھو کیا ہوا!!

وقتِ نزع نیک لوگوں پر اللہ کا انعام:

فرمایا: وَيَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ۔۔۔ اللہ اتنے کریم ہیں کہ جو بھی اللہ پر ایمان لا کر اللہ کا اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا دامن تھام لیتا ہے تو وہ ایک نیکی کرتا ہے اللہ کریم اسے مزید دس نیکیوں کی توفیق دے دیتے ہیں۔ دنیا میں مومن کو ہر نیکی کا صلہ یہ دیا جاتا ہے کہ مزید نیکی کی توفیق دی جاتی ہے اور نیکی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ جب وقتِ نزع آتا ہے تو اللہ کریم بندے کی نیکیاں بڑھانا شروع کر دیتے ہیں اور ان کا مقام و مرتبہ نزع سے لے کر آگے تک پہلے سے زیادہ بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ جو لوگ ہدایت پر ہیں، اللہ ان کی ہدایت زیادہ کرتے جاتے ہیں۔

نیکی کیا ہے؟

فرمایا: وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ مَّرَدًّا ۝ اور باقی رہنے والی تو نیکیاں ہیں جو آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پروردگار کے نزدیک بہت بہتر ہیں، بدلے میں بھی اور انجام میں بھی۔ نیکی کیا ہے؟ نیکی کا ایک ہی سادہ سا معیار ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا ہر کام نیکی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی کام، خواہ بظاہر کتنا خوبصورت نظر آئے اور کتنے لوگ اس پر جمع ہو جائیں جو کام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے خلاف ہے وہ بدی ہے۔

نیکی اور بدی کا معیار آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیبہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہے۔ جن چیزوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند فرمایا، وہ سب نیکی ہے اس کے باہر کوئی نیکی نہیں۔ نیکی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی حدود کے اندر ہے اور فرمایا نیکی میں یہ کمال ہے کہ نیکیاں بہترین چیز ہیں اور یہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں، پھر ان میں بڑھوتری ہوتی رہتی ہے، زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ ہر نیکی کا ثواب بڑھا کر دیا جاتا ہے۔ بندہ نیکی کرتا ہے تو اپنی حیثیت کے مطابق کرتا ہے، لیکن اجر اللہ کریم اپنی شان کے مطابق عطا فرماتے ہیں۔ اور نیکی میں زیادتی ہوتی چلی جاتی ہے۔ ظلم، گناہ یا شرک جو کسی نے کیا ہو، اللہ اس برائی کا ہی عذاب دیں گے اُسے بڑھائیں گے نہیں، لیکن نیکی کرنے والوں کی نیکیاں خوب بڑھا کر اجر و انعام دیں گے۔ نیکی

متعدی ہوتی ہے، اس میں زیادتی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی طرح دنیا میں گناہ بھی متعدی ہوتا ہے، ایک گناہ کرنے سے شاید بندہ مزید دس گناہ اور کر لے۔ سوفرمایا باقی رہنے والے نیک کام بہت بہترین ہیں اللہ کریم کے پاس، اجر میں بھی، بدلے اور انجام کے لحاظ سے بھی۔

بُرائی کا انجام بھلا نہیں ہوتا:

فرمایا: اَفَرَءَيْتَ الَّذِىْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَقَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّوَلَدًا ﴿۷۷﴾ ذرا اس کو دیکھو جو اللہ کی آیات سے کفر کرتا ہے، اللہ کے دین کا، اللہ کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا، اللہ کی کتاب کا انکار کرتا ہے اور کہتا ہے مجھے بہت مال بھی ملے گا، اولاد بھی ملے گی اور میں ہمیشہ خوشحال رہوں گا۔

فرمایا: اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾ کیا اس نے غیب کی خبر پالی ہے کہ کفر کرنے سے وہ دولتمند ہو جائے گا، یا اس نے اللہ رحمٰن سے کوئی وعدہ لے رکھا ہے کہ یہ کفر اور نافرمانی کرے گا اور اس کے جواب میں اللہ اسے انعام دے گا؟ فرمایا: كَلَّا ۔۔۔ ہرگز ایسا نہیں ہوگا کہ برائی کا انجام کبھی بھلا نہیں ہوتا۔ ایسا ہونا ناممکن ہے۔ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾ جو باتیں یہ کر رہا ہے وہ لکھی جا رہی ہیں۔ اعمال کے ساتھ ساتھ باتوں کا بھی حساب ہوگا کہ تم نے اللہ کی عظمت کے خلاف یہ الفاظ منہ سے نکالے، اب جواب دو کہ کیوں ایسا کہا تھا؟ اس کردار اور گفتار کے ساتھ یہ سمجھ رہا ہے کہ مجھے بہت مہلت ملی ہوئی ہے اور میں بہت عیش کر رہا ہوں، بہت موج اڑا رہا ہوں۔ فرمایا جس طرح تم موج کر رہے ہو اسی طرح تمہارا عذاب بھی آہستہ آہستہ بڑھتا جا رہا ہے جسے تم بڑی موج سمجھ رہے ہو، وہ تمہارے لیے بہت بڑی مصیبت بن رہی ہے کہ تمہارے کردار کے ساتھ تمہارے لیے عذاب بھی بڑھتا جا رہا ہے۔

اللہ تمام جہانوں کا وارث ہے:

فرمایا: وَنَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَيَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾ یہ جتنی چیزیں تم کہتے ہو کہ مجھے دولت ملے گی، حکومت ملے گی، سلطنت ملے گی یہ ساری تو ہماری ملکیت ہیں تمہارا کچھ بھی نہیں ہے۔ ان سب چیزوں کے وارث ہم ہیں، تمہیں تو چند روز کے لیے اس کا کوئی جز عطا کر دیتے ہیں۔ زمین و آسمان کی بادشاہت تو ہماری ہے، ساری مخلوق ہماری ہے، سب خزانے ہمارے ہیں اور ہم اس کے وارث ہیں۔ اس کا کوئی چھوٹا سا حصہ تمہیں دے دیتے ہیں، تم اس پر اکڑ جاتے ہو حالانکہ تمہیں وہ بھی واپس دے کر جانا ہے کہ مال تو ہمارا ہے، تمہارا تو نہیں ہے۔

اللہ کی بارگاہ میں اکیلے حاضر ہونا ہے:

فرمایا: وَيَأْتِينَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾ تمہیں تو اکیلے میری بارگاہ میں آنا ہے نہ تمہارے پاس تخت و تاج ہوگا نہ ہی لاؤ لشکر ہوں گے۔ تمہارا مال اور تمہاری اولاد بھی ساتھ نہ دے گی اور ہر فرد اپنا اپنا حساب دے گا۔ سب کو اکیلے اکیلے اس بارگاہ میں حاضر ہونا ہے۔ بادشاہ اور فقیر سب وہیں ہوں گے اور سب ایک قطار میں کھڑے ہوں گے اور سب اپنا اپنا حساب دیں گے۔

عزت واحترام صرف توحید کے اقرار میں ہے:

فرمایا: وَاتَّخَذُوا مِنْ دُونِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُونُوا لَهُمْ عِزًّا ﴿۸۱﴾ اور یہ لوگ ایسے بد بخت ہیں کہ یہ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کی پوجا کرتے ہیں۔ اللہ کے علاوہ دوسروں کو الٰہ اور معبود بنا لیتے ہیں، اپنا کارساز بنا لیتے ہیں تا کہ ان کی عزت میں اضافہ ہو۔ اللہ کی اطاعت نہیں کرتے لیکن اُمرا کے دروازے پر سجدے کرتے ہیں کہ اس سے ان کی بڑی عزت ہوگی۔ حکمرانوں کے دروازے پر سجدے دیتے ہیں۔ بتوں کو اپنا حاجت روا سمجھ لیتے ہیں۔ قبروں کو پوجنا شروع کر دیتے ہیں اور یہ سب اس امید پر کرتے ہیں کہ اس سے عزت واحترام ملے گا۔

اللہ کے علاوہ جب کسی کی اطاعت اس امید پر کی جائے کہ اس سے میرا بھلا ہوگا، میری عزت میں مال و دولت میں اضافہ ہوگا تو یہ اطاعت عبادت ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہاتھ باندھ کر رکوع سجود کریں گے تب عبادت ہوگی۔ اگر غیر اللہ کی اطاعت نفع کی امید پر کرنا عبادت ہے تو دیکھنا ہوگا کہ آج کتنے لوگ توحید پر کھڑے ہیں اور کتنے ہیں جو دنیاداروں کے دروازے پر سجدے کر رہے ہیں۔ دوسروں کی فکر اللہ کے سپرد کر کے ہر انسان کو اپنا جائزہ لینا چاہیے کہ وہ اللہ کی کتنی اطاعت کرتا ہے اور کتنی غلامی بندوں کی کرتا ہے۔ اپنے کردار کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔

فرمایا، یہ لوگ اللہ کے علاوہ اور معبود بنا لیتے ہیں کہ ان کی پوجا سے یہ محترم بن جائیں گے معزز بن جائیں گے لیکن کیا ایسا ہوگا؟ فرمایا: كَلَّا ہرگز ایسا نہیں ہوگا: سَيَكْفُرُونَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُونُونَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿۸۲﴾ بلکہ یہ لوگ جن کی پوجا کرتے تھے وہ ان کی پوجا کا ہی انکار کر دیں گے کہ یا اللہ! ہمیں تو خبر ہی نہیں کہ یہ کہاں سجدے کرتے رہے اور جو ان کے دل میں تھا وہ ہمیں معلوم ہی نہیں تھا۔ حشر کے دن وہ سب معبود ان لوگوں کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان کی مخالفت کریں گے۔ جن کی پوجا نفع اور عزت کی امید پر کرتے رہے وہی معبود ان کے خلاف گواہی دیں گے کہ یہ تو گمراہ لوگ تھے، ہم ان کی عبادت کا انکار کرتے ہیں اور ہم تو جانتے ہی نہیں تھے کہ یہ ہماری عبادت کرتے تھے۔ آج یہ بد بخت ہمیں بھی مروانا چاہتے ہیں، یہ معبود خواہ پتھر کے بت ہوں یا کوئی زندہ وجود سب اپنی عبادت کرنے والوں کے خلاف شہادت دیں گے۔

سورۃ مریم رکوع 6 آیات 83 تا 98

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَی الْکٰفِرِیْنَ تَؤُزُّھُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾ فَلَا تَعْجَلْ
عَلَیْھِمْ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَھُمْ عَدًّا ﴿۸۴﴾ یَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِیْنَ اِلَی الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۵﴾
وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِیْنَ اِلٰی جَھَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾ لَا یَمْلِکُوْنَ الشَّفَاعَۃَ اِلَّا مَنِ
اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَھْدًا ﴿۸۷﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ
شَیْئًا اِدًّا ﴿۸۹﴾ تَکَادُ السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرْنَ مِنْہُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ
الْجِبَالُ ھَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ وَمَا یَنْۢبَغِیْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ یَّتَّخِذَ
وَلَدًا ﴿۹۲﴾ اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾ لَقَدْ
اَحْصٰھُمْ وَعَدَّھُمْ عَدًّا ﴿۹۴﴾ وَکُلُّھُمْ اٰتِیْہِ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰہُ
بِلِسَانِکَ لِتُبَشِّرَ بِہِ الْمُتَّقِیْنَ وَتُنْذِرَ بِہٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾ وَکَمْ اَھْلَکْنَا
قَبْلَھُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ ھَلْ تُحِسُّ مِنْھُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَھُمْ رِکْزًا ﴿۹۸﴾

کیا آپ کو معلوم نہیں کہ بے شک ہم نے شیاطین کو کفار پر چھوڑ رکھا ہے وہ ان کو
(گمراہی پر) خوب ابھارتے رہتے ہیں ﴿۸۳﴾ سو آپ ان کے بارے میں
جلدی نہ کیجیے یقیناً ہم ان کی باتیں (دن) خود شمار کر رہے ہیں ﴿۸۴﴾ جس روز ہم
متقیوں (پرہیزگاروں) کو رحمٰن کے ہاں بطور مہمان جمع فرمائیں گے ﴿۸۵﴾ اور
مجرموں کو دوزخ کی طرف (پیاسا) ہانکیں گے ﴿۸۶﴾ تو لوگ کسی کی سفارش کا

اختیار نہ رکھیں گے مگر ہاں جس نے رحمٰن سے عہد (اجازت) حاصل کیا ہو ﴿۸۷﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ رحمٰن (اللہ) بیٹا رکھتے ہیں ﴿۸۸﴾ (ایسا کہنے والو!) بے شک تم نے بہت بری بات کہی ہے ﴿۸۹﴾ قریب ہے اس (افتراء) سے آسمان پھٹ پڑیں اور زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑیں ﴿۹۰﴾ اس بات سے کہ یہ لوگ رحمٰن کی طرف اولاد کی نسبت کرتے ہیں ﴿۹۱﴾ اور رحمٰن کی یہ شان نہیں کہ کسی کو بیٹا بنائے ﴿۹۲﴾ جو کوئی بھی آسمانوں یا زمین میں ہے سب رحمٰن کے روبرو بندے (غلام) ہو کر حاضر ہوں گے ﴿۹۳﴾ یقیناً اس نے سب کو (اپنی قدرت سے) احاطہ کر رکھا ہے اور سب کو شمار کر رکھا ہے ﴿۹۴﴾ اور قیامت کے دن سب اس کے پاس اکیلے اکیلے حاضر ہوں گے ﴿۹۵﴾ بے شک جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیے رحمٰن (اللہ) ان کے لیے (مخلوق کے دلوں میں) محبت پیدا فرما دیں گے ﴿۹۶﴾ پس یقیناً ہم نے اس (قرآن) کو آپ کی زبان میں آسان فرمایا ہے تاکہ اس سے آپ پرہیزگاروں کو خوش خبری پہنچائیں اور جھگڑا کرنے والوں کو اس کے ذریعے (انجامِ بد) سے ڈرائیں ﴿۹۷﴾ اور ہم نے ان سے پہلے بہت سے گروہوں کو ہلاک کر دیا ہے بھلا آپ ان میں سے کسی کو دیکھتے ہیں یا ان کی کوئی بھنک سنتے ہیں؟ ﴿۹۸﴾

تفسیر و معارف

کافر پر شیاطین کا تسلط:

فرمایا: اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّیٰطِیْنَ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿۸۳﴾ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) دیکھتے ہیں کہ ہم کافروں پر شیطانوں کو مسلط کر دیتے ہیں اور وہ انہیں مزید گمراہی پر ابھارتے رہتے ہیں، اور مزید گناہوں میں دھکیلتے رہتے ہیں۔ کفر اختیار کرنا بہت ہی بڑی بدنصیبی ہے کہ اللہ کریم کافر کو شیطانوں کے حوالے کر دیتے ہیں اور وہ زندگی بھر اس سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ہر گناہ کا ردِعمل دل کی پریشانی کی صورت میں اس پر وارد ہوتا رہتا ہے

اوراس کی دنیا بھی جہنم نما بن جاتی ہے۔ کفر کی یہ ایک مصیبت ہی کافی ہے کہ کافروں پر شیطانوں کو ڈھیل دے دی جاتی ہے اور وہ اُن پر مسلط ہو کر انہیں مزید برائی پر ابھارتے رہتے ہیں۔ آخرت کا مدار چونکہ اس چند روزہ زندگی پر ہے تو کافر کفر پر زندگی گزار کر ابدی زندگی تباہ کر لیتے ہیں۔

نورِ ایمان کی برکت:

نورِ ایمان کی سب سے بڑی برکت یہ ہے کہ اللہ کریم شیاطین سے حفاظت فرماتے ہیں۔ مومن گناہوں سے بچتا ہے، نیک اعمال کرتا ہے جس کا صِلہ اُسے دنیا میں سکون اور اطمینانِ قلب کی صورت میں ملتا ہے، اور زندگی بھی آرام سے بسر ہوتی ہے اور آخرت میں بھی سرخروئی نصیب ہوتی ہے۔

انسان کے پاس محدود مدّت ہے:

فرمایا: فَلَا تَعۡجَلۡ عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمۡ عَدًّا ۞ ان کے معاملے میں جلدی نہ کیجیے کہ یہ خیال ہو کہ ابھی کسی نے غلطی کی اور وہ فوراً اسی وقت تباہ ہو جائے گا، ایسا نہیں ہے۔ انسان کے پاس تو گنتی کے دن ہیں، بہت محدود سی مدت ہے تھوڑی سی زندگی ہے اور اس پر ہمیشہ کی زندگی کا مدار ہے۔ اگر اس چند روزہ زندگی میں یہ اپنی ابدی زندگی کو تباہ کر رہا ہے تو اس سے بڑی سزا اور کیا ہوگی لہٰذا جلدی کی ضرورت نہیں ہے، ہم نے دن شمار کر رکھے ہیں یعنی ہر بندے کی زندگی کے لمحات گنتی کے ہیں اور عند اللہ شمار ہیں لہٰذا کوئی بھی اپنی زندگی سے ایک لمحہ زیادہ نہیں جیتا اور نہ ہی کوئی ایک لمحہ پہلے مرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مہلت عطا فرمائی اور انسان کو اختیار دیا، فرمایا: اِنَّا هَدَيۡنٰهُ السَّبِيۡلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوۡرًا (الدھر:3) ہم نے دونوں راستے واضح کر دیے ہیں اور انسان کو اختیار دے دیا ہے کہ وہ کس راستے کا انتخاب کرتا ہے، اطاعت اور شکر گزاری کا راستہ اختیار کرتا ہے یا نافرمانی اور ناشکری کا۔ اگر وہ اطاعت کا راستہ چُنتا ہے تو اللہ کریم اس کی حفاظت فرماتے ہیں، مدد فرماتے ہیں اور مزید نیکیوں کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔ اگر وہ نافرمانی کا راستہ اختیار کرتا ہے تو اللہ کریم اس کی حفاظت نہیں فرماتے، اُسے شیاطین کے حوالے کر دیتے ہیں جو اُسے مزید گمراہ کرتے رہتے ہیں۔

قرآن ایک آئینہ:

قرآن ایک آئینہ ہے جو ہر ایک کو اس کی اصلیت دِکھا دیتا ہے لہٰذا ہر ایک کو آیاتِ مبارکہ کے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھنا چاہیے، اپنا حال دیکھنا چاہیے اور یہ جائزہ لینا چاہیے کہ اگر مجھے نیکی کی توفیق نصیب ہے اور مزید نیکی

کی طرف جارہا ہوں اور سکون واطمینانِ قلب نصیب ہے تو اللہ کا کرم ہے اور نورِ ایمان نصیب ہے۔ اس کے برعکس اگر گناہ کی رغبت بڑھ رہی ہے اور برائی کی طرف جارہا ہوں، لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہوں، ناجائز ذرائع سے مال ودولت جمع کررہا ہوں دوسروں کے حقوق غصب کررہا ہوں تو میں غلط سمت میں جارہا ہوں، یہ سوچنا چاہیے کہ کہیں میں حفاظتِ الٰہیہ سے محروم تو نہیں ہوگیا؟ اگر یہ بات ہے تو پھر مجھے اپنے ایمان کے بارے میں سوچنا ہوگا کہ میرا دعویٰ ایمان تو ہے، لیکن کیا واقعی ایمان ہے بھی یا نہیں؟ ایمان کی دلیل تو یہ ہے کہ اللہ کریم شیاطین سے حفاظت فرماتے ہیں اور نیکی کی توفیق عطا فرماتے ہیں۔ ہم میں سے ہر فرد کو اپنا تجزیہ کرتے رہنا چاہیے لیکن آج کا المیہ یہ ہے کہ ایسی کوئی تنبیہ والی آیت ہو تو ہم اُسے کافروں کے لیے مختص کردیتے ہیں اور کوئی خوشخبری دینے والی آیت ہو تو نیکوں کے لیے سمجھتے ہیں اور خود کو الگ رکھتے ہیں۔ حالانکہ قرآنِ کریم ایک ایک فرد کو مخاطب کرتا ہے جو بھی تلاوت کرتا ہے قرآن اس سے بات کررہا ہوتا ہے۔

قیامت کے دن اہلِ تقویٰ کی مہمانداری کا دن:

فرمایا: يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِيْنَ اِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿۸۵﴾ ایک ایسا دن آئے گا جب اللہ کے نیک بندوں کو، اہلِ تقویٰ کو اللہ رحمٰن کی بارگاہ میں بطورِ مہمان جمع فرمایا جائے گا۔ جب قیامت کا دن ہوگا، میدان حشر ہوگا تو جن لوگوں نے اللہ کی اطاعت کی، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کی اور تقویٰ اختیار کیا یعنی زندگی اس طرح گزاری کہ اللہ کی ناراضگی سے ڈرتے رہے بچتے رہے تو اُن لوگوں کو اللہ کی بارگاہ میں اس طرح جمع کیا جائے گا جیسے مہمان آتے ہیں۔ مہمان جس کے ہاں بھی جائے وہ میزبان حتی المقدور اپنی حیثیت کے مطابق اس کی خدمت کرتا ہے۔ جب اللہ کریم اہلِ تقویٰ کو بطورِ مہمان جمع فرمائیں گے تو اس کا مطلب ہے کہ قیامت کا دن اہلِ تقویٰ کی عزت افزائی اور مہمان نوازی کا دن ہوگا اور ان پر نعمتوں اور انعامات کی بارش کا دن ہوگا۔

یاد رہے کہ تقویٰ ایک قلبی کیفیت کا نام ہے، چونکہ اُردو کا دامن تنگ ہے لہٰذا اس کا ترجمہ 'ڈر' کیا گیا ہے جو اس کا حق ادا نہیں کرتا۔ تقویٰ اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے کا ڈر ہے کہ بندے کو بات کرنے، عمل کرنے سے پہلے یہ خیال آئے کہ میں جو کہنے لگا ہوں، اس بات سے اللہ کریم راضی ہوں گے یا ناراض ہوں گے۔ یہ ناراضگی کا ڈر تقویٰ کہلاتا ہے۔ اسی طرح کام کرنے سے پہلے یہ خیال آئے کہ یہ کام کہیں اللہ کو ناراض نہ کردے، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی تو نہیں کرنے چلا، یہ ڈر تقویٰ ہے۔

قیامت کا دن مجرمین کی رسوائی کا دن:

جن لوگوں نے دنیا میں اللہ کی اطاعت سے منہ موڑا، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع چھوڑا اور ہوسِ دنیا میں عمر ضائع کی فرمایا: وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿۸۶﴾ اُن بدکاروں کو پیاسا جہنم کی طرف ہانکا جائے گا۔ جب کسی کو ذلت اور تحقیر کے ساتھ کہیں لے جایا جائے اور پیچھے مارنے پیٹنے والے مارتے پیٹتے لے جا رہے ہوں تو اس عمل کو ہانکنا کہتے ہیں۔ اس فعل میں ذلت کا پہلو نمایاں ہوتا ہے۔ فرمایا، جب یہ بدکار قیامت کی گرمی میں پیاس سے تڑپ رہے ہوں گے تو اسی پیاس کی حالت میں انہیں دوزخ کی طرف ہانکا جائے گا۔ فرشتے انہیں مارتے پیٹتے، گھسیٹتے ہوئے لیے جا رہے ہوں گے۔ فرمایا: لَا يَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾ اور کوئی اُن کی سفارش کا بھی اختیار نہیں رکھتا ہو گا اس لیے کہ اللہ کریم نے کفر اور کافر کی سفارش سے بھی منع فرما دیا ہے۔ اللہ کی بارگاہ میں سفارش بھی اس کی اجازت سے ہوتی ہے اور اس کی بارگاہ اتنی عالی ہے کہ وہاں کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے جب تک وہ خود کسی کو اجازت نہ عطا فرمائے۔ دنیا میں تو کوئی بااثر بندہ، کوئی صاحبِ اقتدار ہو یا صاحبِ مال و منال ہو تو وہ کسی کا سفارشی بن کر چل پڑتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کی بات کو کوئی رد نہیں کر سکتا لیکن اللہ کی بارگاہ میں ایسا نہیں ہو سکے گا۔ کفار کو اللہ کریم نے اس سے محروم کر دیا ہے اور اُن کی طرف سے اللہ کی بارگاہ میں کوئی عرض بھی نہیں کرے گا۔ ان کے جرائم اتنے بڑے ہیں ان کے کردار میں ایسی ظلمتیں ہیں کہ وہ ناقابلِ سفارش ہیں۔

ناقابلِ معافی جرم:

ان کے جرائم میں سے یہ بات بھی ہے کہ یہ کہتے ہیں: وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ﴿۸۸﴾ لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْئًا اِدًّا ﴿۸۹﴾ کہ اللہ رحمٰن کا بیٹا بھی ہے۔ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے، یہ کہنا اتنی بڑی جسارت ہے اور یہ انتہائی بری بات ہے، یہ حد سے گزر گئے ہیں۔ بیٹا باپ کی جنس ہوتا ہے، انسان کا بیٹا انسان ہوتا ہے حیوان کا بچہ حیوان ہوتا ہے، شیر کا بچہ شیر ہوتا ہے، بیل کا بچہ بیل ہوتا ہے، کمزور سہی باپ جیسا نہ سہی لیکن ہوتا باپ کی صفات لیے ہوئے ہے۔ انسان کا بیٹا انسان ہوتا ہے اگر باپ سے کم درجہ پر بھی ہو لیکن انسانی خصوصیات تو اس میں ہوں گی۔ اگر اللہ کریم کا (معاذ اللہ) کوئی بیٹا ہوتا تو پھر اللہ واحد لاشریک نہ رہتا، پھر بیٹے میں بھی الوہیت کی صفات ہوتیں، بھلا یہ کیسے ممکن ہے؟ یہ تو جسارت ہے جو یہ لوگ کر رہے ہیں۔

اللہ کی ساری مخلوق میں شعور ہے:

فرمایا: تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾ اَنْ دَعَوْا

لِلرَّحۡمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾ اگر کوئی زمینوں سے کہے، آسمانوں سے کہے پہاڑوں سے کہے کہ تم یہ دعویٰ کرو کہ اللہ کا بیٹا ہے تو آسمان پھٹ جائیں گے یہ دعویٰ نہیں کریں گے۔ زمین پھٹ جائے گی، تباہ ہو جائے گی یہ دعویٰ نہیں کرے گی۔ پہاڑ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گے لیکن یہ جرأت کبھی نہیں کریں گے کہ وہ یہ کہیں کہ اللہ کا بیٹا ہے یعنی جو غیر مکلف مخلوق ہے وہ بھی مِٹ جانا پسند کرے گی لیکن یہ جرأت نہیں کرے گی کہ وہ کہے کہ اللہ کا بیٹا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ کی ساری مخلوق میں زندگی بھی ہے اور شعور بھی ہے۔ ہر مخلوق کا شعور، اس کی حیات اس کے اپنے مطابق ہے، اللہ کی بارگاہ میں جیسے انسان جواب دہ ہیں اسی طرح ساری مخلوق شجر و حجر پہاڑ ہے۔ ہر چیز اپنے عمل کا ایک فوری نتیجہ پاتی ہے، درخت ہوں سبزہ ہو، زمین ہو، نباتات ہوں جمادات ہوں، آسمان ہو پہاڑ ہو، ان کے عمل کا ردِ عمل فوراً آجاتا ہے۔

قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِهٖ (بنی اسرآئیل: 44) کہ کائنات میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ کی تسبیح، اللہ کا ذکر نہ کرتی ہو۔ اس کا مطلب ہے جو چیز بھی ذکر چھوڑ دیتی ہے اس کا وجود معدوم ہو جاتا ہے۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ چشمے ندیاں خشک ہو جاتے ہیں، پہاڑ گر جاتے ہیں، چٹانیں شق ہو جاتی ہیں، زمین پھٹ جاتی ہے۔ ان تمام چیزوں کو ہر حال میں اللہ کا ذکر کرنا، اللہ کی تسبیح بیان کرنی ہے، انہیں مہلت نہیں دی گئی نہ ہی انتخاب کا اختیار دیا گیا ہے اسی لیے جو چیز ذکر چھوڑتی ہے وہ فنا ہو جاتی ہے۔ یہ صرف انسان ہے جسے فرصت دی گئی اور اختیار دیا گیا کہ زندگی میں جو چاہے راستہ اختیار کرے موت کے بعد حساب دینا ہوگا، لیکن انسان کے عمل کا بھی ایک فوری ردِ عمل ہوتا ہے۔ موت کے بعد تو گرفت ہوگی، جزا و سزا ہو گی لیکن زندگی میں ہر کام کا ایک فوری ردِ عمل ضرور ہوتا ہے۔ نیکی کا ردِ عمل یہ آتا ہے کہ دل کو سکون ملتا ہے، اللہ کی یاد نصیب ہوتی ہے، اللہ کے احسانات کا مزید ادراک ہوتا ہے اور مزید نیکی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ برائی کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ اللہ کا خوف دل سے نکل جاتا ہے، اللہ کی عظمت کا احساس نہیں رہتا، صداقتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا شعور نہیں رہتا۔ زندگی میں کبھی اللہ کو یاد کرنے کی فرصت نہیں ملتی اور مزید برائی کرنے کو دل چاہتا ہے۔ فرمایا، یہودیوں نے کہا کہ عزیر علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، عیسائیوں نے دعویٰ کر دیا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بیٹے ہیں، یہ اتنا شدید جرم ہے اور اتنی بڑی جسارت اور بے باکی ہے کہ انہیں تھوڑی سی فرصت ملی اور یہ اتنا بڑا دعویٰ کر بیٹھے حالانکہ اللہ ان چیزوں سے ورآء الوریٰ ہے اس کی ذات بے مثل و بے مثال ہے۔ اگر آسمانوں، زمینوں، پہاڑوں کو کہا جائے کہ یہ بات کہو کہ اللہ کا بیٹا ہے تو وہ پھٹ جانا، تباہ ہو جانا پسند کر لیں گے لیکن یہ دعویٰ ہرگز نہیں کریں گے۔

اللہ کی ذات بے مثل و بے مثال ہے:

اللہ کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔ فرمایا: وَمَا یَنۡۢبَغِیۡ لِلرَّحۡمٰنِ اَنۡ یَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾ اللہ واحد و لاشریک ہے بے مثل ہے، بے مثال ہے اور اس کی شان اس سے بہت بلند ہے کہ کوئی دوسرا اس جیسا ہو یا کوئی اس کا بیٹا کہلائے کیونکہ بیٹا باپ کے اوصاف کا حامل ہوتا ہے۔ اگر اللہ کا بیٹا ہوگا تو وہ بھی الٰہ ہوگا، اس میں معبودیت کی خصوصیات ہوں گی۔ اللہ واحد ہے لاشریک ہے، وہ خالق ہے ساری کائنات کا لیکن کوئی اللہ کا خالق نہیں۔ وہ مالک ہے ساری کائنات کا لیکن کوئی اس کا مالک نہیں نہ ہی کوئی اس کی ذات و صفات میں شریک ہوسکتا ہے۔ وہ بے مثل و بے مثال ہے۔

تمام مخلوق اللہ کی مملوک ہے:

فرمایا: اِنۡ کُلُّ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحۡمٰنِ عَبۡدًا ﴿۹۳﴾ اس کی شان تو یہ ہے کہ کائنات کا ہر ذرّہ، آسمانوں اور زمینوں کی تمام مخلوق اللہ کی مخلوق ہے، اس کی مملوک ہے اور اس کی عبادت کرنے والی ہے۔ اس جیسا کوئی نہیں ہے سب اُس کی مخلوق ہیں غلام ہیں، اپنے وجود میں بھی، اپنے پیدا ہونے اور قائم رہنے میں بھی، اپنے مرنے اور دوبارہ زندہ ہونے میں بھی ہر لحہ ہر کام میں اللہ کی قدرتِ کاملہ کے محتاج ہیں۔ وہ مالک ہے سب کا، انسان ہوں یا کوئی دوسری مخلوق، ملائکہ ہوں یا آسمان ہوں، عرش ہوں، تمام مخلوق اس کی تابعدار ہے اور سب اس کی بارگاہ میں غلام ہو کر حاضر ہوں گے۔

اللہ کی قدرت کاملہ:

فرمایا: لَقَدۡ اَحۡصٰىهُمۡ وَعَدَّهُمۡ عَدًّا ﴿۹۴﴾ اللہ کی قدرتِ کاملہ نے ہر چیز کو اپنے حصار میں لے رکھا ہے، اس کا احاطہ کر رکھا ہے۔ کوئی بھی شئے اس کے دستِ قدرت سے باہر نہیں ہے۔ ہر ذرّہ، ہر جاندار، انسان، فرشتہ، شجر و حجر، دریا، پہاڑ آسمانی یا عرشی مخلوق سب اس کی قدرتِ کاملہ کے نہ صرف حصار میں ہیں بلکہ اس نے ہر ایک کو شمار بھی کر رکھا ہے۔ اس نے تمام ذرّات کو شمار کر رکھا ہے اور ہر ذرّے کے اندر کیا ہے، وہ بھی شمار کر رکھا ہے کہ وہ اُن ذرّات کا خالق بھی ہے، وہی انہیں جانتا ہے اور شمار کرسکتا ہے لہٰذا اس کی قدرتِ کاملہ نے ہر چیز کو گھیرے میں لے رکھا ہے اور شمار کر رکھا ہے۔

فرمایا: وَکُلُّهُمۡ اٰتِیۡهِ یَوۡمَ الۡقِیٰمَةِ فَرۡدًا ﴿۹۵﴾ قیامت میں ساری مخلوق تن تنہا اس کی بارگاہ میں حاضر ہو

گی اور ہر ایک کو اپنا جواب دینا ہوگا۔ دنیا کے لاؤ لشکر، خزانے، حکومت واقتدار، محلات، خدام وسامان، وہاں کچھ بھی ساتھ نہ ہوگا۔ صرف اللہ کی بارگاہ میں انسان کی ذات ہوگی۔ ہر ایک کو فرداً فرداً، اکیلے اکیلے اس کی بارگاہ میں حاضر ہونا ہوگا۔ ساری کائنات کا ہر ذرّہ تن تنہا اپنی جوابدہی کو حاضر ہوگا۔ البتہ یہ عجیب بات ہے کہ کچھ لوگوں کے ساتھ ان سے محبت کرنے والے بھی ہوں گے۔ یہ کون لوگ ہیں جن کے ساتھ کچھ اُن کے چاہنے والے بھی ہوں گے؟

فرمایا ہر کوئی تنہا تنہا میری بارگاہ میں حاضر ہوگا لیکن بہت سے ایسے روشن سینے ہوں گے جن کے ساتھ اُن کے محبت کرنے والے بھی ہوں گے۔ فرمایا: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾ یہ وہ لوگ ہوں گے جن کے دلوں میں نورِ ایمان ہوگا اور ان کے اعمال صالح ہوں گے، اللہ اُن کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت پیدا کردیں گے۔

محبت کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے، اس پر بہت شاعری کی گئی ہے اور اس کی بے شمار تشریحات کی گئی ہیں۔ لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں محبت کی حقیقت اور اس کے نتائج بیان کیے ہیں لیکن کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکا کہ اس نے جو کہا ہے وہ حتمی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ جو بات فرماتے ہیں وہ صحیح ترین اور حتمی بات ہے۔

فرمایا، جن لوگوں نے مجھے مانا، میرے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مانا، میرے دین کو، میری کتاب اور آخرت کو مانا اور اپنے اعمال کی اصلاح کرلی اُن کے دلوں میں ہم باہم محبت پیدا کردیں گے۔ یعنی محبت وہ رشتہ ہے جو عظمتِ الٰہی اور صداقتِ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) پر متفق ہوکر ایک دوسرے کے ساتھ مشترک ہوجائے گا۔ محبت ایک انتہائی قیمتی جذبہ ہے جو اللہ کریم عطا فرماتے ہیں، یہ وہ رشتہ ہے جو اللہ کے لیے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتباع کے لیے، نیکی کے لیے دو دلوں میں بنتا ہے۔ جن لوگوں میں باہم رشتوں کی بنیاد اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر ہوگی، ذکرِ الٰہی اور یادِ الٰہی پر ہوگی اُن کے لیے، اللہ جو رحمٰن ہیں، محبت بنادیں گے۔ یعنی محبت وہاں بنتی ہے جہاں اللہ بنادیں کہ یہ اللہ کی بہت بڑی صفت ہے اور اُس کی عطا سے ہی کسی کو اِس کا کوئی ذرّہ نصیب ہوتا ہے

محبت وہ جذبہ ہے جسے کوئی توڑ نہ سکے، جسے موت بھی منقطع نہ کرسکے، حتیٰ کہ قیامت کا زلزلہ بھی توڑ نہ سکے، چنانچہ بارگاہ الوہیت میں جہاں ہر ذرّہ تنہا، ہر مخلوق، فردِ واحد کی طرح تن تنہا جارہی ہوگی، وہاں محبت کرنے والوں کے غول اُن لوگوں کے ہمراہ ہوں گے جن سے اُن کی محبت کی بنیاد اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پر ہوگی۔ حقیقی محبت کو دنیا کی تبدیلیاں تو کیا فنا کرتیں، اسے تو موت بھی نہیں توڑ سکی اور جہانوں کی تبدیلی بھی اس میں فرق

نہیں لا سکی۔ چاہنے والے اور محبوب میدانِ حشر میں یکجا ہوں گے، وہ انبیاؑ ہوں گے جن کے ساتھ اُن کے صحابہ کرامؓ، چاہنے والے اور اتباع کرنے والے ہوں گے۔ اللہ کے مقدس اور مقرب بندے، اہل اللہ ہوں گے ان کے ساتھ اُن کے چاہنے والے ہوں گے۔ یہ محبت اتنی مضبوط ہے کہ اسے قیامت کا زلزلہ بھی متاثر نہیں کر سکتا۔ یہ وہ محبت ہے جو اللہ کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے، جو اللہ کے لیے صحابہ کرامؓ، تابعین، تبع تابعین اور اہل اللہ سے ہوتی ہے، جن سے ہم نورِ ایمان کا اکتساب کرتے ہیں اور ہمارے اعمال صالح ہو جاتے ہیں۔ فرمایا، یقیناً جن لوگوں کو نورِ ایمان نصیب ہوا اور ایسا مضبوط ایمان کہ اُن کا کردار سدھر گیا، اُن کی آپس میں محبتیں ہمیشہ قائم رہیں گی کہ یہ محبتیں انہیں اللہ نے دی ہیں لہٰذا دنیا میں اُن کی محبت مثالی ہوتی ہے اور آخرت میں بھی مثالی ہوگی۔

دنیا کی محبتیں ذاتی اغراض ہوتی ہیں:

دنیا میں محبتیں نہیں ملتیں، دنیا میں ذاتی اغراض ملتی ہیں اور ان ذاتی اغراض کی بنیاد پر جو رشتہ ہوتا ہے اُسے 'محبت' کہہ دیا جاتا ہے۔ جب وہ غرض نہیں ہوتی تو محبت بھی نہیں رہتی۔ ہمیں حسین صورتوں سے محبت ہو جاتی ہے لیکن اگر کسی وجہ سے وہ صورت بگڑ جائے تو محبت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ انسانی اوصاف سے، دولت مندی سے، عہدہ واقتدار سے محبت ہوتی ہے اور جب وہی بندہ غریب ہو جائے یا عہدہ جاتا رہے تو محبت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ دنیا کی محبتوں کی بنیاد اغراض پر ہوتی ہے سو یہ 'محبت' نہیں ہوتی، ہم نے اس کا نام 'محبت' رکھا ہوا ہے۔ ہم دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمیں اولاد سے بڑی محبت ہے، ہمیں بیٹوں سے بہت محبت ہے، انہیں بہت محبت سے پالتے ہیں۔ جب وہی بیٹے کمائی کر کے نہ لائیں، یا باپ کی جائیداد کو ضائع کرنے لگ جائیں تو محبت نہیں رہتی۔ اگر بیٹوں سے محبت ہوتی تو ہر حال میں قائم رہتی، اس کا مطلب ہے کہ اصل میں اپنی خواہش سے محبت تھی کہ یہ بڑے ہوں گے اور میرا دست و بازو بنیں گے اور جب وہ آرزو پوری نہیں ہوتی تو محبت فنا ہو جاتی ہے۔ رشتے اور محبتیں اغراض پر مبنی ہیں اور جب تک غرض پوری ہوتی رہے تو محبت رہتی ہے، جب وہ غرض پوری نہیں ہوتی تو محبت بھی نہیں رہتی۔ سو یہ محبت نہیں ہے، ہم نے اس کا نام محبت رکھ لیا ہے۔ ایسے ہی وہ تعلق جو روایتی پیروں سے بنتا ہے، جو خود بھی بے دین ہوتے ہیں اور پیروکاروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں اسے بھی محبت نہیں کہہ سکتے وہ بھی اغراض کی محبت ہوتی ہے کہ پیر کے پاس جائیں گے تو یہ ملے گا، وہ ملے گا، اور جب نہیں ملتا تو مریدوں کو اپنے پیروں کو گالیاں دیتے بھی دیکھا گیا ہے۔

ایمان، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتماد کا نام ہے:

قرآن کریم کا بہت ہی خوبصورت اندازِ بیان ہے کہ جہاں ایمان کی بات ہوتی ہے ساتھ ہی عمل صالح کی بات آجاتی ہے فرمایا: اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔۔۔ ایمان کی شرط یہ ہے کہ مومن کے اعمال صالح ہو جائیں۔ ایمان یقین کی ایک انتہائی کیفیت ہوتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر اللہ کی عظمت پر، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر، قرآن کی حقانیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان پر پختہ یقین کر لینا کہ واقعی یہ سب بالکل حق ہے، سچ ہے۔ اگر ہم اسے سچ مانتے ہیں تو پھر ہم ہمارا کردار اس کے خلاف نہیں ہونا چاہیے۔ جو شخص ایمان دار ہونے کا، مومن ہونے کا دعویٰ کرے اور اس کا کردار غیر صالح ہو تو اس کے دعویٰ کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ یہ کیسا ایمان ہے جو اطاعتِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر مجبور نہیں کرتا؟ اس کا مطلب ہے کہ یقین میں کسی حد تک کمی ہے جس طرح کوئی سنی سنائی بات ہوتی ہے۔ اگر کوئی ہمیں ایک گلاس پانی دے اور حتمی اور یقینی طور پر خبر دے کہ یہ پانی زہریلا ہے اور ہم اس کی بات پر یقین بھی کر لیں تو کیا پھر ہم اس پانی کو چکھنا بھی پسند کریں گے؟ ہرگز ایسا نہیں کریں گے، پینا تو دور کی بات ہے کوئی اُسے چکھنا بھی گوارا نہیں کرے گا اور بتانے والے کی بات پر اعتماد کرتے ہوئے زہریلے پانی کو ہرگز استعمال نہیں کرے گا۔ جب ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا سچا نبیؐ، امام الانبیاؑ اور عظیم الشان رسول صلی اللہ علیہ وسلم مانتے ہیں تو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرما دیا کہ یہ کام نہ کرو، اس میں اللہ کریم کی ناراضگی ہے، تباہی ہے اور انجامِ کار جہنم ہے، پھر ہم دعویٰ ایمان کے ساتھ وہ گناہ بے دھڑک کرتے ہیں۔ ہمیں سوچنا پڑے گا کہ کیا ہمارا ایمان ہے؟ زہر کھانے سے تو صرف دنیا کی زندگی ختم ہوگی لیکن گناہ سے تو آخرت بھی برباد ہو جائے گی۔

اللہ نے قرآن کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک پر آسان کر دیا ہے:

قرآنِ کریم انسانی شعور، ذہن و عقل اور انسانی خرد سے بہت ماورا ہے کہ یہ خالق کا کلام ہے اور خالق کا کلام، خالق کی صفت ہے اور انسانی ذہن مخلوق ہے۔ جس طرح مخلوق خالق کا احاطہ نہیں کر سکتی اسی طرح صفات الٰہی کا احاطہ بھی نہیں کر سکتی۔ قرآن انسانی سمجھ سے بہت بلند ہے تو پھر اس سے استفادہ کیسے ممکن ہو؟

فرمایا: فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾ بے شک ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ پاک پر اسے آسان کر دیا ہے، اب ہر عام آدمی بھی سمجھ سکے گا، لیکن صرف تب سمجھے گا جب قرآن کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سیکھے گا۔ کوئی بڑے سے بڑا محقق، بڑے سے بڑا عالم جب از خود اسے

سمجھنے کی کوشش کرے گا اور تحقیق کرتے بیٹھے گا تو گمراہ ہو جائے گا حالانکہ یہ کتابِ ہدایت ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اہل مغرب میں سے جن کفار نے دینی علوم پر تحقیق کا بیڑہ اٹھایا جنہیں 'مستشرقین' کہا جاتا ہے، انہوں نے بہت محنت کی، عربی سیکھی، مختلف زبانیں سیکھیں اور بہت سی کتابیں مختلف زبانوں میں پڑھیں اور قرآن کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اُن کی مادری زبان انگریزی تھی لیکن انہوں نے عربی سیکھی عربی بے حد وسیع زبان ہے، اس کے تمام شعبوں، صرف ونحو، منطق وغیرہ پر عبور حاصل کیا لیکن عجیب بات یہ ہے انہیں قرآن سے ہدایت نہ ملی صرف اعتراض ملے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اپنے طور پر قرآن کو سمجھنا چاہا حالانکہ اللہ کریم نے اسے اتنا سہل کر دیا ہے کہ ایک اَن پڑھ گڈریا، چرواہا بھی سمجھ سکتا ہے لیکن اسے سمجھ تب آئے گی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھے گا کیونکہ اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر قرآن کو سہل کر دیا ہے۔ اس کا مطلب ہے قرآن کی وہ تفسیر معتبر ہوگی جو ارشاداتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق ہوگی ورنہ اپنی عقل سے صرف ونحو سے، منطق سے اور علوم کے زور سے اگر کوئی بات کو کہیں موڑ کرلے جانا چاہے گا تو وہ تاویل ہرگز معتبر نہیں ہوگی۔ قرآن کی وہی تفسیر معتبر ہوگی جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے شاگردوں یعنی صحابہ کرامؓ نے سنی اور انہوں نے آگے پہنچائی۔ اس کے علاوہ کوئی بڑے سے بڑا عالم اپنی طرف سے کچھ کہے تو ہرگز معتبر نہیں۔ قرآن کے الفاظ بھی وہی معتبر ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمائے اور صحابہ کرامؓ نے سنے اور آگے پہنچائے۔

متقین، اللہ کے چاہنے والے:

فرمایا: لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِينَ ۔۔۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے بندوں کو جو میری ناراضگی سے ڈرتے ہیں، انہیں خوشخبری سنائیں۔ یہاں پھر 'متقین' کی بات آگئی تو اگر یہاں متقین کا ترجمہ 'چاہنے والے' کر دیا جائے تو موزوں رہے گا۔ اگر یہ کہا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے چاہنے والوں کو بشارت دیجیے تو کتنا صحیح ہے کہ جہاں محبت اور چاہت ہوتی ہے تو وہیں انسان کسی کی ناراضگی سے ڈرتا ہے۔ ایسے چاہنے والوں کے لیے خوشخبری ہے کہ قیامت کا زلزلہ کائنات کے لیے ہوگا لیکن انہیں گھبرانے کی ہرگز ضرورت نہیں کہ یہ تو اللہ کے مہمان ہوں گے اور خوشی خوشی حاضر ہوں گے۔ موت کا ڈر تو نافرمانوں کو ہوگا۔ میرے چاہنے والو! تم تو مہمانوں کی طرح آؤ گے۔ قیامت تو ایک دروازہ ہے، وہاں سے گزر و گے تو میری بارگاہ میں پہنچ جاؤ گے کہ تم تو میری اور میرے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرنے والے ہو۔

مہلتِ عمل:

دنیا کی حیاتِ مستعار میں جو لوگ عظمتِ الٰہی کو قبول نہیں کرتے، اطاعت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جھگڑا کرتے ہیں، اعتراض کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں خبر دے دیں کہ وقت آ رہا ہے، جب تمہیں پیاسا جہنم کی طرف ہانکا جائے گا۔ ابھی فرصت ہے اللہ کی رحمت کا دروازہ کھلا ہے، توبہ کی فرصت ہے، اب بھی اللہ کی پناہ میں آ جاؤ۔ اگر اسی کفر پر موت آ گئی تو بہت برا انجام ہوگا۔ جس دنیا پر اتنے نازاں ہو، جس حکومت واقتدار پر تمہیں ناز ہے، جس امارت پر ناز ہے جس انا پر اتنے مغرور ہو، یہ سب کچھ تو فنا کے گھاٹ اترنے والا ہے۔ بعض لوگ کنگال بھی ہوں تو بھی اُن میں عجیب سی انا ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے سامنے بھی جھکنا نہیں چاہتے۔

فرمایا: وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ۝۹۸ سب چیزیں فنا ہو جائیں گی اور اس کی شہادت یہ ہے کہ کتنے ہی شہنشاہوں کو، بڑی عظیم سلطنتوں کو کتنی اقوام اور گروہوں کو ہم نے تباہ کر دیا۔ سب فنا کی وادی میں اتر گئے، سلطنتیں بھی تباہ ہو گئیں حکمران بھی فنا ہو گئے۔ کیا اب اُن میں کسی بادشاہ کو آپ محسوس کرتے ہیں، کسی کی کوئی خبر پاتے ہیں؟ کسی بادشاہ کو دیکھتے ہیں؟ کہیں کسی راجہ، مہاراجہ، کسی شہنشاہ کی جھلک نظر آتی ہے یا کسی کی سرگوشی بھی سنائی دیتی ہے؟ پھر کیوں نہیں سبق حاصل کرتے کہ جس دولت جس طاقت، حکومت واقتدار پر اکڑ کر اللہ کی نافرمانی کرتے ہو یہ سب تو فنا ہو جائے گا اور تمہارے پاس کچھ بھی نہیں بچے گا۔ اللہ کی محبت، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت، اللہ کے دین کی محبت ہی قائم رہنے والی چیز ہے، جسے آج تم ٹھکرا رہے ہو اور فانی چیزوں سے چمٹ رہے ہو۔ اس پر تو تاریخِ عالم گواہ ہے کہ تم سے کہیں زیادہ طاقتور اور امیر لوگ اس جہاں سے گزر گئے، جن کی آج کوئی سرگوشی بھی سنائی نہیں دیتی۔

سورۃ طٰہٰ رکوع 1 آیات 1 تا 24

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

طٰهٰ ۚ﴿۱﴾ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۙ﴿۲﴾ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۙ﴿۳﴾
تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۭ﴿۴﴾ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ
اسْتَوٰى ﴿۵﴾ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ
الثَّرٰى ﴿۶﴾ وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ﴿۷﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا
هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ﴿۸﴾ وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۘ﴿۹﴾ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ
لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّىْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى
النَّارِ هُدًى ﴿۱۰﴾ فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ۭ﴿۱۱﴾ اِنِّىْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ
اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ۭ﴿۱۲﴾ وَاَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا يُوْحٰى ﴿۱۳﴾ اِنَّنِيْٓ
اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿۱۴﴾ اِنَّ السَّاعَةَ
اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ﴿۱۵﴾ فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ
لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿۱۶﴾ وَمَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۷﴾ قَالَ
هِىَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ
اُخْرٰى ﴿۱۸﴾ قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾ فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِىَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾ قَالَ
خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۪ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿۲۱﴾ وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى
جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَاۗءَ مِنْ غَيْرِ سُوْۗءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ۙ﴿۲۲﴾ لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا

الْكُبْرٰى ﴿٢٣﴾ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٢٤﴾

طٰهٰ ① ۔ ہم نے آپ پر قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ آپ تکلیف اٹھائیں ﴿٢﴾
بلکہ ایسے شخص کی نصیحت کے لیے (اتارا ہے) جو (اللہ کا) خوف رکھتا ہے ﴿٣﴾ یہ
اس (ذات) کی طرف سے نازل فرمایا گیا ہے جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو
پیدا فرمایا ہے ﴿٤﴾ وہ بڑی رحمت والا، عرش پر قائم ہے ﴿٥﴾ اسی کی (ملکیت)
ہیں جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں زمین میں ہیں اور جو ان دونوں کے
درمیان میں ہیں اور جو تحت الثریٰ (زمین کی مٹی کی تہہ کے نیچے) میں ہیں ﴿٦﴾ اور
اگر تم پکار کر بات کہو تو یقیناً وہ چپکے سے کہی ہوئی بات کو اور اس سے بھی زیادہ پوشیدہ
بات کو جانتا ہے ﴿٧﴾ اللہ ہے اس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ اس کے
اچھے (اچھے) نام ہیں ﴿٨﴾ اور کیا آپ کو موسیٰ (علیہ السلام) کی خبر پہنچی
ہے؟ ﴿٩﴾ جب انہوں نے آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ تم ٹھہرو میں
نے آگ دیکھی ہے ہوسکتا ہے میں اس میں سے تمہارے پاس کوئی انگارہ لاؤں یا
آگ کے پاس کوئی راستہ بتانے والا مل جائے ﴿١٠﴾ پس جب اُس (آگ) کے
پاس پہنچے تو (من جانب اللہ) آواز دی گئی کہ اے موسیٰ (علیہ السلام) ﴿١١﴾ یقیناً
میں ہی آپ کا پروردگار ہوں پس اپنے جوتے اتار دیں بے شک آپ پاک میدان
طویٰ میں ہیں ﴿١٢﴾ اور میں نے آپ کو چن لیا ہے۔ پس جو کچھ وحی فرمایا جا رہا ہے
اسے سن لیجیے ﴿١٣﴾ بے شک میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی عبادت کا مستحق
نہیں۔ تو میری ہی عبادت کیا کریں اور میرے ذکر (یاد) کے لیے نماز پڑھا
کریں ﴿١٤﴾ بلاشبہ قیامت آنے والی ہے ہم اس کو (تمام خلائق سے) پوشیدہ رکھنا
چاہتے ہیں تا کہ ہر شخص اپنی محنت کا بدلہ پائے ﴿١٥﴾ تو جو شخص اس پر یقین نہیں
رکھتا اور اپنی خواہشات (نفسانی) پر چلتا ہے۔ آپ کو اس (کے یقین) سے روک نہ

دے کہ پھر آپ تباہی میں پڑ جائیں ﴿۱۶﴾ اور اے موسیٰ (علیہ السلام)! یہ آپ
کے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟ ﴿۱۷﴾ انہوں نے عرض کیا یہ میری لاٹھی ہے۔ میں اس
پر ٹیک لگاتا ہوں اور (کبھی) اس سے اپنی بکریوں پر (کے لیے) پتے جھاڑتا ہوں
اور اس میں میرے لیے اور بھی کئی فائدے ہیں ﴿۱۸﴾ ارشاد ہوا،
اے موسیٰ (علیہ السلام)! اس کو (زمین پر) ڈال دو ﴿۱۹﴾ سو انہوں نے اس کو ڈال
دیا تو وہ ناگہاں اژدھا بن کر دوڑنے لگا ﴿۲۰﴾ ارشاد ہوا اس کو پکڑ لیں اور ڈریں
نہیں۔ ہم ابھی اس کو اس کی پہلی حالت پہ کر دیں گے ﴿۲۱﴾ اپنا (داہنا) ہاتھ اپنی
(بائیں) بغل میں دے لیں وہ بے عیب روشن ہو کر نکلے گا (یہ) دوسری نشانی
ہے ﴿۲۲﴾ تاکہ ہم آپ کو اپنی (قدرت میں سے) بڑی نشانیاں
دکھائیں ﴿۲۳﴾ فرعون کے پاس جائیں کہ بے شک وہ سرکش ہو رہا ہے ﴿۲۴﴾

تفسیر و معارف

سورۂ طٰہٰ مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ اس میں ایک سو پینتیس (135) آیات اور آٹھ (8) رکوع ہیں۔

طٰهٰ ① ۔۔۔ یہ حروفِ مقطعات ہیں۔ ان کا پڑھنا ضروری ہے معانی جاننا ضروری نہیں۔ ان کا معنی اللہ بہتر جانتے ہیں اور اللہ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے معانی بتائے ہیں یا اپنے پیارے بندوں میں سے جسے چاہیں بتا دیں یہ اللہ کی مرضی ہے۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر قرآنِ کریم کا ترجمہ نہ بھی آتا ہو تو قرآنِ کریم کی تلاوت کا ثواب ملتا ہے۔ کیفیات عطا ہوتی ہیں جن کا اثر دل پر ہوتا ہے اور کردار میں بہتری آتی ہے۔ حروفِ مقطعات کا معنی تو کسی کو نہیں آتا لیکن ان سے جو فیوض و برکات مترشح ہوتی ہیں وہ ہر پڑھنے والے کو نصیب ہوتی ہیں۔ قرآنِ کریم کے معانی کو سمجھنا چاہیے، سیکھنا چاہیے اور ارشاداتِ باری کو سمجھ کر اپنی زندگی کا لائحہ عمل مرتب کرنا چاہیے۔ جن حضرات کو معنی نہیں آتے وہ بھی قرآنِ کریم کی تلاوت سے اس کے فیوض و برکات کو پا لیتے ہیں لہٰذا تلاوت ضرور کرنی چاہیے۔

فرمایا: مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَيۡكَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰٓى ② ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن اس لیے نازل

نہیں فرمایا کہ آپ اپنی جان کو مشقت، تکلیف یا مصیبت میں ڈال لیں۔ اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝ قرآن تو اس لیے نازل ہوا ہے کہ جن لوگوں کو خشیت نصیب ہے، جو خوفِ خدا رکھتے ہیں، اللہ کی عظمت کا احساس رکھتے ہیں انہیں صحیح راستہ مل جائے، اس دارِ عمل میں عمل کرنے کا صحیح طریقہ سمجھ میں آجائے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم دعوتِ حق اور دین کی تبلیغ کے لیے دن بھر مشقت اٹھاتے اور رات کا کثیر حصّہ عباداتِ الٰہی میں بسر کرتے تھے۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا طریقۂ پاک یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم خود چل کر سرداروں کے پاس تشریف لے جاتے، انہیں تبلیغ فرماتے کہ ان میں سے کسی ایک کی بھی اصلاح ہو جائے تو پوری قوم کی اصلاح ہو جائے گی۔ اس کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو بعض اوقات لوگوں کے اعتراضات سننے پڑتے، دکھ اور ایذاء برداشت کرنا پڑتی۔ راتوں کو اٹھ کر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نوافل میں قرآن کریم پڑھتے اور اتنا طویل قیام فرماتے کہ پاؤں مبارک متورم ہو جاتے تو اللہ کریم نے فرمایا کہ میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلّم)! میں نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) پر قرآن اس لیے نہیں اتارا کہ آپ اپنی جان کو مشقت میں ڈال دیں۔ اللہ کریم کے فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم قرآن بھی پڑھیں اور آرام بھی فرمائیں۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنا عمل تبدیل فرما لیا۔ رات کے پہلے پہر آرام فرماتے اور سحری کو اٹھ کر تہجد میں قرآن پڑھتے۔

ایک غلط روش اور اس کی اصلاح:

ہمارے ہاں ایک رواج بن گیا ہے کہ اپنی طرف سے وظیفہ ایجاد کر کے مختلف سورتیں بطورِ وظیفہ پڑھی جاتی ہیں کہ فلاں سورت ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر اتنی مرتبہ پڑھو تو فلاں دنیوی مسئلہ حل ہو جائے گا۔ ایسی باتوں کا دین سے کوئی تعلق نہیں۔

واضح رہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم رات کو اٹھ کر قرآن پڑھتے تھے تو کسی دنیوی کام کے لیے نہیں پڑھتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کلامِ الٰہی کی محبت میں کلامِ الٰہی پڑھتے تھے۔ اس پر اللہ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو عبادات میں بھی توازن اور اعتدال کا حکم دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے اپنا طریقۂ کار تبدیل فرما لیا تو یہ لوگ جو حصولِ دنیا کے لیے ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر یا ویسے ہی کھڑے ہو کر یا زمین پر لکیر ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں اور ساری ساری رات مخصوص سورتیں یا آیات پڑھتے ہیں تو ان کے ان کاموں کی شریعت میں کوئی دلیل نہیں۔ شرعاً اس کا کوئی جواز نہیں۔

تلاوتِ قرآن صرف رضائے باری کے لیے:

قرآن کریم کو پڑھنے کا سلیقہ یہ ہے کہ قرآن صرف اللہ کی رضا کے لیے پڑھا جائے۔ اللہ کا ذکر جب بھی

ہوگا اللہ کی رضا کے لیے ہوگا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی دُنیوی غرض سے تلاوت نہیں فرماتے تھے محض اللہ کی رضا کے لیے فرماتے تھے۔ ہاں تلاوت کے دنیوی فوائد بھی بہت ہیں لیکن ان فوائد کو مقصد بنالینا درست نہیں۔

یہ درست ہے کہ حدیث شریف میں بعض سورتوں کے فضائل ارشاد فرمائے گئے ہیں کہ فلاں سورت پڑھنے سے روزگار میں فراخی ہوگی، مصیبت دور ہوگی، بیماری جاتی رہے گی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ سورت اسی کام کے لیے مختص کردی جائے بلکہ اصول یہ ہے کہ قرآن محض اللہ کی رضا کے لیے پڑھا جائے گا۔ کسی دنیوی کام کے لیے نہیں پڑھا جائے گا۔ جب قرآن رضائے الٰہی کے لیے پڑھا جائے تو اس کی برکات میں سے ایک یہ ہے کہ دنیوی فوائد بھی حاصل ہوجاتے ہیں۔ مصیبت دور ہوجاتی ہے، بیماری ٹھیک ہوجاتی ہے، روزگار مل جاتا ہے، فراخی ہوجاتی ہے لیکن یہ تلاوتِ قرآن کا مقصد نہیں ہے لہٰذا کسی بھی دنیوی کام کے لیے قرآن پڑھنا جائز نہیں۔ قرآن صرف اللہ کی رضا کے لیے پڑھا جائے گا اور پڑھتے ہوئے جب کوئی اس سورت پر پہنچے گا جس کا ذکر حدیث شریف میں آیا ہے تو اس کا اضافی فائدہ ضرور حاصل ہوگا۔ جس سورت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو برکت ارشاد فرمادی ہے وہ ضرور حاصل ہوجائے گی لیکن محض اس غرض سے قرآن نہیں پڑھا جائے گا۔ جو لوگ وظیفے صرف دنیوی اغراض کے لیے کرتے ہیں اُن کا کوئی جواز نہیں۔ قرآن پڑھنے کا سلیقہ یہی ہے کہ قرآن رضائے باری کے لیے پڑھا جائے، سمجھنے کے لیے پڑھا جائے، سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے۔ اسے سمجھنے، اس پر عمل کرنے، اس کی تلاوت کرنے کے اضافی فائدے یہ ہوں گے کہ اللہ کریم دنیوی مصیبتوں سے بچالیتے ہیں، دنیا کی آسانیاں عطا فرماتے ہیں، صحت و عافیت نصیب ہوتی ہے۔ یہ سب اضافی فوائد ہیں، مقصد نہیں۔

نزولِ قرآن کا مقصدِ وحید:

نزولِ قرآن کا صرف ایک مقصد ہے کہ جسے طلب ہو، اسے اللہ کی راہ نصیب ہوجائے۔ فرمایا: تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۞ نزولِ قرآن کا ایک ہی مقصد ہے کہ جسے بھی یہ خیال آئے کہ اس کائنات کا کوئی مالک بھی ہے۔ وہ کون ہے، کیسا ہے؟ میں اس کی رضا کے لیے کیا کروں کہ وہ مجھ سے خوش ہو تو وہ قرآن سے راہ پالے گا۔ قرآن تو کائنات کے لیے، ساری مخلوق کی ہدایت کے لیے ہے لیکن اس سے فائدہ اسی کو ہوگا جس کے دل میں خشیت ہوگی۔ جس کے دل میں اللہ سے تعلق پیدا کرنے کا شوق ہوگا۔

نزولِ قرآن سے پہلے، بعثتِ عالی سے پہلے کے وہ لوگ جن کے دل میں اللہ سے تعلق حاصل کرنے کا جذبہ تھا، شوق تھا اور وہ اللہ کی وحدنیت کے قائل تھے وہ اسی خشیتِ قلبی کے باعث مسلمان تھے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کے والدینِ کریمین، دادا، حضرت عبدالمطلب سب مسلمان تھے۔

عہدِ فترت میں اسلام:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا سے اٹھائے جانے میں کم وبیش پانچ سو (500) سال کا فاصلہ ہے۔ یہ پانچ صدیاں عہد فترت کہلاتا ہے جس میں کوئی راہنمائی کرنے والا نہیں تھا۔ لوگ مذہبی سربراہ بھی بنے ہوئے تھے، مبلغ بھی لیکن سب گمراہ تھے۔ جو لوگ حق تلاش کرتے تھے انہیں حق بتانے والا کوئی نہ ملتا تھا۔ انہی میں مکہ مکرمہ کا ایک شخص زید بن عمرو بن نفیل ہوا ہے۔ وہ حق کی تلاش میں جہاں تک جاسکتا تھا، گیا۔ جہاں تک عربوں کے تجارتی قافلے آتے جاتے تھے وہاں تک کے ممالک میں گیا۔ عیسائیوں اور یہودیوں کے علما کے پاس گیا۔ چوٹی کے راہبوں اور علمانے بتادیا کہ ان کے پاس حق نہیں۔ جو کچھ انہیں سنا سنایا ملا وہ اسی کو لیے بیٹھے تھے۔ اُس نے اُن سے پوچھا کہ پھر حق کہاں سے ملے گا؟ انہوں نے بتایا کہ تمہارے ہی شہر مکہ مکرمہ میں نبی آخر الزماں (صلی اللہ علیہ وسلم) مبعوث ہوں گے۔ ان کا انتظار کرو۔ پھر وہ مکہ مکرمہ میں ہی مقیم رہا اور منتظر رہا۔ وہ موحد تھا اور اس نے اللہ کی وحدانیت کا اظہار اپنی شاعری میں بھی کیا ہے۔ اس کے اشعار کچھ یوں ہیں۔

أَرَبًّا وَاحِدًا أَلْفَ رَبًّا أَدِينُ إِذَا تُقُسِّمَتِ الْأُمُور
تَرَكْتُ اللَّاتَ وَالْعُزّٰى جَمِيعًا كَذٰلِكَ يَفْعَلُ الرَّجُلُ الْبَصِيرُ

کہ پروردگار، پالنہار، پیدا کرنے والا کوئی ایک ہی ہو سکتا ہے، ہزاروں نہیں۔ اگر پیدا کرنے والے، روزی دینے والے ہزاروں ہوتے تو مخلوق کو بانٹ دیتے اور لڑائیاں ہوتیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ کائنات کا مالک کوئی ایک ہے اور وہی سب کا ربّ ہے، پالنہار ہے۔

اور یہ دین نہیں ہے کہ جس میں کام بانٹ دیے جائیں کہ فلاں سے اولاد ملے گی اور فلاں خانقاہ پہ سلام کرو تو بیماری ٹھیک ہوگی اور فلاں سے رزق ملے گا۔ یہ دین نہیں ہے۔ ربّ ایک ہے دو نہیں ہو سکتے اور جب کام بانٹ دیے گئے تو دین کہاں رہا۔ اور یہ کہ میں لات و عزّیٰ، سب کو چھوڑتا ہوں، کسی کی پروا نہیں کرتا۔ ہر صاحبِ بصیرت ایسا ہی کرے گا۔ جو عقل کے اندھے ہیں، میں ان کی بات نہیں کرتا لیکن بصیرت رکھنے والا ایسا ہی کرے گا جیسا میں نے کیا۔

زید بن عمرو بن نفیل یہ کہہ کر تھوڑی سی مٹی ہاتھ پہ رکھتا، اس پہ پیشانی رکھ دیتا اور کہتا، اے اللہ! میں جانتا ہوں تُو ہے لیکن یہ نہیں جانتا تُو کیسا ہے؟ مجھے نہیں پتا تیری عبادت کا طریقہ کیا ہے، میں نہیں جانتا تُو کس بات پہ راضی ہے،

کس پہ ناراض ہے۔ پیشانی کو یوں مٹی پر رکھ دیتا اور کہتا، یا اللہ! میری طرف سے اسے قبول فرما، اسی کو میری عبادت سمجھ کیونکہ مجھے کوئی بتانے والا نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے وہ دنیا سے گزر چکا تھا۔ اس وقت یعنی عہدِ فترت میں اسلام یہی تھا کہ اللہ کی وحدانیت پر یقین ہو، انسان توحیدِ باری پہ قائم ہو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدین کریمین اسی پر تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فرمایا، اس کو ماننا اسلام ٹھہرا۔

بعض لوگ جاہلیت کے باعث یہ سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عالی سے پہلے چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بزرگوں اور والدین کا وصال ہو گیا تو معاذ اللہ وہ مسلمان نہ تھے۔ یہ صحیح نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا حضرت عبدالمطلب بہت بڑے مؤحد اور اللہ پر توکل کرنے والی ہستی تھے۔

جب ابرہہ نے مکہ مکرمہ پر حملے کا ارادہ کیا تو لوگ شہر خالی کر کے پہاڑوں پر چلے گئے۔ ابرہہ کے لشکریوں نے حضرت عبدالمطلب کے اونٹ پکڑ لیے۔ آپ کو معلوم ہوا تو آپ ابرہہ کے پاس گئے، آپ مکہ کے رئیس تھے۔ ابرہہ کو بتایا گیا کہ رئیسِ مکہ تشریف لائے ہیں۔ اس نے خدام سے کہا کہ بلاؤ۔ آپ جب پیش ہوئے تو اس نے پوچھا کس غرض سے آئے ہیں؟ آپ نے فرمایا، تمہارے لشکریوں نے میرے اونٹ پکڑ لیے ہیں اس لیے آیا ہوں کہ میرے اونٹ واپس کر دیے جائیں تو وہ بڑا حیران ہوا۔ اس نے کہا، میں سمجھا کہ آپ رئیسِ مکہ ہیں، میں آپ کے شہر پر حملہ آور ہوا ہوں، میں اس لیے آیا ہوں کہ بیت اللہ کو گرا دوں اور یمن میں جو مکان میں نے بنایا ہے، سب لوگ اس کا طواف کریں لیکن آپ کیسے رئیس ہیں کہ آپ اس موضوع پر بات ہی نہیں کر رہے اور صرف اپنے اونٹوں کی واپسی کا مطالبہ کر رہے ہیں! آپ نے فرمایا، اونٹوں کا مالک میں ہوں اسی لیے ان کی بات کر رہا ہوں۔ آپ جس گھر کو گرانا چاہتے ہیں اس گھر کا بھی ایک مالک ہے، وہ آپ سے نمٹ لے گا۔ آپ ایک کثیر اور اسلحہ سے لیس لشکر لے کر آئے ہیں۔ ہم آپ کا مقابلہ نہیں کر سکتے اس لیے ہم نے شہر خالی کر دیا ہے اور پہاڑوں میں چلے گئے ہیں لیکن جس کا یہ گھر ہے وہ آپ سے مقابلہ کر لے گا اور اپنے گھر کو بچا لے گا۔ اس وقت اللہ کو واحد ماننا، قادرِ مطلق ماننا، توحیدِ باری پر قائم رہنا ہی اسلام تھا اور حضرت عبدالمطلب کھرے مسلمان تھے۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے والدِ گرامی حضرت عبداللہ کو کسی عورت نے اپنی طرف مائل کرنا چاہا، آپ کو دعوت دی لیکن حضرت عبداللہ نے فرمایا، میں اللہ سے ڈرتا ہوں، ناجائز کام نہیں کر سکتا۔ یہی واقعہ ان کا اللہ پر ایمان اور اللہ سے ڈرنا بتاتا ہے اور یہ کہ آپ کس اعلیٰ درجہ کے مسلمان تھے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت پر ایمان لانا شرطِ ایمان ٹھہرا۔ جو عقیدہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا، وہ عقیدہ اسلام ٹھہرا۔

خلاصہ یہ کہ قرآن اس لیے نازل ہوا ہے کہ جو اللہ کو پانا چاہے، اس کی راہنمائی ہو جائے۔ وہ قرآن سے یہ جان لے کہ اللہ کی ذات کیسی ہے، اس کی صفات کیسی ہیں، اللہ کس بات سے خوش ہے، کیا بات اسے پسند نہیں۔ اور چونکہ قرآن حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے، لہٰذا قرآن کو سمجھنا ہے تو صاحبِ قرآن سے سمجھو کیونکہ قرآن سمجھانا فرائضِ نبوت میں سے ہے۔ فرمایا: لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ۔۔۔(النحل: 44) یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا منصبِ عالی ہے کہ جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے اس کا مفہوم لوگوں کو بتائیں اس لیے یہ اصول ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر از خود قرآن کا مفہوم جاننے کی کوشش کرے گا، وہ گمراہ ہو جائے گا۔

قرآن، خالقِ کائنات کا نازل کردہ ہے:

فرمایا: تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝ قرآن اس ہستی نے نازل فرمایا ہے جس نے ہر چیز کو تخلیق فرمایا ہے، ہر چیز کو عدم سے وجود عطا فرمایا ہے۔ خالق صرف اللہ ہے۔ کچھ نہیں تھا، اس نے پیدا فرما دیا، اس نے زمینوں آسمانوں کو عدم سے پیدا کیا۔ کچھ بھی نہیں تھا تو اس نے سب کچھ بنا دیا۔ زمینیں، چاند ستارے، آسمانی مخلوق، عرشِ علٰی سب کو معدوم سے موجود کر دیا تو قرآن بھی اسی کی طرف سے نازل ہوا ہے جو اس ساری کائنات کا خالق ہے۔

یہاں یہ اصول بھی سمجھ میں آ گیا کہ جو کسی چیز کو بنانے والا ہوتا ہے وہی اس کے استعمال کا طریقہ بھی بتا دیتا ہے اگر وہ طریقہ چھوڑ دیا جائے تو چیزیں فائدہ نہیں دیتیں۔ دنیوی چیزوں کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے مثلاً جیسے گھڑی ہے، لاؤڈ اسپیکر مائیک کا سسٹم ہے اگر ان کے استعمال کا وہ طریقہ نہ اپنایا جائے جو اس کے بنانے والے نے بتایا ہے تو نہ گھڑی کام کرے گی نہ ساؤنڈ سسٹم۔ اسی طرح کائنات کے بنانے والے نے قرآنِ حکیم نازل کر کے اس کائنات میں رہنے اور اس کو استعمال کرنے کا سلیقہ بتایا ہے۔ قرآن حکیم ہدایات دیتا ہے کہ کس طریقے سے اسے استعمال کرو تاکہ تمہیں فائدہ ہو۔ اور یہ بھی کہ اس طریقے کو چھوڑ دو گے تو یہ تمہارے لیے دنیا میں پریشانی کا باعث بن جائے گا اور اخروی نقصان بھی ہو گا۔

فرمایا: اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ وہ ذات بے پناہ مہربان ہے، اس کی رحمت بہت وسیع ہے، ذرّے ذرّے کی دیکھ بھال کر رہی ہے، پال رہی ہے، اس میں طرح طرح کی خصوصیات پیدا کر رہی ہے اور مختلف

کام لے رہی ہے۔ وہی ذاتِ بے ہمتا ہے جس نے قرآن نازل فرمایا۔ جس نے سورج، چاند، ستاروں، سیاروں کو عدم سے پیدا فرما کر موجود کر دیا۔

عرش پر قائم ہونے سے مراد:

عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ﴿۵﴾ وہ عرش پر قائم ہے۔ اس پر علمائے کرام نے طویل بحثیں کی ہیں۔ بعض نے کہا کہ اللہ کریم، عرش پر ایک کرسی ہے جس پر تشریف فرما ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اللہ کریم تو عرش پر بیٹھے ہیں اور ان کا علم ہر چیز کے ساتھ ہے۔ علمائے کرام کی اکثریت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ کریم نے عرشِ علیٰ کو ساری کائنات کا مرجع اور مرکز بنا دیا ہے۔ ہر چیز ادھر رجوع کرتی ہے۔ اعمال اُدھر اٹھائے جاتے ہیں، روزی وہاں سے تقسیم ہوتی ہے، فیصلے وہاں سے آ کر کائنات پر لاگو ہوتے ہیں۔ اللہ کریم نے عرشِ علیٰ کو کائنات کے امور کا مرکز و مرجع بنا دیا ہے۔ جدید زبان میں جسے مرکزی دفتر یا سیکرٹریٹ کہہ لیں۔

اللہ کریم کے لیے کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ اس کی ذات تمام سمتوں اور جہتوں سے بلند اور پاک ہے۔ اگر اللہ کے بارے یہ تسلیم کر لیں کہ اللہ کریم کرسی پر بیٹھے ہیں تو ایک سمت مقرر ہو گئی، ایک جہت معلوم ہو گئی۔ جس کی سمت معلوم ہو جائے وہ مخلوق ہوتی ہے۔ خالق حدوں میں نہیں آ سکتا، وہ محدود نہیں ہوتا لہٰذا یہ کہنا کہ اللہ کریم عرش پر بیٹھے ہوئے ہیں، یہ درست نہیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اللہ کریم عرش پر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان کا علم ہر چیز کے ساتھ ہے تو وہ یہاں غلط سمجھ رہے ہیں۔ اللہ کریم کی ذات کی طرح اللہ کی صفات بھی لامحدود ہیں حدیں مخلوق کی ہوتی ہیں خالق کی نہیں۔ اللہ کریم کی ذات ہر ذرّے کے ساتھ موجود ہے۔ اللہ کی ذات، اللہ کا علم ہر آن ہر لمحے موجود ہے۔ اور اس کی کیفیت اللہ کی شان کے مطابق ہے یعنی کیفیت کے بارے کوئی نہیں جان سکتا۔

فرمایا: لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ﴿۶﴾ سب کچھ اسی کا ہے خواہ وہ آسمانوں میں ہے، زمین میں ہے یا زمین و آسمان کے درمیان ہے۔

اسی سورۂ طٰہٰ کی ان پہلی آیات کے نزول کے ساتھ سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبولِ اسلام کا خوبصورت واقعہ ہے کہ کس طرح قرآنِ حکیم سن کر آپؓ ششدر رہ گئے اور حق قبول کر لیا۔

مختصراً واقعہ یوں ہے کہ ایک دن تلوار سونت کر جا رہے تھے۔ راستے میں ایک صحابیؓ (نعیم بن عبداللہؓ) مل گئے۔ پوچھا، کہاں کا ارادہ ہے؟ سخت غصّے میں تھے، کہنے لگے اُس ایک فرد کا قصہ پاک کرنے جا رہا ہوں جس نے

ہمارے باپ دادا کے مذہب سے لوگوں کو پھیر دیا ہے اچھا بھلا ہمارا شہر تھا۔ اردگرد کے لوگوں کی اکثریت یہاں جمع ہوتی تھی۔ اس شخص نے بتوں کی پرستش سے منع کر کے تفرقہ ڈال دیا ہے۔ آج میں طے کر کے نکلا ہوں کہ اس بندے کو قتل کر دیا جائے اور یہ معاملہ ختم ہو۔ انہوںؓ نے کہا تم اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے نکلے ہو اور تمہیں اپنے گھر کی خبر نہیں۔ تمہارے بہن بہنوئی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ آپ وہیں سے بہن کے گھر کی طرف پلٹ گئے۔ پہنچے تو دروازہ بند تھا اور اندر حضرت خباب بن ارتؓ انہیں سورہ طٰہٰ کی ابتدائی آیات پڑھا رہے تھے۔ آپ نے دروازہ کھٹکھٹایا تو انہوں نے حضرت خبابؓ کو چھپا دیا اور دروازہ کھولا۔ آپ بہت غصہ میں تھے فوراً پوچھا، میں نے خود سنا ہے تم کچھ پڑھ رہے تھے۔ بہن اور بہنوئی نے ٹالنے کی کوشش کی تو آپ نے کہا میں دروازے پر کھڑا سن رہا تھا مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم نے بھی نیا دین اپنا لیا ہے۔ یہ کہہ کر بہنوئی پر جھپٹے بہن درمیان میں آئی تو انہیں دھکیل دیا، ان کا سر کسی چیز سے ٹکرایا، پھٹ گیا اور خون بہنے لگا لیکن بہن اور بہنوئی نے واشگاف الفاظ میں کہہ دیا کہ وہ مسلمان ہو چکے ہیں۔

علامہ باذل نامی ایک شیعہ عالم تھے، ایران سے تعلق تھا۔ 'حملہ حیدری' کے نام سے انہوں نے تاریخ لکھی ہے۔ اس کتاب میں اب کافی تبدیلیاں کر دی گئی ہیں اور اصل نسخہ نایاب ہے۔ چونکہ اس کتاب میں بہت سی حقیقتیں لکھ دی گئی تھیں بعد میں وہ حقائق تبدیل کر کے ویسے ہی اشعار لکھ کر اس میں ملا دیے گئے جیسا 'مثنوی' مولانا رومؒ میں اشعار بنا کر شامل کر دیے گئے ہیں جو مولانا روم کے نہیں ہے۔ 'حملہ حیدری' میں بھی بہت سی تبدیلیاں کی جا چکی ہیں۔ اس کا اصل نسخہ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے پاس تھا۔ وہ اب ہماری لائبریری میں بحمد للہ موجود ہے۔ اس واقعے کو نقل کرتے ہوئے علامہ باذل کہتا ہے۔

گر شاد باشی ور ملول — نمودیم دینِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم قبول

گر بکشی سر بر آریم پیش — دلے باز نگردیم از دین خویش

بہن اور بہنوئی نے کہا کہ آپ اس بات پر خوش ہوں یا ناراض۔ آپ کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے لیکن حق یہ ہے کہ ہم نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا دین قبول کر لیا ہے۔ اگر آپ ہمارے قتل پر آمادہ ہیں تو ہمارے سر حاضر ہیں لیکن آپ ہم سے یہ اُمید نہ رکھیں کہ ہم دینِ حق سے پھر جائیں گے۔ بہن کا پھٹا ہوا سر دیکھا، یہ حقیقت سنی تو ششدر رہ گئے۔ کہنے لگے مجھے وہ دکھاؤ جو پڑھ رہے تھے۔ بہن نے کہا، آپ پہلے غسل کر کے پاک ہو جائیں کہ یہ صحیفہ پاک ہے چنانچہ آپ غسل کر کے آئے اور صحیفہ دیکھا تو اس میں سورۂ طٰہٰ کی ابتدائی آیات تھیں یعنی طٰهٰ ① مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ② تا۔۔۔ تَحْتَ الثَّرٰى ⑥

کلامِ الٰہی پڑھ کر ششدر رہ گئے کہنے لگے، یہ بہت خوبصورت کلام ہے، بے حد پُرتاثیر ہے۔ کیا عظیم ذات ہے جس کا یہ کلام ہے۔ اور بات تو یہیں ختم ہوگئی کہ یہ سارے زمین و آسمان، فرش و عرش اسی نے بنائے ہیں۔ سب کچھ اس کے قبضہء قدرت میں ہے۔ عرش کا مالک بھی وہی ہے، زمینوں آسمانوں میں جو کچھ ہے اور تحت الثریٰ، سب کا مالک وہ ہے تو پیچھے کون رہ گیا، جس کی ہم پوجا کریں۔ جب کوئی اور مالک ہی نہیں تو ہم اس کے دروازے پر سر کیسے جھکائیں چنانچہ آپ نے کلمہ پڑھ لیا۔

یہ سن کر حضرت خبابؓ باہر نکل آئے اور حضرت عمرؓ کو مبارکباد دی کہ انہوں نے گزشتہ کل حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کو دعا فرماتے سنا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم فرما رہے تھے:

اللھم ایّد الاسلام بابی الحکم بن ھشام او بعمر بن الخطّاب۔ یا اللہ ابوالحکم بن ہشام یا عمر بن الخطاب میں سے کسی ایک سے اسلام کو تقویت پہنچا۔ خبابؓ نے کہا لگتا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعا آپ کے حق میں قبول ہوگئی ہے۔ پھر خبابؓ کے ساتھ بارگاہِ نبوی میں حاضر ہوئے اور اسلام لے آئے۔

سارا قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے لکھا گیا:

اس واقعے سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہجرت سے پہلے بھی جو قرآن نازل ہوتا تھا اُسے لکھ لیا جاتا تھا۔ کم و بیش سترہ ایسے خوش بخت افراد ہیں جو کاتبانِ وحی ہیں۔ ان میں سے سات، آٹھ زیادہ مشہور ہیں۔ سارا قرآنِ حکیم حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے سامنے لکھا گیا اور ہر آیت کو اس کی جگہ پر متعین بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے فرمایا لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ قرآن حکیم عہدِ عثمانی میں مرتب ہوا۔

عہدِ عثمانی میں ایک لہجہ پر اتفاق ہوا:

حضرت عثمانؓ کا کارنامہ یہ ہے کہ آپؓ نے صحابہؓ کی ایک کمیٹی بنا کر یہ کام اُن کے سپرد کیا کہ قرآن حکیم کو اس لہجے پر متعین کر دیا جائے جو لہجہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہے۔ محققین کہتے ہیں کہ ایک ہی زبان کا ہر تین میل کے بعد لہجہ مختلف ہو جاتا ہے۔ الفاظ وہی ہوتے ہیں، ادائیگی کا طرز بدل جاتا ہے۔ عہدِ نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام میں اجازت تھی کہ ہر آدمی اپنے لہجے میں قرآن پڑھے اور لکھے۔ اسلام دور دور علاقوں میں پھیل گیا تو حضرت عثمانؓ نے اہتمام فرمایا کہ جو لہجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا تھا اور جو مدینہ منورہ میں تھا اُسے اختیار کیا جائے، باقی سارے لہجے ترک کر دیے جائیں۔ آپؓ نے آنے والے ادوار کی ضرورت کو سمجھ لیا تھا کہ چونکہ اسلام دنیا میں پھیل رہا تھا، مختلف زبانیں بولنے والے قرآن کو مختلف لہجوں میں پڑھیں گے لہٰذا سب کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کے لہجے پر متفق کر دیا

جائے۔تب سے لے کر آج تک ہر جگہ وہی لہجہ ہے جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا۔

اللہ کا علم حضوری ہے:

فرمایا: وَاِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَاَخْفٰى ۝ بندہ بات کرے تو اللہ تعالیٰ پہلے سے جانتا ہے،کوئی پوشیدہ رکھے تو وہ اسے بھی جانتا ہے۔ بندے کے دل دماغ میں کوئی خیال آئے وہ اس سے آگاہ ہے۔ وہ اُن خیالات سے بھی واقف ہے جن سے بندہ خود واقف نہیں۔ کسی بندے نے ابھی سوچا ہی نہیں،کبھی وقت آنے پر جو سوچے گا وہ اسے بھی جانتا ہے۔اس کا علم حضوری ہے۔سارے علوم اس کی بارگاہ میں حاضر ہیں۔ وہ ہر شئے کو ہر وقت جانتا ہے۔فرمایا،تم کھلی بات کرو یا چھپا کر،اخفٰی ،یعنی وہ بات جو دل کی گہرائی میں چھپی ہوتی ہے اللہ اسے بھی جانتا ہے۔

اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۔۔۔وہ ایک ہے،اس کے علاوہ کوئی حق نہیں رکھتا کہ اس کی عبادت کی جائے۔کسی کو یہ حق نہیں اس لیے کہ اس کائنات میں کوئی کسی ایک ذرّے کا بھی مالک نہیں۔ نہ خالق ہے نہ مالک،نہ جاننے والا۔ یہ صرف اُس کی ذات ہے۔ساری کائنات کا خالق بھی وہی ہے، ہر لحہ اس سے آگاہ ہے، اسے چلا بھی رہا ہے، سنبھالا بھی ہوا ہے۔وہ اکیلا مالک ہے جس چیز کو مٹا دیتا ہے مٹ جاتی ہے جسے باقی رکھتا ہے باقی رہتا ہے۔ ہر چیز اس کے دستِ قدرت میں ہے اس لیے کہ وہ اللہ ہے۔ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۝ ہر خوب صورت نام اسی کا ہے۔ہر خوبی جہاں کمال کو پہنچتی ہے، انتہائے کمال پر جو نام بنتا ہے وہ نام اُسی ذات کا ہے۔کسی حوالے سے آئیں،علم کے راستے سے آئیں، ادب کے راستے سے،طب کے راستے سے،سائنس کے یا کسی بھی شعبے سے آئیں،انتہا پہ جو نام ہوگا، جو سب سے اوپر ہوگا وہ اس کا ہے۔سارے خوبصورت نام اس کے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ مبارک:

فرمایا:وَهَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۝ اگر آپ کو عجائباتِ قدرت دیکھنے ہوں تو آپ کو موسیٰ علیہ السلام کی بات سنائیں؟ فرمایا، کیا آپ تک موسیٰ علیہ السلام کا قصہ پہنچا؟ موسیٰ علیہ السلام کی حیاتِ مبارکہ مختلف النوع، حیرت انگیز واقعات سے پُر ہے۔ ہر واقعہ ربّ کریم کی عظمت کی نشانی ہے۔ایک یہی شاہکار واقعہ قدرتِ الٰہی کا مظہر ہے کہ ایک انتہائی طاقتور، دولت مند، بہت بڑی فوج رکھنے والا، بہت بڑا فاتح اور بہت بڑی سلطنت کا اکیلا مالک اور شہنشاہ جو اتنا بگڑا ہوا تھا کہ خود کو خدا کہتا تھا۔مخلوق سے سجدے کرواتا تھا۔ظالم اتنا تھا کہ اس نے تانبے کی ایک گائے بنوا رکھی تھی جو اسے سجدہ نہیں کرتا تھا اُسے گائے کے پیٹ میں بند کر کے آگ پر رکھوا دیتا۔قرآن اسے میخوں والا فرعون کہتا ہے۔فرمانِ باری ہے: وَفِرْعَوْنَ ذِى الْاَوْتَادِ (الفجر:9) فرعون ایسی شدید ایذائیں دیتا کہ بندہ

تڑپ تڑپ کر مر جاتا۔ لوگوں کو دیوار کے ساتھ لٹکا کر ہاتھ پاؤں اور ٹانگوں میں میخیں گاڑ دیتا بہت ظالم اور جابر تھا۔ موسیٰ علیہ السلام کی پوری قوم اس کا ظلم و جبر سہہ رہی تھی۔ اُن سے بلا اجرت سارا سارا دن کام لیتا، جو سستی دکھاتا اُسے کوڑے مارے جاتے۔ اسے کسی نجومی نے بتایا کہ اسی قوم میں ایک ایسا بچہ پیدا ہوگا جو تمہارا سارا نظام تلپٹ کر دے گا، حکومت الٹ جائے گی اور تم تباہ ہو جاؤ گے۔ اس پر اس نے حکم دے دیا کہ بنی اسرائیل میں جو بچہ بھی پیدا ہو اسے قتل کر دیا جائے۔ اس طرح اس نے بنی اسرائیل کے لاکھوں بچے قتل کرا دیے۔ پھر قبطیوں نے کہا کہ بنی اسرائیل کی ساری قوم ہماری خدمتگار ہے۔ جو لوگ اب زندہ ہیں یہ بوڑھے ہو جائیں گے اور ان کی مزید اولاد کو آپ قتل کرا دیتے ہیں تو ہماری خدمت کون کرے گا؟ اس نے فیصلہ کیا کہ لڑکیوں کو زندہ رہنے دیا جائے اور لڑکوں کو قتل کر دیا جائے پھر یہ فیصلہ دیا کہ ایک سال میں پیدا ہونے والے بچوں کو زندہ رہنے دیا جائے اور دوسرے سال میں پیدا ہونے والوں کو قتل کر دیا جائے۔ جس سال بچوں کو قتل کیا جاتا تھا اس سال موسیٰ علیہ السلام پیدا ہوئے۔ اللہ ایسا قادر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو لے کر فرعون کے گھر جا چھوڑا کہ جس سے بچنے کی خاطر تو لاکھوں بچوں کو قتل کروا رہا ہے اس کو تو خود پال۔ وہ ایسا قادر ہے کہ اس نے فرعون سے موسیٰ علیہ السلام کی پرورش کرائی۔

جب جوان ہوئے تب بھی بہت سے واقعات رونما ہوئے۔ طویل قصہ ہے۔ فرعون نے ان کے قتل کا حکم دے دیا تو آپ مصر سے نکل گئے۔ سفر کرتے کرتے مدین جا پہنچے۔ وہاں حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس جا پہنچے۔ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی بیٹی کا رشتہ بھی دیا اور کچھ عرصہ وہاں رہنے کا بھی کہا۔ سالوں پر محیط جب وہ مدت پوری ہوئی تو آپ اپنے اہل خانہ کو لے کر واپس مصر کے لیے روانہ ہوئے۔ ایک خادم بھی ساتھ تھا۔

اللہ کریم نے ان آیات میں بات وہاں سے شروع کی جب آپ علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے۔ فرمایا: هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ۞ اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ۞ جب شعیب علیہ السلام سے اجازت لے کر مصر کو روانہ ہوئے تو راستے میں رات ہو گئی موسم سرد تھا۔ آپ علیہ السلام نے ایک جگہ روشنی دیکھی تو سمجھا شاید وہاں آگ جل رہی ہے۔ اگر آگ ہے تو کوئی جلانے والا بھی ہوگا تو آپ علیہ السلام نے اہل و عیال سے فرمایا، آپ لوگ یہیں ٹھہریں، میں آپ کے لیے وہاں سے آگ لے آتا ہوں تاکہ یہاں آگ جلا کر سردی سے بچیں اور رات بسر کر لیں یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جن لوگوں نے وہاں آگ جلا رکھی ہے وہ ہماری راہنمائی کر سکیں کہ مصر کو جانے والا مختصر ترین راستہ کون سا ہے۔ آپ علیہ السلام روشنی کی طرف چل پڑے۔

موسیٰ علیہ السلام کا شرف:

فرمایا: فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ⑪ جب قریب پہنچے تو آواز آئی: يٰمُوْسٰى اے موسیٰ! یہاں خطاب کرنے والے خود اللہ کریم ہیں اور خطاب ہے موسیٰ علیہ السلام کو۔ موسیٰ علیہ السلام کو ذاتِ باری سے بلاواسطہ کلام کرنے کا شرف عطا ہوا۔ اس کا مطلب ہے اللہ کریم جس سے کلام کرنا چاہیں تو براہ راست ذاتِ باری سے کلام ہو سکتا ہے۔ علمائے حق فرماتے ہیں کہ جب اللہ کی طرف سے خطاب ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام کے صرف کان ہی نہیں سنتے تھے بلکہ بدن کا ذرّہ ذرّہ سنتا تھا۔

جب ندا دی گئی کہ اے موسیٰ! آپ علیہ السلام متوجہ ہوئے تو فرمایا: اِنِّيْٓ اَنَا رَبُّكَ ۔۔۔ میں آپ کا پروردگار ہوں۔ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۔۔۔ آپ اپنے جوتے اتار دیجیے۔ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ⑫ آپ طویٰ کی مقدس وادی میں ہیں۔

مفسرین کے مطابق اس زمانے میں کھالوں کی دباغت نہیں کی جاتی تھی ویسے ہی کھال سکھا کر جوتے بنا لیے جاتے تھے۔ مسئلہ یہ ہے کہ خنزیر کے سوا کسی بھی جانور کی کھال کی جب دباغت ہو جائے تو وہ پاک ہو جاتی ہے۔ دباغت شدہ کھال سے جوتا بنایا جائے اور اس کے ساتھ کوئی ناپاکی نہ لگی ہو تو اس میں نماز ہو جاتی ہے، مسجد بھی جایا جا سکتا ہے بشرطیکہ جوتا ناپاک نہ ہوا۔ ہر جوتے میں نماز نہیں ہوتی۔ صرف صاف اور پاک جوتے میں ہو سکتی ہے۔ چونکہ اس وقت دباغت کے بغیر ہی جوتے بنتے تھے اس لیے فرمایا گیا کہ یہ میدان پاک ہے، آپ جوتے اتار کر رکھ دیں اور ننگے پاؤں حاضر رہیں۔

نبیؑ ازل سے نبیؑ ہوتا ہے:

موسیٰ علیہ السلام جب وادیٔ طویٰ میں پہنچے تو ارشادِ باری ہوا: وَاَنَا اخْتَرْتُكَ ۔۔۔ ہم نے آپ کو نبوت و رسالت کے لیے چُن لیا، منتخب فرمالیا۔ آپ (علیہ السلام) اللہ کے نبیؑ مبعوث ہو گئے ہیں۔ نبیؑ ازلی نبیؑ ہوتے ہیں۔ اللہ کریم تخلیقی طور پر انبیاءؑ کو نبوت کے لیے چُن لیتے ہیں۔ نبیؑ ہر حال میں نبیؑ ہوتا ہے۔ نبوت نبیؑ کی ذات کا وصف ہوتی ہے۔ دنیا میں، برزخ میں، آخرت میں، جنت میں نبیؑ، نبیؑ ہی ہوگا۔ یہاں یہی فرمایا گیا کہ آپ (علیہ السلام) اب نبیؑ مبعوث ہو گئے ہیں۔

بعثت اور اعلانِ نبوت:

نبیؑ جب مبعوث ہوتا ہے تب اعلانِ نبوت کا مکلف ہوتا ہے۔ اس پر وحی کا نزول ہوتا ہے۔ جو احکامِ الٰہی

نازل ہوتے ہیں، انہیں آگے پہنچاتا ہے۔ فرمایا: فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی ﴿۱۳﴾ آپ پر جو وحی کی جارہی ہے اسے پوری توجہ سے سنیے۔ نبیؑ ہی وہ ہستی ہے جو اللہ کے احکام کو وصول کرتا ہے اور بندوں تک پہنچاتا ہے۔ انبیاءؑ ہی بتاتے رہے ہیں کہ اللہ کی رضا کس بات میں ہے اور کس بات میں اللہ کی رضا نہیں ہے۔ اللہ کا نبیؑ اور رسولؐ پوری زندگی کا نصاب بتاتا ہے۔ عقائد وافکار سے لے کر اعمال وکردار تک، اور ذاتی معاملات سے لے کر خاندانی، ملکی و بین الاقوامی ہر شعبہء حیات میں اللہ کا نبیؑ ہی راہنمائی فرماتا ہے۔ ان قواعد وضوابط کے دائرہ میں رہنا نیکی ہے اور ان سے باہر نکل کر زندگی گزارنا نافرمانی ہے۔ فرمایا، آپ (علیہ السلام) پوری توجہ سے سنیں۔ سب سے بنیادی بات یہ ہے: اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ۔۔۔ فرمایا، بے شک میں ہی اللہ ہوں۔

دین کی بنیاد، عقیدۂ توحید:

فرمایا: لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۔۔۔ میرے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں۔ کسی کا کوئی حق نہیں کہ وہ مخلوق سے اپنی عبادت کروائے لہٰذا صرف میری ہی عبادت کی جائے۔ خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ عبادت کیا ہے۔ صرف صلوٰۃ، روزہ ہی عبادت نہیں۔ یہ بڑا نازک مقام ہے۔ یاد رہے! نفع کی امید پر یا نقصان کے ڈر سے جب ہم کسی کی اطاعت کریں تو وہ عبادت بنتی ہے۔

اللہ کا حکم ہوا، اللہ کے نبی علیہ السلام نے پہنچا دیا، بندے نے اللہ کا حکم مان لیا تو معاملہ درست ہے لیکن جب کوئی بندوں سے امیدیں وابستہ کر کے ان کی اطاعت میں خلافِ شریعت کام کرتا ہے اور اسے یہ امید ہوتی ہے کہ اس سے اسے کچھ فائدہ ملے گا اور اگر نہیں کرے گا تو اس کا نقصان ہو جائے گا تو یہ عمل درحقیقت اس انسان کی عبادت کرنا ہے۔ عبادت صرف اللہ کا حق ہے۔ دوسروں کی عبادت کرنا شرک ہے۔

صلوٰۃ، یادِ الٰہی کے لیے:

فرمایا: وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ﴿۱۴﴾ میرے ذکر، میری یاد کے لیے صلوٰۃ ادا کیجیے۔ سوال یہ ہے کہ کیا صلوٰۃ (نماز) خود ذکر نہیں ہے؟ صلوٰۃ میں اللہ کی عظمت بیان ہوتی ہے، تکبیر میں اللہ کی بڑائی بیان ہوتی ہے، حمد وثنا کے بعد اپنی گزارشات پیش کی جاتی ہیں، رکوع وسجود میں عظمتِ الٰہی کی تسبیحات ہوتی ہیں، اللہ کی وحدانیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجنا، دعا کرنا یہ سارا ذکر ہی ہے اور بہترین ذکر ہے، لیکن یہ ذکرِ دوام نہیں ہے۔ جتنے لمحے بندہ صلوٰۃ ادا کرتا رہا یقیناً وہ ذکر ہی کرتا رہا بشرطیکہ اس کے دل کو حضورِ حق حاصل ہو۔

اس کے برعکس جس کا محض وجود رکوع وسجود کرتا رہا اور اس کا دل کسی اور چیز میں اٹکا رہا، اسی کے گرد گھومتا رہا یعنی جس کے دل میں اللہ کی بات نہ اترے، جس کے دل میں اللہ کی یاد نہ ہو اس کے دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ایسے لوگ مسجد سے بھی جوتے چُرا لیتے ہیں، جائز ناجائز کی تمیز کیے بغیر وسائل جمع کر لیتے ہیں، معاملات میں خلافِ شریعت چلتے رہتے ہیں۔

قرآن حکیم صلوٰۃ کے بارے فرماتا ہے: اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَاۤءِ وَالْمُنْکَرِ۔۔۔ (العنکبوت:45) یقیناً صلوٰۃ، برائی اور بے حیائی سے روک لیتی ہے تو پھر انہیں کیوں نہیں روکتی جو صلوٰۃ ادا کرنے کے باوجود حلال حرام کی پروا نہیں کرتے؟ اس لیے کہ صلوٰۃ کو صحیح ادا نہیں کرتے۔ کچھ الفاظ یاد ہیں انہیں زبانی دہرا دیتے ہیں، اس میں جو حضورِ حق حاصل ہونا چاہیے، جس سے برائی اور بے حیائی سے رکنا نصیب ہو، وہ حاصل نہیں ہوتا۔

فرمایا، صلوٰۃ، اللہ کی یاد کے لیے ہے۔ ارشاد نبوی علیہ الصلوٰۃ والسلام ہے: اِنَّ اَحَدَ کُمْ اِذَا قَامَ فِی الصلوٰۃ فَاِنَّہٗ یُنَاجِیْ رَبَّہٗ او کما قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بخاری) بے شک تم میں سے جب کوئی اپنی صلوٰۃ میں کھڑا ہوتا ہے تو پس وہ اپنے رب سے سرگوشی کر رہا ہوتا ہے یعنی حالتِ صلوٰۃ میں بندے کے آگے سے مت گزرو کہ وہ اپنے پروردگار سے سرگوشیوں میں اپنا حالِ دل کہہ رہا ہوتا ہے۔ وہ بندہ جو اپنے ربّ سے باتیں کرتا ہے، خشوع سے رکوع وسجود کرتا ہے تو وہ مسجد سے باہر نکل کر کیسے اللہ کی نافرمانی کر سکتا ہے؟

اس کا مطلب ہے کہ صلوٰۃ میں جس کا دل ساتھ نہیں ہوتا وہ خانہ پری کرتا ہے۔ جب کیفیات دل میں نہیں اترتیں تو پھر نماز میں اٹھے بیٹھے، رکوع اور سجدہ کیا اس کے بعد پھر جو جی میں آیا وہ کیا۔ اللہ کریم فرماتے ہیں، میری یاد کے لیے نماز ادا کریں یعنی صلوٰۃ ادا کرنے سے دل میں اللہ کی یاد بس جائے۔ بات کرتے ہوئے اللہ کی یاد دل میں ہو، خلافِ شرع کوئی بات زبان سے نہ نکلے۔ کام کرتے وقت اللہ کی یاد سینے میں ہو، دل اللہ کی یاد پہ قائم ہو جائے، اس میں اللہ کی یاد قرار پکڑ لے۔ اسی لیے قرآن کریم نے ذکرِ دوام پر زور دیا ہے کہ اللہ کی یاد دل میں رچ بس جائے۔ ساری عبادات کا حاصل بھی یادِ الٰہی ہی ہے۔

قیامت کا آنا یقینی ہے:

فرمایا: اِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ ۔۔۔ یقیناً قیامت آنے والی ہے۔ اس کے وقوع پذیر ہونے میں رائی برابر شبہ نہیں۔ اَکَادُ اُخْفِیْھَا لِتُجْزٰی ۔۔۔ فرمایا، ہم اسے مخلوق سے پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس میں اللہ کریم کی رحمت ہے کہ اس عظیم حادثے کے واقع ہونے کو پوشیدہ رکھا۔ اگر لوگوں کو بتا دیا جائے تو ان کی زندگی اجیرن ہو جائے،

وہ زندہ نہ رہ سکیں۔ کسی کو موت کا وقت بتا دیا جائے تو اس کا وجود شل جاتا ہے، حواس مختل ہو جاتے ہیں۔ فرمایا: اَكَادُ اُخْفِیْهَا۔۔۔ اللہ کریم چاہتے تھے کہ اسے پوشیدہ رکھیں اور جب یہ قائم ہو لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ﴿۱۵﴾ تو ہر ایک کو وہ بدلہ دیا جائے جس کے لیے وہ دنیا میں محنت کرتا تھا، جس کے لیے وہ کاوش کرتا رہا۔ اس آیہء کریمہ کے آئینے میں ہر شخص اپنا جائزہ لے سکتا ہے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ کس انجام کی طرف لے جائے گا۔ اگر شریعت کے مطابق مزدوری کرتا ہے، تجارت کرتا ہے، حلال رزق کماتا ہے، دنیا کی سہولتیں حاصل کرتا ہے تو یہ سب کچھ نیک انجام کی طرف لے جائے گا۔ دنیا بھی اچھی اور آخرت کا اجر بھی عطا ہوگا۔ اگر خلافِ شریعت کرتا ہے، ناجائز وسائل اختیار کرتا ہے تو دنیا کی بے سکونی مقدر ہے اور آخرت میں تہی دست ہوگا نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ قیامت کا آنا یقینی ہے۔ وہاں دیکھا جائے گا کہ کون کس کے لیے محنت کرتا رہا، اس کا مدعا کیا تھا؟ اسی کے مطابق اسے بدلہ دیا جائے گا۔

استقامت کے لیے مضبوط یقین:

روئے زمین پر بے شمار ایسے بدنصیب لوگ ہیں کہ انہیں نہ قیامت کے آنے کا یقین ہے نہ آخرت کے اجر کو مانتے ہیں۔ اُن کے ذہن میں دنیا بسی ہوئی ہے۔ ہر ناجائز ذریعے سے دولت جمع کرنا چاہتے ہیں، اقتدار چاہتے ہیں۔ اللہ کریم اپنے بندوں کو خطاب کر کے فرماتے ہیں: فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ﴿۱۶﴾ کہ اتنا مضبوط یقین رکھو اور تمہارا عمل اتنا پرخلوص اور شریعت کے عین مطابق ہونا چاہیے کہ یہ بدنصیب جو اس یقین سے محروم ہیں وہ تمہیں اپنے ساتھ نہ لے جا سکیں، جو قیامت کو مانتا ہی نہیں وہ کہیں آپ کو بھی بھٹکا نہ دے۔ وہ تو اپنی خواہشات کی پیروی میں لگا ہوا ہے اگر تم لوگ بھی اس کے ساتھ مل جاؤ گے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ جب نظریہ، عقیدہ اور کردار کافروں جیسا ہو جائے تو محض نام سے کیا ہوتا ہے کہ مسلمانوں والا نام رکھ لیں۔ یاد رہے ایمان مضبوط ہو تو اعمال صالح ہوتے ہیں، اعمال، ایمان کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جس طرح ساری شاخیں درخت کے تنے سے نکلتی ہیں اسی طرح ایمان تنا ہے اور اعمال اس کی شاخیں ہیں۔ جب تنا مضبوط ہو تو شاخیں ہری بھری ہوتی ہیں۔ اگر تنا سوکھنا شروع ہو جائے تو شاخوں کو متاثر کرتا ہے، وہ بھی سوکھ جاتی ہیں۔ اسی طرح اعمال پر ایمان اثر انداز ہوتا ہے اور اعمال درست ہوں تو ایمان کی مضبوطی کا باعث ہوتے ہیں۔ اعمال و کردار بگڑنا شروع ہو جائے، بندہ گناہ میں مبتلا ہو جائے اور توبہ نہ کرے تو بالآخر ایمان کو بھی لے ڈوبتا ہے۔ فرمایا گیا کہ جو لوگ قیامت کے قائل نہیں یا جن کا کردار شریعت سے ہٹا ہوا ہے ان میں گھل مل جاؤ گے تو تم بھی ویسے ہی ہو جاؤ گے پھر ایسا نہ ہو کہ تمہارا ایمان بھی ضائع ہو جائے۔

مغربی ممالک میں سکونت کی شرط:

مختلف وجوہات کی بنا پر مغربی ممالک میں سکونت اختیار کرنے کا رجحان بہت ہو چکا ہے۔ یہ آیت اس کے لیے شرط بتارہی ہے۔ علمائے تفسیر نے اس کی تشریح کی ہے کہ اللہ کے ایسے بندے جو کفار کے درمیان رہ کر کسی نہ کسی کافر کو اپنے ساتھ مسلمان بنا لیتے ہوں اور ان کی وجہ سے لوگوں کی اصلاح ہو جاتی ہو، ایسے بندوں کو ضرور جانا چاہیے۔ دوسرے درجے میں ایسے مسلمان جو خود کو بچا کر رکھتے ہوں جو کفار کی تہذیب میں نہ ڈھلتے ہوں اُن کے لیے جائز وجوہات کی بنا پر مغربی ممالک میں جانا جائز ہے لیکن وہ لوگ جو مرعوب ہو کر یا مجبور ہو کر کفار کے ساتھ گھل مل جائیں ایسوں کا وہاں جانا حرام ہے۔ انہیں وہاں نہیں جانا چاہیے۔

وَمَا تِلْكَ بِيَمِينِكَ يٰمُوسٰى ﴿۱۷﴾ فرمایا، اے موسیٰ (علیہ السلام) آپ کے داہنے ہاتھ میں کیا ہے؟ اللہ کریم تو ہر بات سے ہر وقت آگاہ ہیں پوچھ کر انہیں اس طرف متوجہ کرنا مقصود تھا کہ دیکھو! آپ کے ہاتھ میں کیا ہے۔ کیونکہ اس عصا کے ساتھ ایک معجزہ منسلک ہونا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی: قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ أَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَأَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِي وَلِيَ فِيهَا مَاٰرِبُ أُخْرٰى ﴿۱۸﴾ یہ میری لاٹھی ہے۔ میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور اپنی بکریوں پر اس سے پتے جھاڑتا ہوں اور اس میں میرے لیے اور بھی کئی فائدے ہیں۔

لذتِ ہمکلامی:

کلامِ الٰہی ہو، مخاطب اللہ کا نبیؑ اور رسول علیہ السلام ہو تو کلام الٰہی کی لذت وہی جان سکتے ہیں جنہیں نصیب ہوئی۔ موسیٰ علیہ السلام تو تجلیات وانوارات الٰہی کی بارش میں کھڑے تھے۔ سوال تو مختصر تھا کہ ہاتھ میں کیا ہے؟ لیکن لذتِ ہمکلامی نے مجبور کر دیا اور آپؑ نے بات کو لمبا کر دیا۔ کیا خوب شعر کہا کسی نے ۔

بیک لفظِ تواں گفتن تمنائے جہانِ را
من از ذوق حضوری طول دادم داستانِ را

کہ جب آپ سے بات ہوئی تو میں نے بات کی لذت لینے کے لیے بات کو لمبا کر دیا۔ میں نے تو حضوری کے شوق میں شرفِ ہمکلامی کی لذت میں گم ہو کر بات کو طویل کر دیا۔ انبیا ومرسلین کی شان جدا ہے۔ ذوقِ حضوری ایسا کہ بات کی لذت میں محو ہو گئے اور حدِ ادب کو ملحوظ رکھنا ایسا کہ بات کہتے کہتے اسے یکدم مختصر بھی کر دیا کہ کہیں حد ادب سے نہ گزرے اور فرمایا: وَلِيَ فِيهَا مَاٰرِبُ أُخْرٰى ﴿۱۸﴾ اس سے میں اور بھی بہت سے کام لیتا ہوں۔ لذتِ ہمکلامی کے لیے پہلے عصا سے لیے جانے والے کاموں کا تذکرہ کیا پھر حدِ ادب کے لیے یکدم بات کو مختصر بھی کر

دیا۔ یہ شان ہے اللہ کے نبیوں، رسولوں علیہم السلام کی، اللہ کے محبوب بندوں کی!

کسی کا تعلق ہو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے، وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا صحابیؓ ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اس سے ہمکلام ہوں تو اس کلام کی لذت کیا ہے، یہ میں اور آپ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ لذت وہی جانتے ہیں جن کو نصیب ہوئی۔

ہمارا حال یہ ہے جو کہا گیا تھا 'دل دارند و محبوب ندارند' کہ دل تو سینے میں ہے لیکن ان کا کوئی محبوب نہیں ہے۔ کسی کا کسی شیخ سے تعلق ہو اور وہ شیخ واقعی اللہ کا بندہ ہو تو اس سے بات کرنے میں کیا مزہ آتا ہے یہ وہی جانتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے معجزات:

قَالَ اَلْقِهَا یٰمُوْسٰی ⑲ باری تعالیٰ نے فرمایا، اے موسیٰ (علیہ السلام)! اسے زمین پر ڈال دیجیے فَاَلْقٰىهَا۔۔۔ تعمیلِ ارشاد میں آپؑ نے عصا زمین پر پھینک دیا۔ فَاِذَا هِیَ حَیَّةٌ تَسْعٰی ⑳ انؑ کے پھینکتے ہی وہ لاٹھی اژدھا بن گئی۔ بہت بڑا اژدھا جو اِدھر اُدھر بھاگ رہا تھا اور پھنکار رہا تھا۔ قَالَ ۔۔۔ ارشاد ہوا: خُذْهَا وَلَا تَخَفْ سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰی ㉑ اس کو پکڑ لیں اور ڈریں نہیں۔ جب آپؑ اسے پکڑیں گے تو ہم اسے پھر سے لاٹھی بنا دیں گے۔ چنانچہ جب موسیٰ (علیہ السلام) نے پکڑا تو وہی لاٹھی تھی۔

تمام انبیاء و رسل علیہم السلام اللہ کے مقرب بندے ہوتے ہیں لیکن انسانی خصوصیات سے مبرا نہیں ہوتے۔ ایک اژدھا کو دیکھ کر موسیٰ (علیہ السلام) کو بھی فطری طور پر خوف آیا۔ جیسے ہی ارشادِ باری ہوا فوراً تعمیلِ ارشاد کی۔

ید بیضا:

موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کریم نے بہت سے معجزات عطا فرمائے۔ یہاں پہلے لاٹھی کے اژدھا بننے اور پھر لاٹھی بن جانے کے معجزہ کا ذکر ہوا اور دوسرا ید بیضا کا ذکر ہو رہا ہے۔ فرمایا: وَاضْمُمْ یَدَكَ اِلٰی جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ اٰیَةً اُخْرٰی ㉒ دوسری نشانی یہ ہے کہ آپ (علیہ السلام) اپنا دائیاں ہاتھ بغل میں رکھیں، اسے باہر نکالیں وہ بغیر کسی عیب کے روشن ہوگا۔ ایسا سفید روشن ہوگا جس میں کوئی داغ نہیں ہوگا، کوئی نقص نہیں ہوگا۔ موسیٰ علیہ السلام جب اسے بغل میں رکھ کر باہر نکالتے تو وہ روشن ہو جاتا۔ دوبارہ بغل میں رکھ لیتے تو پہلے جیسا ہو جاتا۔

معجزات کا مقصد:

فرمایا: لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ﴿٢٣﴾ تاکہ ہم آپؑ کو اپنی قدرت کی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔

معجزات، انبیاء علیہم السلام کی نبوت کے اثبات کے لیے ہوتے ہیں تاکہ اس سے ثابت ہوجائے کہ یہ اللہ کے نبیؑ ہیں اور لوگ اُن سے اللہ کریم کے ارشادات کو سنیں۔ معجزات وہ نشانیاں ہیں جن کا مقصد دین کی حقانیت عظمتِ الٰہی کا اثبات ہو حقانیتِ رسالت کا اثبات ہو اور لوگوں کے عقائد واعمال میں اصلاح ہو۔

موسیٰ علیہ السلام کو یہ معجزات کس مقصد کے لیے عطا ہوئے؟ فرمایا: اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٢٤﴾ موسیٰ (علیہ السلام)! آپ فرعون کے پاس جائیں۔ وہ حد سے گزر چکا ہے۔ سرکش ہو چکا ہے۔ اب اس سے بات کی جانی چاہیے۔

اللہ کریم نے طریقۂ تبلیغ یہ بتایا کہ سیدھے فرعون کے پاس جائیں، اس سے بات کریں اگر فرعون کو توبہ نصیب ہوگی تو ساری کی ساری قوم مسلمان ہوجائے گی۔

آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلّم کی عادت مبارکہ بھی یہی تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم قوم کے سرداروں کے پاس تشریف لے جاتے تھے کہ کوئی ایک بڑا آدمی سدھر جائے تو بے شمار لوگ جو اس سے وابستہ ہوتے ہیں ان کی اصلاح ہوجاتی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے سرکش کے پاس بھیجا جو خود کو صرف ربّ ہی نہیں ربِّ اعلیٰ کہتا تھا۔ یعنی سب سے بڑا ربّ۔ اپنی ذات کو سجدے کرواتا تھا، خود کو خدا کہلواتا تھا۔ اس کی بہت بڑی فوج تھی، بڑے خزانے کا مالک تھا، بے پناہ وسائل رکھتا تھا۔ فرمایا گیا کہ بے شک اس کے پاس بڑی فوجی طاقت ہے، افرادی قوت ہے، مال وزر ہے لیکن آپ (علیہ السلام) کے پاس حق ہے۔ آپ اللہ کے برحق نبی اور رسول علیہ السلام ہیں، آپ (علیہ السلام) کے پاس معجزات ہیں، وہ آپؑ کا مقابلہ نہیں کر سکے گا لہٰذا آپ (علیہ السلام) اس سرکش کے پاس جائیں۔

سورۃ طٰہٰ رکوع 2 آیات 25 تا 54

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿٢٥﴾ وَيَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ
لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿٢٨﴾ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿٣٠﴾
اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ﴿٣١﴾ وَاَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٣٢﴾ كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ﴿٣٣﴾ وَّنَذْكُرَكَ
كَثِيْرًا ﴿٣٤﴾ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ﴿٣٥﴾ قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ﴿٣٦﴾
وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰٓى ﴿٣٧﴾ اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ﴿٣٨﴾ اَنِ
اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَاْخُذْهُ
عَدُوٌّ لِّيْ وَعَدُوٌّ لَّهٗ ۭ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۥ وَلِتُصْنَعَ عَلٰي عَيْنِيْ ﴿٣٩﴾ اِذْ
تَمْشِيْٓ اُخْتُكَ فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰي مَنْ يَّكْفُلُهٗ ۭ فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ
تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ڛ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ
فُتُوْنًا ڣ فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ ڏ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰي قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿٤٠﴾
وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ﴿٤١﴾ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿٤٢﴾
اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿٤٣﴾ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿٤٤﴾
قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿٤٥﴾ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ
مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿٤٦﴾ فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ
اِسْرَاۗءِيْلَ ڏ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ

اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿۴۷﴾ اِنَّا قَدْ اُوْحِىَ اِلَيْنَآ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰى مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰى ﴿۴۸﴾
قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿۴۹﴾ قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ
هَدٰى ﴿۵۰﴾ قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۱﴾ قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا
يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا
سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾
كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۵۴﴾

انہوں نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! (اس کام کے لیے) میرا سینہ کھول دیں ﴿۲۵﴾ اور میرے لیے میرا کام آسان فرما دیں ﴿۲۶﴾ اور میری زبان پر سے (لکنت کی) گرہ کھول دیجیے ﴿۲۷﴾ (تاکہ) وہ میری بات سمجھ سکیں ﴿۲۸﴾ اور میرے لیے میرے کنبہ میں سے ایک معاون مقرر فرما دیجیے ﴿۲۹﴾ ہارون (علیہ السلام) کو کہ میرے بھائی ہیں ﴿۳۰﴾ اس سے میری قوت کو مضبوط فرما دیجیے ﴿۳۱﴾ اور اسے میرے کام میں شریک فرمایئے ﴿۳۲﴾ تاکہ ہم آپ کی بہت سی تسبیح کریں ﴿۳۳﴾ اور (خوب) کثرت سے آپ کا ذکر کریں ﴿۳۴﴾ بے شک آپ ہم کو (ہر حال میں) دیکھ رہے ہیں ﴿۳۵﴾ ارشاد ہوا اے موسیٰ (علیہ السلام)! آپ کی (ہر) درخواست قبول فرمائی گئی ﴿۳۶﴾ اور بے شک ہم نے آپ پر ایک بار اور بھی احسان فرمایا تھا ﴿۳۷﴾ جب ہم نے آپ کی والدہ کو الہام کیا تھا جو بات الہام سے بتانے کی تھی ﴿۳۸﴾ کہ ان (موسیٰ علیہ السلام) کو (جلادوں سے بچانے کے لیے) ایک صندوق میں رکھیں پھر ان کو دریا میں ڈال دیں پھر ان کو دریا کنارے تک لے آئے گا اور میرا اور ان کا دشمن ان کو اٹھا لے گا اور (اے موسیٰ علیہ السلام!) میں نے آپ کے اوپر اپنی طرف سے محبت ڈال دی (کہ جو دیکھے، پیار کرے) اور اس لیے کہ

آپ میرے سامنے پرورش پائیں ﴿۳۹﴾ جب آپ کی بہن چلتی ہوئی آئیں
(فرعون کے گھر) تو کہنے لگیں کہ کیا میں تم کو ایسے شخص کا پتہ دوں جو اس کی (بہت
اچھی طرح) پرورش کرے پھر ہم نے آپ کو آپ کی والدہ کے پاس واپس پہنچا دیا
تا کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور غم نہ کریں اور آپ نے ایک شخص کو قتل کر دیا تو ہم
نے آپ کو غم سے نجات عطا فرمائی اور ہم نے آپ کو بہت بہت آزمایا پھر آپ مدین
والوں میں کئی برس رہے پھر اے موسیٰ (علیہ السلام)! آپ (نبوت و رسالت کے)
انداز پر آ پہنچے ﴿۴۰﴾ اور میں نے آپ کو اپنے (کام کے) لیے
بنایا ﴿۴۱﴾ (اب) آپ اور آپ کا بھائی ہماری نشانیاں لے کر جائیں اور میری یاد
(میرے ذکر) میں سستی نہیں کیجیے گا ﴿۴۲﴾ دونوں فرعون کے پاس جائیں یقیناً وہ
سرکش ہو رہا ہے (حد سے نکل رہا ہے) ﴿۴۳﴾ پھر اس کے ساتھ نرم انداز میں
بات کیجیے گا ہو سکتا ہے وہ (غور کر کے) نصیحت حاصل کرے یا (عذاب سے) ڈر
جائے ﴿۴۴﴾ دونوں نے عرض کیا کہ اے ہمارے پروردگار! بے شک ہمیں خوف
ہے کہ وہ ہم پر زیادتی (نہ) کر بیٹھے یا (ہم پر زیادہ) شرارت (سرکشی نہ) کرنے
لگے ﴿۴۵﴾ ارشاد ہوا مت ڈریں بے شک میں آپ دونوں کے ساتھ ہوں
(سب) سنتا ہوں اور دیکھتا ہوں ﴿۴۶﴾ پس اس کے پاس جائیں پھر کہیں کہ ہم
دونوں تیرے پروردگار کے بھیجے ہوئے (پیغمبر) ہیں تو بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ
روانہ کر دو اور ان کو تکلیف نہ پہنچاؤ یقیناً ہم تیرے پاس تیرے پروردگار کی طرف
سے (نبوت کی) نشانی لے کر آئے ہیں اور سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی
کرے ﴿۴۷﴾ یقیناً ہماری طرف یہ وحی آئی ہے کہ جو شخص (حق کو) جھٹلائے اور
(اس سے) روگردانی کرے اس پر (اللہ کا) عذاب ہوگا ﴿۴۸﴾ وہ کہنے لگا اے
موسیٰ (علیہ السلام)! پھر تم دونوں کا پروردگار کون ہے؟ ﴿۴۹﴾ انہوں نے فرمایا
ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی شکل و صورت بخشی پھر (جینے کی) راہ

دکھائی ﴿۵۰﴾ (فرعون) کہنے لگا اچھا تو پہلے لوگوں (جو گزر چکے) کا کیا حال ہوا؟ ﴿۵۱﴾ فرمایا ان لوگوں کا علم میرے پروردگار کے پاس کتاب (دفترِ اعمال) میں ہے میرا پروردگار (اللہ) نہ غلطی کرتا ہے اور نہ بھولتا ہے ﴿۵۲﴾ وہی ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا اور اس میں تمہارے لیے راستے بنائے اور آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اس (پانی) کے ذریعے مختلف اقسام کی نباتات پیدا فرمائیں ﴿۵۳﴾ خود بھی کھاؤ اور اپنے چارپایوں کو بھی چراؤ بے شک ان باتوں میں عقل والوں کے لیے (بہت سی) نشانیاں ہیں ﴿۵۴﴾

تفسیر و معارف

موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کریم نے ارشاد فرمایا کہ آپؑ فرعون کے پاس جائیں کہ وہ حد سے گزر چکا ہے تو آپؑ نے عرض کی: قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ﴿۲۵﴾ اے میرے پروردگار! اس کام کے لیے میرا سینہ کھول دے۔

شرحِ صدر:

شرحِ صدر اللہ کی عظمت کے لیے، نیکی کے لیے دل کا، سینہ کا کھل جانا ہے۔ دوسری جگہ ارشادِ باری ہے: يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ۔۔۔ (الانعام:125) اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتے ہیں۔ من جانب اللہ دینی علوم سینے میں ڈال دیے جاتے ہیں۔ اسی کو علمِ لدنی کہتے ہیں۔ یعنی کسی مکتب کی احتیاج نہ ہو، کسی استاد کی محتاجی نہ ہو، کسی پڑھانے والے نے پڑھایا نہ ہو۔ اللہ کریم نے علوم سینے میں انڈیل دیے ہوں۔ یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے، اس کا عظیم احسان ہے۔ انبیا علیہم السلام کی تو شان ہی جدا ہے۔ اُمتیوں میں سے خاص اور خال خال اللہ والوں کو عطا ہوتا ہے اور جنہیں عطا ہوتا ہے انہوں نے ظاہری طور پر کسی سے کچھ سیکھا نہیں ہوتا کسی بھی موضوع پر بات کریں تو علوم کے سمندر بہا دیتے ہیں۔

موسیٰ علیہ السلام اللہ کے نبیؑ، صاحب کتاب رسولؑ ہی نہیں اولوالعزم رسولؑ تھے، جنہیں اللہ کریم سے شرفِ ہمکلامی بھی نصیب تھا۔ یاد رہے رسولؑ صاحبِ کتاب ہوتے ہیں۔ ہر رسولؑ نبیؑ ہوتا ہے لیکن ہر نبیؑ رسول نہیں ہوتا۔ رسولؑ وہ ہوتے ہیں جن پر کتاب نازل ہوتی ہے اور نبیؑ کسی رسولؑ کی شریعت کی تعلیمات کو آگے بڑھانے اور

جاری رکھنے کے لیے مبعوث ہوتے ہیں۔ اولوالعزم خاص رسولؑ ہوتے ہیں۔ تمام رسولوں میں سے صرف پانچ اولوالعزم رسولؑ ہوئے ہیں۔ آدم علیہ السلام، نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب کے امام، سردار اور نبوت کو مکمل کرنے والے ہیں۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔

انبیاؑ تو علوم کا مخزن ہوتے ہیں پھر موسیٰ علیہ السلام تو صاحب کتاب ہیں، اولوالعزم رسولؑ ہیں، اللہ کریم سے براہ راست ہمکلامی کا اعزاز نصیب ہے پھر بھی دعا مانگ رہے ہیں کہ اللہ کریم! آپ نے مجھے علوم کے خزانے عطا فرما دیے ہیں تو میرا سینہ اور کھول دیجیے، اس میں مزید وسعت عطا فرما دیں۔ یہ انداز ہے مقربینِ الٰہی کا!

اس میں سبق ہے کہ کسی بھی صاحبِ علم کو اپنے علم پر ناز نہیں کرنا چاہیے، فخر نہیں کرنا چاہیے۔ اللہ کی عطا پر شکر کرنا چاہیے۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ علمِ ظاہر جتنا بھی بڑھتا جائے یہ بندے میں تفاخر پیدا کرتا ہے۔ ضروری ہے کہ بندے کی نظر عظمتِ الٰہی پر ہو۔ اسے اللہ کی عنایت سمجھے، اس کا شکر ادا کرے اور یہ بھی یاد رکھے کہ کوئی بندہ بھی ایسا نہیں کہ جس کا علم کائنات سے بڑھ گیا ہو۔ ہر جاننے والے سے بڑھ کر جاننے والا موجود ہوتا ہے اور مخلوق میں گروہ انبیاؑ کو بہترین علم اور علوم کے خزانے عطا ہوتے ہیں۔ سب سے زیادہ علم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا۔ سب سے زیادہ جاننے والا صرف اللہ ہے۔ یہ اللہ کی خصوصیت ہے۔ اللہ ہی علوم عطا فرماتا ہے۔

بندے کو یہ احساس رہے کہ اگر کچھ علم اس کے پاس ہے، وہ کسی فن سے آشنا ہے تو یہ اللہ کریم کی عطا ہے، اس کا احسان ہے۔ جو علم ملے اس کا شکر ادا کرے۔ شکر ادا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ خود خلوصِ دل سے عمل کرے اور اس علم کو امانت سمجھ کر اللہ کے بندوں تک پہنچائے۔

آسانی کی دعا:

اسی انداز سے موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ میرا سینہ کشادہ کر دیجیے اور عرض کی: وَيَسِّرْ لِيٓ أَمْرِي ۝٢٦ اور میرے لیے میرا کام آسان فرما دیں۔

موسیٰ علیہ السلام بہت جرأت مند، دلیر اور بہت جری تھے۔ اللہ کے رسولؑ تھے، اولوالعزم رسولؑ تھے لیکن عظمتِ باری کے آگے بندے کی جرأت کیا کرے گی بندہ تو اپنی بساط بھر ہی کوشش کر سکتا ہے۔ بندے سے کیا ہوگا؟ کام تو دراصل اللہ کریم نے ہی کرنا ہے اس لیے عرض کی، میرے کام کو میرے لیے آسان فرما دیں۔ کسی کام میں رکاوٹ آتی ہے تو تیری طرف سے آتی ہے۔ بندہ لاکھ کوشش کرے تو وہ نہیں ہوگا جب تک تُو خود اس کو آسان نہ کر دے۔ جب تُو کسی کام کو آسان کر دے تو وہ کام تھوڑی سی محنت سے ہو جاتا ہے، بہانہ ہی ہوتا ہے، کوئی سبب اختیار

کرنے سے وہ کام ہو جاتا ہے۔ یہ انداز ہے اللہ کے مقرب بندوں کا اور یہاں اللہ کا اولوالعزم رسولؑ فرما رہا ہے کہ اللہ کریم! آپ میرا کام آسان فرما دیجیے۔ مزید عرض کی: وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾ میری زبان سے گرہ کھول دیجیے۔ یہاں پر مفسرین نے موسیٰ علیہ السلام کے بچپن کا واقعہ نقل کیا ہے کہ ایک مرتبہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو گود میں اٹھایا جبکہ ابھی آپؑ ننھے بچے تھے تو آپؑ نے فرعون کی داڑھی کھینچ لی۔ وہ بہت ناراض ہوا کہ یہ بچہ میری توہین کر رہا ہے یہ اسرائیلی ہے یقیناً کسی اسرائیلی نے اسے پانی میں پھینکا ہوگا لہٰذا اسے قتل کر دیا جائے۔ اس کی ملکہ نے کہا یہ معصوم ہے، اسے کیا پتا بادشاہ کون ہے، قبطی کون ہے اور اسرائیلی کون ہیں؟ بچے کی معصومیت ثابت کرنے اور اس کی جان بچانے کے لیے اس نے دو تھال منگوائے۔ ایک میں جواہرات رکھے دوسرے میں دہکتے انگارے۔ دونوں موسیٰ علیہ السلام کے سامنے کیے تو انہوں نے اللہ کے حکم سے ایک انگارہ اٹھا کر منہ میں ڈال لیا۔ اس سے زبانِ مبارک میں تو لکنت آگئی لیکن آپؑ کی جان بچ گئی۔ بچے کی معصومیت ثابت ہوگئی کہ جواہرات بھی دمک رہے تھے اور انگاروں کے دہکنے سے ان میں چمک تھی تو بچے نے اپنی فطری معصومیت سے چمکتی چیز کی طرف ہاتھ بڑھا کر انگارہ منہ میں رکھ لیا۔ اس طرح فرعون کی تسلی ہوگئی۔

ایک لطیف نکتہ:

موسیٰ علیہ السلام کی زبانِ مبارک میں اس واقعے کے باعث بچپن میں ہی لکنت آگئی تھی۔ فرعون نے آپؑ کے بارے یہی کہا تھا میں بہت بہتر ہوں۔ اس شخص سے جس کی کوئی قدر نہیں اور: وَلَا يَكَادُ يُبِيْنُ (الزخرف:52) اور وہ صاف بول بھی نہیں سکتا۔

یہاں سورۃ طٰہٰ کی آنے والی آیات میں موسیٰ علیہ السلام نے اپنے ربّ سے درخواستیں کیں تو ارشادِ باری ہوا کہ اے موسیٰ (علیہ السلام)! ہم نے آپ کی ہر درخواست قبول فرمالی۔ آپؑ نے جو مانگا آپؑ کو عطا کر دیا یعنی آپؑ کی ساری دعائیں تو پہلے ہی قبول ہو چکی تھیں تو لکنت کیسے باقی رہی اور فرعون کے دربار میں لکنت کی بات کے کیا معنی؟ اس سے یہ سمجھ آتی ہے کہ آپؑ نے لکنت دور کرنے کے لیے عرض نہیں کی۔ قرآن حکیم میں واقعات کے تسلسل سے جو سمجھ آتی ہے وہ یہ ہے کہ آپؑ نے فرمایا، میرے ربّ! جو خزانے آپ نے میرے سینے میں بھر دیے ہیں انہیں دوسروں تک پہنچانے کے لیے میری زبان میں روانی بھی عطا کر دیں یعنی مجھے قوتِ بیان بھی عطا کر دیں تاکہ میں واضح طور پر بیان کر سکوں۔

قوتِ بیان ایک علیحدہ وصف ہے۔ضروری نہیں کہ جوعلم رکھتا ہے وہ بیان پر بھی قدرت رکھتا ہو۔قوتِ بیان اللہ کی عظیم عطا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی درخواست کا اگلا حصہ اسی قوتِ بیان کے حصول کو واضح کر رہا ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ میرے ربّ مجھے قوتِ بیان عطا فرما تا کہ لوگ میری بات کو پاسکیں۔ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ﴿۲۸﴾ تا کہ جن لوگوں پر بیان کروں انہیں میری بات سمجھ میں آئے۔ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِی ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِیْ ﴿۳۱﴾ وَاَشْرِكْهُ فِیْۤ اَمْرِیْ ﴿۳۲﴾ اور مجھے ایک نائب عطا فرما جو میرا بوجھ بانٹ سکے۔ میرا یہ معاون میرے خاندان میں سے عطا فرما دیجیے۔ میرے بھائی ہارون کو میرا معاون بنا دیں۔ اس سے میری قوت مضبوط فرما دیجیے۔

اہلیت شرط ہے:

موسیٰ علیہ السلام نے جانچ لیا تھا کہ اسرائیلیوں میں سے کسی میں اہلیت نہیں اپنے اردگرد نظر دوڑائی تو کسی میں اہلیت نہ پائی۔ اپنے بھائی ہارون کو معاون بنانے کی دعا اس لیے نہیں کی کہ وہ بھائی ہے بلکہ بھائی میں اہلیت دیکھی تو عرض کی کہ میرے بھائی کو کارِ نبوت میں میرا شریک فرما دے۔

وزیر کے معنی ہیں بوجھ کو اٹھانے والا۔ سربراہ کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے والے کو وزیر کہا جاتا ہے۔ اگر وزیر ذمہ داریوں کو پوری طرح جانتا ہو اور پورے خلوص سے ان کا حق ادا کرے تو وہ حکمران یا سربراہ کا نائب ہوتا ہے۔ اس کی ذمہ داریاں بانٹنے والا اور جو ذمہ داریوں کا بوجھ نہ اٹھائے تو وہ ذمہ دار شخص نہیں پھر وہ گدھا ہی ہے کہ وزیر کے ایک معنی گدھا کے بھی ہیں۔ جیسے انگریزی میں بھی کہتے ہیں نا، Donkey is the beast of burden غیر ذمہ دار آدمی بھی ایسا ہی ہے۔

ذکرِ لسانی اور ذکرِ قلبی:

فرمایا: كَیْ نُسَبِّحَكَ كَثِیْرًا ﴿۳۳﴾ موسیٰ علیہ السلام عرض گزار ہوئے کہ جب ہم دو بھائی اکٹھے ہو کر کام کریں گے تو آپ کی تسبیح زیادہ کریں گے۔ وَّنَذْكُرَكَ كَثِیْرًا ﴿۳۴﴾ ذکر بھی بہت سا کریں گے۔ یہ آیہء مبارکہ اجتماعی ذکر پر دلیل ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر مل کر ذکر کیا جائے، اجتماعی طور پر کیا جائے تو اس کی برکات زیادہ ہیں۔ اکیلے ذکر کرنا، تسبیح کرنا ضروری ہے لیکن اجتماعی ذکر میں برکات زیادہ ہوتی ہیں۔

یہاں پہلے تسبیح کا لفظ آیا ہے پھر ذکر کا لفظ ہے۔ تسبیح ذکرِ لسانی یعنی زبانی ذکر کو کہتے ہیں۔ قرآن وحدیث میں جہاں مطلق ذکر کا حکم آتا ہے وہاں اس سے مراد ذکرِ قلبی ہے۔ یوں تو ہر کام جو اللہ کے حکم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور سنتِ مطہرہ کے مطابق ہو وہ ذکر ہے۔ ذکرِ لسانی تب تک ہوتا رہتا ہے جب تک زبان سے کرتے

ہیں۔ جب زبان سے کوئی اور بات کریں تو ذکرِ لسانی منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اعضاء وجوارح سے کوئی کام کریں، ملازمت کریں یا حصولِ معاش کے دیگر ذرائع اختیار کریں، دنیا کا کوئی کام بھی کریں اگر وہ شریعت کے مطابق ہے تو یہ عملی ذکر ہے۔ اپنی ذمہ داریاں ادا کر کے، عشا پڑھ کر اللہ کو یاد کر کے تو سونا بھی عبادت ہے۔ صلوٰۃ کے لیے اٹھ جانا عبادت ہے، صلوٰۃ ادا کرنا عبادت ہے یہ سب عملی ذکر ہے۔ تلاوت وتسبیح، دعوت وتبلیغ زبانی ذکر ہے۔ اس کے باوجود ذکرِ قلبی ضروری ہے۔ لسانی ذکر اتنی دیر ہی ہوتا ہے جتنی دیر زبان چلتی رہے لیکن ذکرِ قلبی میں وجود کا ہر ذرّہ ذاکر ہو جاتا ہے۔ لسانی ذکر، عملی ذکر ان سب سے گزارا نہیں ہوتا قلبی ذکر لازمی ہے۔ صاحبِ تفسیرِ مظہری، قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے لکھا ہے کہ ذکرِ قلبی کا حصول ہر مسلمان مومن مرد وعورت پر واجب ہے۔ واجب وہ عمل ہے جس کے بغیر گزارا نہیں۔

اجتماعی ذکر کی اہمیت:

فرمایا: وَّنَذۡكُرَكَ كَثِيۡرًا ۝ اور خوب کثرت سے آپ کا ذکر کریں۔ اس آیہء مبارکہ سے اجتماعی ذکر کا ثبوت ملتا ہے اور اس کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ نبیؑ تو وہ ہستی ہوتا ہے کہ صرف ذاکر نہیں بلکہ ذاکر گر ہوتا ہے۔ نبیؑ جو لباس پہنے وہ ذاکر ہو جاتا ہے، جس زمین پر قدم رکھے وہ ذرّات ذاکر ہو جاتے ہیں۔ نبیؑ کی نگاہ جس طرف اٹھے وہ فضائیں ذاکر ہو جاتی ہیں اس کے باوجود نبیؑ کے لیے بھی ذکر ضروری ہے۔ یہی عرض کیا موسیٰ علیہ السلام نے کہ ہم دونوں بھائی مل کر آپ کا خوب ذکر کریں۔ دو یا دو سے زیادہ لوگ ہیں تو زیادہ فائدہ ہوتا ہے۔ صحابہ کرامؓ کثرت سے ذکر کیا کرتے تھے باوجود اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیؓ تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہِ کرم میں رہتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبتِ عالی میں بیٹھتے تھے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے صلوٰۃ ادا کرتے تھے۔ اس سب کے باوجود مسجدِ نبوی میں اجتماعی ذکر بھی ہوتا تھا۔

جب یہ آیہء کریمہ وَاصۡبِرۡ نَفۡسَكَ مَعَ الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ ۔۔۔(الکھف:28) نازل ہوئی کہ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)! ان لوگوں کے ساتھ رہیے جو رات دن اپنے اللہ کو پکارتے رہتے ہیں، اس کا ذکر کرتے رہتے ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجرہ مبارک سے مسجدِ نبوی تشریف لائے تو مسجد میں ایک طرف کچھ صحابہ کرام فقہی مسائل کو سمجھنے سمجھانے میں مشغول تھے۔ دوسری طرح کچھ صحابہ ذکرِ الٰہی میں محو تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ذاکرین کے ساتھ بیٹھ گئے اور فرمایا کہ اللہ کریم کا شکر ہے، جس نے مجھے جن لوگوں کے ساتھ رہنے کا حکم دیا وہ لوگ بھی عطا فرما دیے۔

اجتماعی ذکر کی برکتوں کا تو اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔ جہاں بہت سے فوائد ہوں گے وہاں ایک فائدہ یہ بھی ہے وہاں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ ہر بندے کا اپنے ربّ سے اپنا تعلق ہے۔ اس پر الگ طرح کے انوارات اور الگ طرح کی رحمتوں کی بارش ہوتی ہے تو جتنے لوگ مل کر ذکر کرتے ہیں ہر ذاکر پر الگ طرح کی رحمت برس رہی ہوتی ہے اور جتنے لوگ بیٹھے ہوتے ہیں اتنی طرح کی رحمتوں سے سب مستفید ہوتے ہیں۔

یاد رکھیں لسانی ذکر یعنی تسبیح و تلاوت ضرور کرنی چاہیے۔ قرآن حکیم کو سمجھ کر پڑھنا چاہیے کہ قرآن اپنے پڑھنے والے سے باتیں کرتا ہے۔ قرآن کی تلاوت میں لذت ہے، کارِ ثواب بھی ہے لیکن سمجھ کر پڑھنا لذتِ ہمکلامی عطا کرتا ہے۔

قرآن، قاری سے باتیں کرتا ہے:

قرآن حکیم اللہ کریم کا ذاتی کلام ہے۔ اسے اپنے نام اللہ کا خط سمجھ کر پڑھنا چاہیے۔ ایک نو مسلم کا واقعہ بڑا دلپذیر ہے اور کلامِ الٰہی کی تاثیر کا گواہ ہے۔ امریکہ کی کسی یونیورسٹی میں ایک نہایت قابل اور فاضل پروفیسر تھا۔ ایسا قابل کہ دنیا میں ایسے گنتی کے چند لوگ ہوتے ہیں۔ وہ ان میں سے ایک تھا لیکن دہریہ تھا، کسی بھی مذہب کا پیروکار نہیں تھا۔ اسے یونیورسٹی میں چند مسلمان طالب علموں سے واسطہ پڑا۔ اس نے ان کے اور غیر مسلم لڑکوں کے کردار میں بڑا واضح فرق دیکھا۔ حیران ہوا کہ یہ ایک ہی عمر کے لوگ ہیں لیکن دونوں فریقوں کا کردار یکسر مختلف ہے۔ مسلمان کوئی فضول بات نہیں کرتے، اپنی پڑھائی پر متوجہ رہتے ہیں، صحت مند تفریح کرتے ہیں، وقت ضائع نہیں کرتے۔ کوئی فضول حرکت نہیں کرتے، ان کی زندگی خرافات سے مبّرا ہے، پاکیزہ ہے جبکہ ان کے ہم جماعت، جو ان ہی کے ہم عمر ہیں وہ خرافات میں مبتلا ہیں۔ شراب، جوا، فحاشی میں وقت برباد کر رہے ہیں۔ اُسے جستجو ہوئی، اس نے مسلمان لڑکوں سے میل ملاقات بڑھائی۔ جوں جوں تعلقات بڑھتے گئے پروفیسر صاحب کی تلاشِ حق بھی بڑھتی گئی۔ انہوں نے لڑکوں سے اسلام کے بارے پوچھ ہی لیا تو لڑکوں نے کہا کہ آپ خود اتنے پڑھے لکھے ہیں آپ قرآن حکیم از خود پڑھ لیں، ہم آپ کو کیا بتائیں، قرآن پڑھیں گے تو آپ کو خود سمجھ آ جائے گی۔

پروفیسر صاحب اپنی روداد میں اپنا حالِ دل لکھتے ہیں کہ پھر میں نے قرآن پڑھنا شروع کیا تو مجھے سمجھ آنا شروع ہو گئی۔ جو وسوسہ یا شبہ مجھے ہوتا تو اگلی ہی آیات میں ان کا جواب آ جاتا اور بہت شافی جواب ہوتا۔ جیسے جیسے قرآن پڑھتا گیا، دل قبول کرتا گیا اور بالآخر ان لڑکوں سے کہا کہ میں اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے مسجد لے گئے۔ امام صاحب نے کلمہ پڑھوایا، شہادتین کا اقرار کیا اور میں مسلمان ہو گیا۔ لڑکوں کا خیال تھا کہ میں نو مسلم ہوں،

قرآن پڑھ رہا ہوں خود ہی جستجو کر کے اسلام پر عمل شروع کر دوں گا خود تلاش کر لوں گا کہ صلوٰۃ کیا ہے، کیسے ادا کرنی ہے لیکن امام صاحب نے مجھے ایک کتابچہ تھما دیا۔ میں نے گھر آ کر دیکھا تو اس میں صلوٰۃ ادا کرنے کا طریقہ لکھا ہوا تھا۔ طہارت، وضو کے احکام تھے قیام، رکوع و سجود میں کیا پڑھنا ہے اس کا تلفظ سب کچھ لکھا ہوا تھا۔ میں نے بغور پڑھا، سیکھا اور اب عملی طور پر کرنا باقی تھا تو میں نے پہلے کمرے کی کھڑکیاں بند کیں کہ کوئی دیکھ نہ لے کہ یہ اتنا فاضل آدمی کیا کر رہا ہے! میں نے کتاب کے مطابق وضو کیا اگرچہ مجھے کوفت ہوئی کہ کبھی ہاتھ پیر دھونا ہے ترتیب سے دھونا یہ سب کیسا عجیب ہے۔ جائے نماز بچھا کر اس پر کھڑا ہو گیا۔ اللہ اکبر کہہ کر صلوٰۃ شروع کی پھر رکوع کا مرحلہ آ گیا تو احساس ہوا کہ میں تو ساری زندگی کسی کے آگے جھکا نہیں، اپنے جیسا کسی کو سمجھتا نہیں لیکن پھر میں جھک گیا۔ رکوع سے سیدھا کھڑا ہوا تو اب سجدے میں جانا تھا۔ میں نے کہا کہ میں تو بالکل ہی ختم ہو گیا۔ میرے پاؤں زمین پر ہیں، گھٹنے زمین پر ہیں، اب مجھے ہاتھ زمین پر رکھ کر پیشانی اور ناک بھی زمین پر لگا دوں پھر تو بندے کا کچھ نہ بچا۔ یہ تو مجھ سے نہیں ہو سکے گا لیکن خواہی نہ خواہی میں نے سجدہ کر ہی لیا۔ دو رکعت پڑھ کر سلام پھیرا تو مجھے بڑا لطف آیا، بڑا سکون آیا۔ میں نے باقاعدہ ادا کرنا شروع کر دی۔ مجھے اتنا اچھا لگا کہ میرے دل سے دعا نکلی یا اللہ! ایسا وقت کبھی نہ آئے کہ میں صلوٰۃ چھوڑ دوں۔ ایسا ہونے سے پہلے مجھے موت دے دینا۔

یہ لذتِ ہمکلامی ہے۔ اس طرح اس شخص نے قرآنِ حکیم پڑھنے کا طریقہ describe یعنی بیان کیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ قرآن کو اس طرح پڑھنا چاہیے۔ اللہ کا کلام ہر فرد کے لیے ہے۔ اسے اپنے لیے پڑھیں، ترجمہ بھی پڑھیں، سمجھنے کی کوشش بھی کریں تو پتا چلے گا کہ اللہ کی کتاب آپ سے باتیں کر رہی ہے۔

موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی اللہ کریم! یہ جو میں بات کو طول دے رہا ہوں یہ تو بات کا مزا لینے کے لیے کر رہا ہوں ورنہ ساری باتیں تو آپ جانتے ہیں۔ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۝۳۵ بلاشبہ آپ ہمارے ہر حال کو دیکھ رہے ہیں، ہمارے حال سے باخبر ہیں۔ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۝۳۵ آپ کے جیسا دیکھنے والا کون ہے، صرف آپ ہی سب کچھ جانتے ہیں۔

بلاشبہ تمام انبیائے کرام اللہ کے مقربین ہوتے ہیں لیکن انبیاؑ نبوت کے مقام کی نزاکت سے بھی کماحقہٗ آگاہ ہوتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی انتہائے ادب سے اپنی عرض بارگاہِ الٰہی میں پیش کی۔ جب آپؑ سب دعائیں مانگ چکے تو ارشادِ باری ہوا: قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ۝۳۶ اے موسیٰ (علیہ السلام)! آپ نے جتنی چیزیں طلب کیں، جو مانگا وہ آپؑ کو عطا کر دیا گیا، آپؑ کی ساری درخواستیں قبول کر لیں گئیں۔

دعا بھی تقدیر ہے:

نبیؑ تو ازل سے نبیؑ ہیں، تخلیقی طور پر نبیؑ ہیں، دنیا سے جانے کے بعد بھی نبیؑ ہیں، برزخ میں، حشر میں اور

جنت میں بھی نبیؑ ہی ہوں گے۔ نبیؑ کی نبوت، ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ اور نبیؑ کا ذاتی وصف ہوتی ہے تو پھر موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے کیا مراد ہے؟ اس کا مطلب ہے کہ اللہ کریم نے جتنے فیصلے فرمائے ہیں ان میں دعا کا بھی فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ دعا بھی تقدیرِ الٰہی ہے۔ یہ ازل سے مقرر ہے کہ فلاں شخص یہ دعا کرے گا اور یہ دعا قبول ہوگی اور اس سے دوسروں کو یہ فائدہ ہوگا۔ یہ تقدیر کا حصہ ہے، یہ پہلے سے طے شدہ ہے۔

قرآن حکیم میں جا بجا ان مثالوں کا ذکر ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نبی مرسل صلی اللہ علیہ وسلم کے مبعوث ہونے کی دعا فرمائی۔ دعا مقبول ہوئی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ یہاں موسیٰ علیہ السلام نے اپنے بھائی کے لیے دعا کی کہ انہیں کارِ نبوت میں میرا معاون بنا دیں اور اللہ کریم نے ہارونؑ کو نبیؑ مبعوث فرما دیا۔ یہ فیصلہ تو ازل میں ہو چکا تھا۔ ہارون علیہ السلام نے نبیؑ مبعوث ہونا تھا لیکن موسیٰ علیہ السلام کی دعا اس کا سبب بنی تو دعا بھی تقدیر ہے۔

موسیٰ علیہ السلام پر اللہ کے احسانات:

ارشاد ہوا: وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ ﴿۳۷﴾ اور یہی نہیں کہ آپ (علیہ السلام) کی تمام دعائیں قبول فرما کر ہم نے آج بہت احسان فرمایا ہے۔ اس سے پہلے بھی ہم نے آپ (علیہ السلام) پر بہت سے احسانات فرمائے۔ اللہ کریم کے احسانات کی تو کوئی حد نہیں۔ کوئی شمار نہیں کر سکتا لیکن اللہ کے بندوں پر خاص احسانات ہوتے ہیں جو بہت عظیم ہوتے ہیں تو موسیٰ علیہ السلام کو یاددہانی کرائی جا رہی ہے کہ ہم نے پہلے بھی آپ (علیہ السلام) پر اپنا احسان فرمایا تھا۔ إِذْ أَوْحَيْنَا إِلَىٰ أُمِّكَ مَا يُوحَىٰ ﴿۳۸﴾ جب ہم نے آپ (علیہ السلام) کی والدہ کو بتانے کی بات الہام والقا سے بتائی کہ: اقْذِفِيهِ فِي التَّابُوتِ فَاقْذِفِيهِ فِي الْيَمِّ ۔۔۔ اپنے بیٹے کو ایک صندوق میں ڈال کر دریا میں ڈال دیں، اسے موجوں کے سپرد کر دیں۔

اہم نکتہ:

یاد رہے جسے اصطلاحِ شریعت میں وحی کہتے ہیں وہ صرف انبیا علیہم السلام پر ہوتی ہے۔ جس طرح اللہ کے کلام میں کوئی اشتباہ نہیں ہوتا اسی طرح نبی علیہ السلام کے سمجھنے میں بھی اشتباہ نہیں ہوتا۔ وحی کی خصوصیت ہے کہ جو کچھ نبیؑ پر وحی کے ذریعے آتا ہے پوری امت اسے ماننے کی مکلف ہوتی ہے۔

غیر نبیؑ میں اولیاء اللہ کو کشف و مشاہدہ، وجدان اور الہام والقا سے نوازا جاتا ہے۔ الہام اور القا ایک ہی چیز ہیں کہ اللہ کی طرف سے کوئی بات دل میں ڈال دی جائے۔ کشف و مشاہدہ یہ ہے کہ کوئی چیز دکھا دی جائے۔ ولی کے

کشف ومشاہدہ اور الہام والقا کے لیے ضروری ہے کہ یہ شریعت کے مطابق ہو۔ اگر دین کے خلاف ہو تو ولی کو سمجھنے میں غلطی لگی کیونکہ اللہ کی طرف سے الہام وکشف میں غلطی نہیں ہوتی سمجھنے میں غلطی لگ جاتی ہے۔ اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ صاحب کشف اپنے کشف والہام والقا کو ماننے کا خود مکلف ہے کوئی دوسرا بندہ اس کا مکلف نہیں۔ یہ خصوصیت صرف نبیؑ کی ہے کہ ان کے کشف و وجدان کو ماننا پوری امت پر فرض ہے۔ ان معاملات میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے۔ کشف ومشاہدہ کا حاصل توحیدِ باری اور آخرت پر یقین میں اضافہ ہے۔ یہ دنیوی مسائل کے حل کے لیے نہیں نہ کسی شخص کی پارسائی منوانے کے لیے ہے۔ ہر متنفس کے ساتھ اللہ کریم موجود ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بندوں کو اللہ کے رُوبرو کھڑا کر دیا ہے۔ کیا ہر صلوٰۃ میں ہم اللہ سے گفتگو نہیں کرتے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت زندہ وجاوید ہے۔ ہر سوال کا جواب قرآن وحدیث میں موجود ہے۔ عمل کرنے کے لیے یہ کافی ہیں۔ الہام کا نتیجہ یقّن ہے یعنی بندے کو حکمِ الٰہی پورا کرنے کے لیے جس یقین کی ضرورت ہے، وہ عطا کر دیا جاتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو الہام کی برکت سے یہ یقین پیدا ہو گیا کہ اللہ کا حکم پورا کرنے میں ہی ان کے بیٹے کی جان کی سلامتی ہے، ورنہ ماں اپنے بچے کو بپھرتی ہوئی لہروں کے سپرد نہ کرتی۔

فرمایا: فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ ۔۔۔موجیں اسے ساحل پر لے جائیں گی۔ یہ بپھرتی لہریں اس کا کچھ نہیں بگاڑیں گی بلکہ اسے گود میں اٹھا کر ساحل تک پہنچائیں گی جہاں يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّي وَعَدُوٌّ لَّهُ ۔۔۔ میرا اور اس کا دشمن فرعون اسے اٹھالے گا۔

اس آیہء کریمہ میں اللہ کی قدرت کے مختلف مظاہر کا ذکر ہے اور قادرِ مطلق کی قدرت کے ساتھ دنیا کے عالمِ اسباب ہونے کا بیان ہے۔ اللہ کریم کی قدرتِ کاملہ ہر شئے کو محیط ہے۔ دریائے نیل بہت گہرا اور اس کی موجیں زورآور ہیں۔ اس میں بے پناہ آبی مخلوق ہے۔ اس کے خونی مگرمچھ خطرناک ہونے میں مشہور ہیں لیکن اللہ نے ان بپھری ہوئی لہروں کو حکم دیا کہ بچے کو بڑی نرمی سے ہلکورے دیتی ہوئی بحفاظت ساحل پر پہنچا دیں۔

کائنات کی ہر شئے پر اللہ کا حکم چلتا ہے۔ یہ مٹی، یہ آگ، ہوا یا پانی یہ سب اللہ کی مخلوق ہے، اس کا حکم سنتے ہیں اور بجالاتے ہیں۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام کے لیے آگ کو اللہ نے براہ راست حکم دیا: قُلْنَا يَٰنَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَٰمًا عَلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ (الانبیا:69) کہ اے آگ ابراہیم علیہ السلام کے لیے ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی والی بن جا چنانچہ آگ جلتی رہی اور ابراہیم علیہ السلام اس میں سے چلتے ہوئے اپنی اہلیہ، اہل خانہ اور حضرت لوط علیہ السلام کو لے کر ہجرت بھی کر گئے۔

اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے درخت، پتھر، پہاڑ اور جانور باتیں کیا کرتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھا کرتے تھے۔ سیرت نگاروں نے اس حوالے سے بہت سے واقعات درج کیے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان درختوں اور پتھروں کو پہچانتے تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اس وقت صلوٰۃ وسلام پڑھا کرتے تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان جگہوں سے گزرا کرتے تھے۔

صحابہ کرامؓ کو یہ نعمتیں بطورِ کرامت نصیب تھیں۔ حضرت عمرؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ آپؓ نے دریائے نیل کے نام ایک خط لکھا اور اسے نیل میں ڈال دیا گیا اور اس نے تعمیلِ حکم کی۔ اولیاء اللہ کو یہ چیزیں بطورِ کرامت اور دین کی سربلندی کے لیے، احقاقِ حق کے لیے عطا ہوتی ہیں۔ کسی دنیوی مقصد کے لیے نہیں ہوتیں۔ ان کے ذریعے دین میں کوئی نیا حکم شامل نہیں کیا جاسکتا۔ دین مکمل ہو چکا۔

دنیا عالمِ اسباب ہے۔ ربّ العالمین کی شان ہے کہ اسے عالمِ اسباب بنایا ہے اور اس کی ذات خود بھی اسباب اختیار فرماتی ہے۔ دریا کی لہروں نے اللہ کے حکم سے ہی موسیٰ علیہ السلام کو وہاں پہنچا دینا تھا پھر صندوق کی کیا ضرورت تھی؟ یونہی پانی میں ڈال دیتیں لیکن نہیں ڈالا بلکہ اللہ کے حکم کی تعمیل میں صندوق میں ڈال کر پانی میں چھوڑ دیا۔ اس میں سبق ہے کہ دنیا کے ہر کام کے لیے جائز سبب اختیار کرنا اور اسبابِ ظاہری اختیار کرنے کے بعد نتیجہ اللہ پر چھوڑ دینا ضروری ہے۔ جب بھروسہ اللہ پر ہو تو اللہ کی طرف سے جو نتیجہ آئے وہ قبول ہو جاتا ہے، دل کو سکون ہو جاتا ہے۔

قادرِ مطلق نے یہ چاہا کہ جس بچے سے خطرے کی وجہ سے فرعون بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کروا رہا تھا اس بچے کی پرورش فرعون کے محل میں کروائے۔ فرعون نے نیل میں سے ایک نہر نکال کر اپنے محل تک پہنچا رکھی تھی۔ وہاں بادشاہ اور اس کی ملکاؤں کے بیٹھنے، نظارہ کرنے، تیراکی اور غسل کرنے اور کشتیاں چلانے کا اہتمام تھا۔ سخت پہرہ تھا، وہاں کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ بادشاہ اور اس کے گھر والے وہاں آتے لطف اندوز ہوتے اور چلے جاتے۔ اللہ نے دریا کی لہروں کو بالواسطہ حکم دیا کہ اس صندوق کو اس جگہ پہنچا دو۔ وہاں اُسے میرا اور اس بچے کا دشمن اٹھالے گا۔

اس آیہ مبارکہ سے کئی سبق حاصل ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ قادرِ مطلق ہے وہ جس کو بچانا چاہے اُسے بڑی سے بڑی قوت مٹا نہیں سکتی۔ اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کی پرورش اس کے گھر میں کروائی جو اسے قتل کرنا چاہتا تھا۔ سبق یہ ہے کہ کیا اللہ کریم صرف موسیٰ علیہ السلام کے اللہ ہیں، ہمارے نہیں۔ ہمیں کس نے پیدا کیا، کس نے زندگی بخشی، کون ہماری ضرورتیں پوری کر رہا ہے؟ اللہ ہی ہمارا خالق ہے، مالک ہے، رازق ہے، ضرورتیں پوری کرنے والا ہے تو پھر ہم

اس کو کیوں نہ پکاریں؟ ہم تو ہر حال میں اسی کو پکاریں گے۔

دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ انبیاؑ سے دشمنی اللہ سے دشمنی ہے جیسا کہ فرمایا جارہا ہے کہ میرا اور ان کا دشمن صندوق اٹھالے گا۔ یہی اصول اہل اللہ سے دشمنی کرنے والوں کے لیے بھی ہے کہ اہل اللہ سے دشمنی اللہ سے دشمنی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ ربّ کی ربوبیت کا تقاضا ہے کہ وہ تربیت کر کے کمال کو پہنچا تا ہے۔ چونکہ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون جیسے بادشاہ سے مقابلہ کرنا تھا تو آپؑ کو بچپن میں ہی محل پہنچا دیا تا کہ آپؑ جان لیں کہ بادشاہ کیا ہوتے ہیں، شاہی دربار کیا ہوتا ہے، بادشاہت کے آداب اور طریقے کیا ہوتے ہیں، بادشاہ سے بات کیسے کی جاسکتی ہے وغیرہ۔ فرعون دشمن تو تھا لیکن تھا تو بادشاہ اس لیے اللہ کریم نے چاہا کہ موسیٰ علیہ السلام کی پرورش شاہی محل میں ہو اور آپؑ شاہی آداب، قواعد وضوابط سے آگاہ ہوں۔

اللہ کریم کے ان احسانات کا ذکر جاری ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر ہوئے فرمایا: **وَأَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّي**۔۔۔اور ہم نے اپنی طرف سے آپؑ پر محبت القا فرمادی۔ جو آپؑ کو دیکھتا اسے آپؑ پر پیار آجاتا۔ یہ بھی اللہ کی عطا ہے کہ انبیاؑ کو دیکھ کران سے عشق ہوجاتا ہے۔ اللہ کے نیک بندوں کو دیکھ کران سے اُنس ہوجاتا ہے۔

اور فرمایا: **وَلِتُصْنَعَ عَلَىٰ عَيْنِي** ۝٣٩ اور ہم نے یہ پسند فرمایا کہ آپؑ ہمارے روبرو پرورش پائیں۔ شاہی انداز سے محل میں پلیں۔ شاہی محلات کے طور طریقوں سے آگاہ رہیں۔ یہ بھی اللہ کریم کا احسان ہے کہ آپؑ کی والدہ ماجدہ کے دل کو قرار عطا فرمادیا۔ اگر اللہ کریم اُن کے دل سے رابطہ نہ رکھتے تو ممکن ہے کہ وہ بچے کو دریا میں ڈالنے کے بعد شور مچادیتیں کہ میرا بیٹا کہاں گیا لیکن ہم نے اس کے دل سے رابطہ رکھا۔ گویا قلب رابطہ دین پر استقامت عطا فرماتا ہے۔ احکامِ الٰہی پر جم کر کھڑا ہونے کی توفیق عطا ہوتی ہے۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو حکم کی اطاعت کی قوت عطا فرمائی۔ تدبیر کے طور پر انہوں نے اپنی بیٹی یعنی موسیٰ علیہ السلام کی بہن سے کہا کہ دریا کے ساتھ ساتھ چلتی جاؤ اور دیکھو کہ یہ صندوق کہاں جاتا ہے؟ **إِذْ تَمْشِي أُخْتُكَ**۔۔۔وہ ساتھ ساتھ چلتی گئیں تو دیکھا کہ صندوق وہاں پہنچ گیا جو اس فرعون کے غسل وتیراکی کی مخصوص جگہ تھی۔ وہاں فرعون کی ملکہ بھی موجود تھی۔ اس نے دیکھا تو بہت خوش ہوئی۔

اللہ کے مقربین کی محبت ہدایت کا سبب ہے:

موسیٰ علیہ السلام اللہ کے اولوالعزم رسولؑ تھے پھر اللہ نے خصوصی محبت ان پر ڈال دی تھی، جو دیکھتا ان کی

محبت کا اسیر ہو جاتا۔ فرعون کی ملکہ بھی بہت خوش ہوئی کہ یہ تو بہت پیارا اور خوبصورت بچہ ہے، اٹھا کر سینے سے لگا لیا فرعون نے کہا، یہ کسی اسرائیلی نے ڈالا ہوگا اسے قتل کر دیا جائے لیکن اس کی ملکہ نے کہا کہ یہ معصوم ہے، اسے ہم اولاد کی طرح پالیں گے۔ ملکہ کو تو بچے سے محبت ہو گئی تھی تو اس نے ضد کر کے بچے کو محل میں پرورش کے لیے رکھ لیا۔ موسیٰ علیہ السلام سے محبت ملکہ کی ہدایت کا سبب بن گئی۔ قرآن کریم نے ان کے نہ صرف جنتی ہونے کی خبر دی بلکہ ان کی دعا کی قبولیت کا بھی ذکر فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام کے مبعوث ہونے پر جب وہ ایمان لے آئیں اور فرعون کو ان کے ایمان لانے کا پتا چلا تو اس نے ان کے قتل کا حکم دیا اور سخت سزائیں دینا چاہیں تو انہوں نے دعا کی: رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا فِي الْجَنَّةِ وَنَجِّنِيْ مِنْ فِرْعَوْنَ وَعَمَلِهٖ۔۔۔(التحریم: 11) اے میرے ربّ! میرا گھر اپنے قریب جنت میں بنا اور فرعون کی سزاؤں سے مجھے نجات دے دے۔ مفسرین کرام نے لکھا ہے کہ اللہ کریم نے انہیں جنت میں ان کے گھر کا مشاہدہ کرا دیا تھا۔ فرعون تو چاہتا تھا کہ انہیں رسّوں سے باندھا جائے، میخوں سے گاڑا جائے، کوڑوں سے پیٹا جائے لیکن اللہ کریم نے ان سزاؤں سے بچا کر پہلے ہی ان کی روح قبض کر لی۔ انہیں یہ درجہ اس لیے نصیب ہوا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام سے محبت کرتی تھیں۔

یہاں یہ اصول ثابت ہوا کہ اللہ کے بندوں کی محبت دین اور حق پر استقامت کا سبب بن جاتی ہے اور ان کی دشمنی ایمان کے ضائع ہونے کا سبب بن جاتی ہے لہٰذا اہل اللہ سے اگر کوئی استفادہ نہ کر سکے تو کم از کم ان سے دشمنی نہ کرے۔

موسیٰ علیہ السلام نومولود تھے اور ضرورت پیش آئی کہ انہیں دودھ پلایا جائے تو دودھ پلانے والی خواتین کو بلایا گیا۔ جو خاتون بھی دودھ پلانے کے لیے آتی بچہ دودھ نہ پیتا تو آپؑ کی بہن نے ملکہ سے کہا: فَتَقُوْلُ هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى مَنْ يَّكْفُلُهٗ۔۔۔ کیا میں آپ کو ایسے گھر کا پتا نہ دوں جو ان کی کفالت کرے۔ وہ بہت اچھے گھر کی بہت اچھی خاتون ہیں اور وہ اس بچے کی تربیت بھی اچھی کریں گی چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو طلب کیا گیا۔ وہ آئیں، بچے کو گود میں لیا، پیار کیا، سینے سے لگایا تو بچہ پُرسکون ہو کر دودھ پینے لگا۔ ملکہ اور بادشاہ خوش ہو گئے اور انہیں شاہی محل میں بچے کی دیکھ بھال، تربیت اور پرورش پر مقرر کر دیا۔ فرمایا: فَرَجَعْنٰكَ اِلٰٓى اُمِّكَ كَيْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ۔۔۔ اس طرح ہم نے آپؑ کو آپؑ کی والدہ کے پاس واپس پہنچا دیا تا کہ وہ آپؑ کی جدائی سے پریشان نہ ہوں اور آپؑ کو دیکھ دیکھ کر ان کی آنکھیں ٹھنڈی رہیں۔

موسیٰ علیہ السلام پر اپنے ایک اور احسان کا ذکر فرمایا: وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنٰكَ مِنَ الْغَمِّ وَفَتَنّٰكَ فُتُوْنًا۔۔۔ کہ آپؑ کے ہاتھوں ایک قتل ہو گیا تھا۔ اس غم سے بھی ہم نے آپؑ کو نجات عطا فرمائی اور آپؑ پر کئی اور

مشکلات بھی آئیں۔آپؑ بہت سی آزمائشوں سے گزرے۔

جو مشکلات نتیجے کے اعتبار سے اچھی ہوں وہ اچھی ہوتی ہیں:

واقعہ یوں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام جوان ہو گئے اور آپؑ نے ایک فرعونی کو ایک کمزور اسرائیلی پر ظلم کرتے دیکھا تو بیچ بچاؤ کرایا۔ وہ فرعونی آپ سے جھگڑنے لگا۔آپ نے اسے مُکا مارا تو قوت کے باعث مکا زور سے لگا اور وہ مر گیا۔ آگے مزید آزمائش آئی کہ اسی اسرائیلی کو کسی فرعونی سے لڑتا دیکھا تو آپؑ نے اسے سخت سست کہا اور اسے جھگڑے سے باز رہنے کے لیے فرعونی سے ہٹایا تو وہ اسرائیلی کہنے لگا، آپؑ نے کل ایک فرعونی مار دیا تھا آج آپؑ مجھے مارنا چاہتے ہیں۔ اس قبطی یعنی فرعونی نے فرعون سے شکایت کر دی کہ کل جو ہمارا بندہ مارا گیا وہ موسیٰ (علیہ السلام) نے مارا تھا۔اس پر فرعون نے آپؑ کے قتل کا حکم دے دیا۔کسی نے آپؑ کو فرعون کے اس فیصلے کی خبر دے دی تو آپؑ بے سروسامانی کے عالم میں فرعون کی سلطنت سے نکل گئے۔ ان تمام مشکلات کو اللہ کریم اپنا احسان بتا رہے ہیں کہ وہ مصیبتیں اور پریشانیاں آپؑ کی عظمت کے لیے، آپؑ کی شان کے لائق آپؑ کو بلند درجات پہنچانے کا سبب بن گئیں۔فرمایا، موسیٰ (علیہ السلام) ہم نے آپؑ پر بڑی مصیبتیں بھیجیں، آپؑ نے انہیں جھیلا لیکن یہ آپ (علیہ السلام) پر ہمارا احسان ہے۔ اس لیے کہ ان مشکلات کے نتیجے میں ہماری نعمتیں آپ (علیہ السلام) کا انتظار کر رہی تھیں۔فَلَبِثْتَ سِنِيْنَ فِيْٓ اَهْلِ مَدْيَنَ۔۔۔ان مصیبتوں سے گزر کر حضرت شعیبؑ کی صحبت نصیب ہوئی۔فرعون آپؑ کے قتل کا حکم نہ دیتا، آپؑ ملک چھوڑ کر نہ جاتے، پردیس میں پریشان ہو کر آپؑ کسی آبادی کو تلاش نہ کرتے اور وہاں نہ پہنچتے تو یہ نعمتیں کہاں ملتیں؟ گویا یہ مشکلات اللہ کا انعام تھیں کہ اس طرح آپؑ کو حضرت شعیبؑ کے پاس پہنچا دیا۔اہلیہ مل گئی، گھر مل گیا، اولاد ہو گئی، ایک نبیؑ بحیثیت شفیق والد مل گئے۔یہ ساری نعمتیں ملنے والی تھیں لیکن ابھی سب کچھ پردۂ غیب میں تھا۔ اللہ کے مقربین پر آنے والی مشکلات بلند درجات پر پہنچانے کا سبب ہوتی ہیں اور عام بندوں پر آنے والی پریشانیاں اُن کی توبہ کا سبب بن جاتی ہیں تو جس کا نتیجہ اچھا ہو وہ مصیبت بھی نعمت ہوتی ہے۔ جو مصیبت اللہ کی طرف سے آتی ہے وہ بندے کے لیے سنبھلنے کا ایک موقع لاتی ہے۔ بندہ جان لیتا ہے کہ وہ کتنا معذور و مجبور ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم راحت اور مصیبت کا تعین خود کرتے ہیں۔ جو چیز ہمیں اچھی لگے، اسے راحت سمجھتے ہیں اور جو اچھی نہ لگے اسے مصیبت کہتے ہیں۔حق یہ ہے کہ جو چیز نتیجے کے اعتبار سے اچھی ہو، وہ ہمیشہ اچھی ہوتی ہے۔ ثُمَّ جِئْتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوْسٰى ﴿٤٠﴾ پھر اے موسیٰ (علیہ السلام) آپؑ نبوت و رسالت کے مقررہ وقت پر آن پہنچے۔ اللہ ہر کام کو درجہ بدرجہ تکمیل کے مراحل سے گزارتے ہیں جیسے ایک پودا زمین سے اگتا ہے اس پر

ایک کونپل پھوٹتی ہے، اس پر غنچہ بنتا ہے، غنچہ چٹک کر کلی بنتی ہے اور کلی کھل کر پھول بن جاتی ہے۔ آپؑ نے بھی پھول ہی بنا تھا لیکن طریقہ یہی تھا۔ ایک کونپل کی طرح نازک تھے تو آپؑ کو شاہی محل میں پہنچا دیا، وہاں تربیت ہوئی، جب مضبوط ہو گئے تو شعیب علیہ السلام کی مجلس میں پہنچا دیا۔ وہاں غنچہ سے کلی اور پھر کھل کر پھول بننے کا وقت آیا تو آپؑ طور پر جا پہنچے یعنی صحیح موقع، صحیح مقام پر آن پہنچے۔ اللہ کریم رب العالمین ہیں اور ربوبیت کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر چیز کو ابتدا سے لے کر اس کے کمال تک پہنچایا جاتا ہے۔ علمِ الٰہی میں موسیٰ علیہ السلام نبیؑ تھے لیکن جب عالمِ وجود میں آئے تو ولادت کے ساتھ ہی تربیت شروع ہوگئی۔ فرعون کے محل میں رکھ کر پالے گئے تاکہ شاہی انداز سیکھ لیں۔ ایسے حادثات و اتفاقات ہوئے کہ مصر سے بھاگنا پڑا۔ مدین پہنچے، شعیب علیہ السلام کے گھر رہے، پیغمبرانہ انداز کے لیے تربیت ہوئی۔

اس قادرِ مطلق نے دنیا کا نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ ہر چیز کے پیچھے اسباب ہوتے ہیں۔ جن کاموں کو ہم حادثہ یا اتفاق کہتے ہیں وہ چیزیں حادثہ نہیں ہوتیں۔ ہم اتفاقات اس لیے کہتے ہیں کہ ہمیں ان کا پس منظر معلوم نہیں ہوتا۔ اتفاقاً کچھ نہیں ہوتا، وہ ہوتا ہے جو اللہ کریم کرتے ہیں۔ ہماری کم فہمی ہے کہ دعا کر کے یہ چاہتے ہیں کہ ابھی دعا کی ہے ابھی پوری ہو جائے۔ ہم اپنی عقل اور اپنے شعور کے مطابق بات کرتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ہماری خواہش کے مطابق نتیجہ نکلے لیکن نتیجہ اللہ کریم کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ اللہ کریم کا ہر کام کو مکمل کرنے کا ایک طریقہ، ایک انداز اور ایک سلیقہ ہے۔ یوں وہ بتدریج اپنے کمال تک پہنچ جاتا ہے۔

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ﴿۴۱﴾ اور میں نے آپ (علیہ السلام) کو اپنے لیے چن لیا ہے یعنی اب آپ (علیہ السلام) صرف میرا کام کریں گے۔ آپ (علیہ السلام) کی ساری کاوش میرے لیے ہی ہوگی۔ اِذْهَبْ اَنْتَ وَاَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَلَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿۴۲﴾ اب آپؑ اور آپؑ کا بھائی دونوں فرعون کے پاس جائیں اور میری یاد کی طرف سے سستی نہ کیجیے گا۔ اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۴۳﴾ فرعون کے پاس جائیں کہ وہ حد سے گزر گیا ہے۔ اس کی نافرمانی حدود سے تجاوز کر گئی ہے۔

ہر حال میں حق گوئی شیوۂ انبیاؑ ہے:

موسیٰ و ہارون علیہم السلام دنیوی طور پر تہی دست تھے، کمبل کا کرتا اور کچے چمڑے کا جوتا تھا۔ ہاتھ میں ایک عصا تھا اور جسے اللہ کا پیغام دینے جا رہے تھے وہ ایک مطلق العنان، دنیوی شان و شوکت رکھنے والا شہنشاہ تھا۔ متکبر ایسا کہ خود کو خدا منواتا تھا۔ اس کے لاؤ لشکر اور رعب و دبدبے کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ لوگ اسے سجدہ کرتے تھے۔ اسے جا کر کہنا کہ خود بھی توبہ کر۔ اللہ کے بندوں پر مسلط ہونے سے باز آ۔ اپنا باطل نظام ختم کر دے اور لوگوں کو اللہ کی

اطاعت کے مطابق زندہ رہنے دے۔ یہ کام صرف اللہ کے نبیؑ ہی کر سکتے ہیں۔ قرآن پڑھیں تو پتا چلتا ہے کہ جرأت رندانہ کسے کہتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کس جرأت سے کفار ومشرکین کے سامنے حق بیان فرمایا۔ مشرکین مکہ کے سامنے، ابوجہل جیسے فرد کے سامنے یہ آیات پڑھیں۔ حق صرف انبیا علیہم السلام نے بیان فرمایا اور وہی لوگ حق بیان کریں گے، جن کا تعلق اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوگا۔

انبیاؑ کی دعوت کے بنیادی نکات:

انبیاؑ کی دعوت کے تین بنیادی نکات ہیں۔ ایمان و عقائد، عبادات اور معاشرت اور ان میں بھی ایمان وعقائد بنیاد ہیں۔ نظریہ درست ہوتو بات آگے چلتی ہے۔ ایمان بنیاد ہے آگے اس کے اثرات ہیں۔ عبادات اس لیے ہیں کہ اللہ سے تعلق مضبوط رہے اور ہماری پوری زندگی کو سیدھا رکھے، درست رکھے۔ جب ہم معاشرے میں جائیں تو زندگی اس طرح گزاریں جس طرح اللہ نے فرمایا ہے۔ عبادات اللہ سے ایسا تعلق بنا دیتی ہیں کہ وہ تعلق ہماری پوری معاشرت کو، پوری زندگی کو متاثر کرتا ہے۔

موسیٰ و ہارون علیہم السلام نے بھی فرعون کو یہی کہنا تھا کہ اپنی خدائی چھوڑ دو۔ اللہ، کائنات کا خالق ہے اور تمہارا خالق بھی وہی ہے۔ وہی معبودِ برحق ہے، وہی ربّ العالمین ہے۔ اسی کو معبودِ برحق مان لے اور اپنے نظامِ حیات کو ترک کر کے اللہ کے بتائے ہوئے طریقِ حیات کو اپنا لے لہٰذا دین حق میں عقائد کی درستگی کے بعد عبادات ہیں اور عبادات کا نتیجہ عملی زندگی کی اصلاح ہے۔

ذکر اللہ کی اہمیت:

نبی علیہ السلام وہ ہستی ہوتے ہیں کہ جن سے اللہ کی یاد، اللہ کا ذکر کبھی جدا ہی نہیں ہوتا۔ نبیؑ کے وجود میں یہ برکت ہوتی ہے کہ جو لباس پہنتے ہیں وہ ذاکر ہو جاتا ہے، جس زمین پر قدم رکھتے ہیں وہ ذاکر ہو جاتی ہے۔ فضاء میں جہاں تک نگاہ پڑتی ہے وہ فضائیں ذاکر ہو جاتی ہیں۔ انبیاؑ ایمان کا منبع اور مرکز ہوتے ہیں۔ لوگوں کو ایمان کی تلقین کرتے ہیں، عبادات سکھاتے ہیں، حسنِ عمل کا مجموعہ ہوتے ہیں اور پوری امت کے لیے نمونہ ہوتے ہیں، ایک مثال ہوتے ہیں یعنی ہر عمل میں نبیؑ کامل ہوتے ہیں۔ ذکر میں بھی کامل، عمل میں بھی کامل، ان کا وجود مجسمِ ذکر، مجسمِ تبلیغ ہوتا ہے تو اس ارشادِ باری کے کیا معنی۔ وَلَا تَنِيَا فِي ذِكْرِي ﴿٤٢﴾ ایسا کیوں فرمایا گیا؟ اس لیے کہ موسیٰ علیہ السلام کو خدشہ تھا کہ شاید وہ انہیں دیکھتے ہی ان کے قتل کا حکم نہ دے دے کہ یہ مفرور ہے، اب قابو آ گیا ہے تو اسے قتل کر دیا جائے۔ اس لیے فرمایا کہ ان خدشات کی وجہ سے زیادہ توجہ فرعون کی طرف نہ ہو جائے۔ آپ پہلے درجے میں ذکر الٰہی اور

دوسرے درجے میں فرعون سے بات کریں۔

ذکر اللہ کی یہ اہمیت کہ اللہ کے دو نبیؑ اللہ کے حکم سے فرعون کے پاس جا رہے ہیں جو دنیا کا جابر ترین، ظالم ترین، انتہائی شان و شوکت رکھنے والا ہے۔ ہر کوئی اس سے تھر تھر کانپتا ہے۔ اسے تبلیغ کرنے جا رہے ہیں اور اللہ پاک فرما رہے ہیں کہ تبلیغ کو دوسرے درجے میں اور ذکرِ الٰہی کو اوّل درجے کی اہمیت دیں۔

تبلیغ بھی دین کا کام ہے لیکن ذکر اتنا ضروری ہے، اتنا اہم ہے کہ انبیاؑ کو حکم دیا جا رہا ہے کہ توجہ کا پہلا درجہ میرے ذکر کا ہے اور دوسرے درجے میں فرعون کو تبلیغ کرنا ہے۔ فرمایا، میرے ذکر پر آپؑ کی توجہ تام رہے اور دوسرے درجے میں بات فرعون سے ہو۔

اگر میں یہ بات سمجھا سکا ہوں تو یہ ہے کہ میں نہیں سمجھتا کسی مسلمان کے پاس یہ دلیل ہو کہ ذکر کے بغیر بھی کوئی مسلمان رہ سکتا ہے۔ کم از کم میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جس چیز کی اہمیت اس آیت میں بیان ہوئی ہے۔ اس سے کون مستغنی ہو سکتا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے اپنی معرکۃ الآراء تفسیر مظہری میں لکھا ہے کہ ''ذکرِ قلبی ہر بالغ مسلمان مرد و عورت پر واجب ہے''۔

اگر اب بھی کوئی یہ کہے کہ میں تو صوم و صلوٰۃ کا پابند ہوں، باقی کام شریعت کے مطابق کرتا ہوں تو مجھے ذکرِ قلبی کی کیا ضرورت ہے؟ اُسے پھر بھی ضرورت ہے کہ ذکرِ قلبی کا حکم تو نبیوںؑ کو دیا گیا۔ اگر انبیاؑ کو ذکرِ قلبی کی ضرورت ہے تو عام آدمی اس سے مستغنی کیسے رہ سکتا ہے؟ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ دن رات قرآن، حدیث، فقہ پڑھتے پڑھاتے رہتے ہیں اس لیے انہیں ذکرِ قلبی کی ضرورت نہیں یا یہ کہ وہ تو تبلیغ میں مصروف رہتے ہیں تو کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ نبیوںؑ سے زیادہ تبلیغ ہے ان کی؟ اگر انبیاؑ کو ضرورت باقی ہے تو ہر مسلمان کو ہر حال میں ذکر کی ضرورت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی سمجھے یا نہ سمجھے۔

تربیت کے لیے نرمی شرط ہے:

فرمایا کہ فرعون بہت جابر، گستاخ، متکبر اور ظالم ہے۔ برائی کی تمام حدیں پھلانگ چکا ہے لیکن آپؑ جب اس کو سمجھانے جائیں تو: فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ﴿۴۴﴾ اس سے بات نرم انداز سے کریں۔ ہو سکتا ہے وہ غور کرے اور اسے توبہ نصیب ہو جائے، وہ اللہ کے قرب میں پہنچ جائے اور اُسے خشیتِ الٰہی نصیب ہو جائے۔

اصل میں دلوں کو دلوں سے راہ ہوتی ہے۔ جس کے دل میں دوسرے کے لیے نفرت ہو وہ اسے اچھی بات بھی بتائے تو وہ قبول نہیں کرتا۔ اس کے دل میں نفرت ہوتی ہے وہ بات پر توجہ نہیں دیتا۔ اور جس کے لیے دل میں ہمدردی ہوتی ہے ہم اس سے پیار کرتے ہیں، اس کی بھلائی چاہتے ہیں اور یہی چاہتے ہیں کہ وہ برائی سے بچ جائے تو

ایسا شخص ہماری بات سننے کو تیار ہو جاتا ہے۔

یہی فرمایا جا رہا ہے کہ بلاشبہ فرعون انتہائی متکبر کافر ہے لیکن آپؑ اس سے نرمی اور پیار سے بات کریں۔ ہو سکتا ہے اس کے دل میں بھی نرمی آ جائے اور وہ آپؑ کی بات سن لے، اسے خشوع نصیب ہو جائے۔ خشوع کیا ہے؟ ہر عبادت کی انتہا یہ ہے کہ خشیت الٰہی نصیب ہو جائے، حضورِ حق نصیب ہو جائے۔ ہر کام میں اللہ کی رضا مقدم رہے اور اللہ کی ناراضگی کا اندیشہ رہے کہ کوئی ایسا کام نہ ہونے پائے جس سے میرا اللہ مجھ سے ناراض ہو جائے۔

انبیاؑ کا مقام یہ ہے کہ اُنؑ کے سامنے جو ایمان لے آتا ہے وہ ایک نگاہ میں اس مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اسے خشیت نصیب ہو جاتی ہے۔ یعنی اگر فرعون بھی ایمان لے آتا تو دونوں نبیوںؑ کی صحبت کی برکت سے مقامِ خشیت پر پہنچ جاتا، صحابی بن جاتا۔

فرمایا، آپؑ بہر حال اُس سے نرمی اور دلی ہمدردی سے بات کریں۔ وہ ایمان نہ بھی لائے تو قیامت کے دن وہ یہ نہ کہے کہ اللہ تعالیٰ! آپ نے جو نبیؑ بھیجے تھے، انہوں نے اتنی سختی سے بات کی کہ مجھے غصہ آ گیا۔ فرعون کے پاس یہ عذر نہیں ہونا چاہیے۔

دونوں بھائیوں نے عرض کیا: قَالَا رَبَّنَآ اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ اَوْ اَنْ يَّطْغٰى ﴿۴۵﴾ اے رب العالمین! آپ نے ہمیں عظمتِ نبوت عطا کی، آپ نے ہمیں معجزات عطا کیے، آپ نے ہمیں نظامِ حیات عطا فرمایا۔ یقیناً آپ کے ہم پر بڑے احسانات ہیں۔ ہم فرعون کے پاس جا رہے ہیں، ہم اس سے بات بھی نرم انداز سے کریں گے لیکن نرم لہجے میں بھی کریں تو بات بڑی سخت ہے جو خدائی کا دعوے دار ہے اسے کہا جائے کہ توبہ کرو، اللہ کو مانو، اللہ کے بندے بن جاؤ۔ خدائی سے بندگی میں آنے کے لیے کہنا بڑی سخت بات ہے جو ہم کہنے جا رہے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم اس بات سے ڈرتے ہیں کہ وہ ہم پر زیادتی نہ کر گزرے۔ کہیں جاتے ہی وہ ہمیں قید کر لے اور قتل کا حکم صادر کر دے۔ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِيْ مَعَكُمَآ اَسْمَعُ وَاَرٰى ﴿۴۶﴾ فرمایا، آپ دونوں کسی طرح کا کوئی خوف دل میں نہ رکھیں وہ آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں آپؑ دونوں کے ساتھ ہوں، سنتا بھی ہوں اور دیکھتا بھی ہوں۔ آپؑ کو معیتِ باری نصیب ہے۔ جب اللہ آپؑ کے ساتھ ہے تو فرعون آپؑ کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔

فَاْتِيٰهُ فَقُوْلَآ اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰي مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿۴۷﴾ زمانے کے متکبر ترین شخص کو جا کر کہا کہ ہم تیرے پروردگار کے فرستادہ ہیں۔ یہ حوصلے انبیاؑ کے ہی ہوتے ہیں کہ ظالم و جابر کو سرِ دربار کہہ دیا کہ تم بھی اللہ کی باقی مخلوق کی طرح عام مخلوق ہو۔ تم اپنے دعویٰ ربوبیت سے باز آ جاؤ کہ صرف اللہ ہی ربّ ہے۔

فرعونوں نے کم وبیش چار سو سال مصر پر حکومت کی۔ ان کا عہد تقریباً چار صدیوں پر محیط ہے۔ یکے بعد دیگرے یہ فرعون آتے رہے لیکن جو بھی آتا خود کو خدا کہلوانا شروع کر دیتا۔ موسیٰ علیہ السلام کے پہلے جملے نے ہی فرعونوں کی اس ساری عمارت کی بنیاد ہی ہلا کر رکھ دی۔ فرمایا: اِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ ۔۔۔ کہ تمہارا ربّ بھی اللہ ہی ہے۔ اس نے تمہیں پیدا کیا، کوئی ہستی ایسی ہے جو تمہیں زندگی دیتی ہے، رزق دیتی ہے، اسی نے تمہیں مال و دولت دی ہے، اقتدار بخشا ہے، وہی تمہیں موت دے گا۔ جیسا کہ تم خود دیکھتے ہو کہ تم لوگ پیدا ہوتے ہو، بوڑھے ہو جاتے ہو پھر مرجاتے ہو۔ اور اسی ربّ نے ہمیں تمہارے پاس بھیجا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے اُسے توحید باری کی طرف بلایا اور اللہ کی ربوبیت کی طرف متوجہ کیا۔ اس لیے کہ اللہ کو اللہ تو وہ پہلے سے مانتے تھے اللہ کو ربّ نہیں مانتے تھے۔ تکمیلِ ضروریات کے لیے بتوں کے پاس جاتے تھے کہ فلاں بت بیماری سے شفا دیتا ہے اور فلاں رزق دیتا ہے۔ آپؑ نے فرمایا کہ یہ کام تو ربوبیت کے ہیں۔ اللہ ہی ربّ ہے۔ تمہاری ساری ضرورتیں وہی پوری فرماتا ہے اور تم ممنون دوسروں کے ہوتے ہو۔ دینِ حق کی خصوصیت ہی یہی ہے کہ اللہ کا نبیؑ جب مبعوث ہوتا ہے تو صرف عقیدہ نہیں لاتا، صرف عبادات کی تلقین ہی نہیں کرتا بلکہ حقوق و فرائض پر مبنی ایک تہذیب عطا کرتا ہے، جس میں سیاسیات، کاروبار، تجارت، معاش، عدلیہ، گھریلو اور نجی زندگی آجاتی ہے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے عقیدے کی بات کرنے کے بعد فوراً سیاسیات کی بات کی۔ فرمایا: فَاَرْسِلْ مَعَنَا بَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ ۔۔۔ تم نے جو اپنا سیاسی ڈھانچہ بنا رکھا ہے اس میں تم نے بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے۔ تم ان پر ظلم ڈھاتے ہو اپنا بچا کھچا کھانا بھی اتنا ہی دیتے ہو کہ وہ زندہ رہ جائیں اور تمہاری خدمت کرتے رہیں۔ ہم اللہ کے نظام کی بات کرتے ہیں کہ یہ بھی تمہاری طرح کے انسان ہیں۔ ان کے بھی انسانی حقوق ہیں۔ اللہ کے نظام میں ہر ایک کا حق ہے اور ہر ایک کا فرض مقرر ہے لہٰذا تم اپنے حقوق حاصل کرو اور ان کے حقوق انہیں دو۔ اگر تم یہ برداشت نہیں کرتے کہ بنی اسرائیل تمہارے برابر ہو کر تمہارے ملک میں رہیں تو پھر انہیں ہمارے ساتھ بھیج دو۔ ہم انہیں لے کر کسی دوسرے ملک لے جائیں گے۔ تمہیں کوئی حق نہیں ہے کہ تم ان پر سختی کرو۔ یہ بھی اللہ ربّ العالمین کی مخلوق ہیں، تمہارے جیسے انسان ہیں۔ جو تمہارا ربّ ہے وہی ان کا بھی ربّ ہے۔ دوسروں کے حقوق غصب کر کے ان پر مسلط ہو کر بیٹھ رہنا، حکمرانی کی آڑ میں خود عیش کرنا اور دوسروں کو فاقوں مرنے پر مجبور کر دینا، یہ انسانیت نہیں ہے۔

چونکہ جس شخص کا عقیدہ درست نہ ہو اس سے کسی بھلائی کی امید نہیں رکھی جا سکتی اس لیے اللہ کے دونوں نبیوںؑ نے پہلے عقیدے کی بات کی کہ تم ربّ نہیں ہو۔ ربّ وہ ہے جو سارے جہانوں کا ربّ ہے۔ دوسری بات یہ کہی کہ اپنے نظام کو بدلو اور ربّ العالمین کے نظام کو نافذ کرو۔ بنی اسرائیل پر ظلم بند کرو اور انہیں ہمارے ساتھ بھیج دو۔ اگر

تمہیں حیرت ہے کہ ہم دونوں کیسے تمہارے دربار میں آ گئے تو دیکھ لو کہ ہمیں اللہ نے بھیجا ہے۔ ہمیں معجزات عطا فرمائے ہیں تاکہ تمہیں یقین آ جائے کہ ہم اللہ کے پیغمبر ہیں۔

سلامتی کا اصول:

وَالسَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی ﴿۴۷﴾ یاد رکھو سلامتی اسی کے لیے ہے جو اللہ کے دیے ہوئے صحیح راستے پر چلے۔ جو اللہ کے مقرر کردہ صحیح راستے کو چھوڑ کر چلے گا وہ خواہ وقتی طور پر بادشاہ بن جائے، دولت مند ہو جائے، خود کو کامیاب سمجھتا رہے۔ انجامِ کار تباہی ہوگی، آخرت میں مصیبت میں پڑ جائے گا۔ ابدی زندگی تباہ ہو جائے گی لہٰذا سلامتی کا راستہ صرف ایک ہے۔ اللہ کے مقرر کردہ حقوق و فرائض کی ادائیگی، اللہ کی رضا کے لیے، اس کی خوشنودی کے لیے۔ خشیتِ الٰہی کے حصول کے لیے۔ جس طرح صلوٰۃ میں ضروری ہے کہ متوجہ الی اللہ رہے اسی طرح مسلمان کی ساری زندگی ایک نماز ہے۔ رکعات ادا کرنا آسان ہے اور جو نماز کاروبار کے وقت، معاملات دنیا میں لوگوں کے ساتھ ہے اصل امتحان یہاں ہوتا ہے۔ نماز کی رکعات اس لیے ادا کرتے ہیں کہ ہمارا رابطہ اللہ سے رہے۔ عبادات میں ہم اللہ کے حضور اپنی گزارشات پیش کرتے ہیں، سب کچھ اسی سے مانگتے ہیں اور اطاعتِ الٰہی کا وعدہ بھی کرتے ہیں تو دن میں پانچ بار یہ وعدہ کر کے جب عملی زندگی میں جائیں اور یہ وعدہ توڑ دیں تو ہم نے کیسی عبادت کی! ہمیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکمل تہذیب دی، ہم نہیں مانتے تو ہمارا ایمان ناقص ہے، ہماری مسلمانی ادھوری ہے۔ اللہ نے فیصلہ کر دیا ہے کہ سلامتی صرف اسی کے لیے ہے جو اللہ کی عطا کردہ تہذیب کو اپنائے گا۔ عقیدے سے عمل تک جو اللہ کے نبیؐ کے عطا کردہ لائحہ عمل کو اپنائے گا سلامتی اسی کو ملے گی۔

پھر فرعون سے مخاطب ہوئے: اِنَّا قَدْ اُوْحِیَ اِلَیْنَاۤ اَنَّ الْعَذَابَ عَلٰی مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلّٰی ﴿۴۸﴾ کہ یاد رکھو! اللہ نے ہمیں بذریعہ وحی بتا دیا ہے کہ جو انکار کرے گا، اللہ کے احکامات کو جھٹلائے گا، منہ پھیر کر چل دے گا تو یقیناً عذاب اسی کے لیے ہے۔ فرمانبرداروں کے لیے جہاں اللہ کریم کے بے پناہ انعامات ہیں، وہیں نہ ماننے والوں کے لیے بڑے لرزا دینے والے عذاب ہیں۔ اللہ کریم نے پوری زندگی کے اسلوب اسلام میں سمو دیے ہیں جو اللہ کی بھیجی ہوئی ہدایت کی پیروی کرے گا اس کے لیے سلامتی ہی سلامتی ہے۔ دنیا میں، برزخ میں، حشر میں ہر جگہ اس کے لیے سلامتی ہے۔ اور اللہ کے پیغام کی پروا نہ کرنے والوں کے لیے یقیناً عذاب ہے۔

جس کے پاس دلیل نہ رہے وہ جھگڑے پر آ جاتا ہے:

موسیٰ علیہ السلام نے تو دلائل دیے۔ بنیادی دلیل اللہ کی ربوبیت کی دی کہ رب تو وہ ہے جو ہر مخلوق کی ہر ضرورت کو ہمہ وقت جانتا ہے اور اسے پورا کرنے پر قادر ہے۔ تم کیسے ربّ ہو سکتے ہو؟ تم نے کسی کو پیدا کیا نہ زندگی

دی۔ نہ تمہیں کسی کو صحت و بیماری دینے کی قدرت ہے اور نہ ہی تم رازق ہو۔ ربّ العالمین تو اللہ ہے۔ اس نے ایک نظام بنا رکھا ہے جو ذرّے ذرّے پر نافذ ہے۔ وہ آسمانوں سے پانی برساتا ہے، زمین سے کھیتیاں اگاتا ہے، تم اس میں کوئی تبدیلی کر سکتے ہو تو ذرا سیب کے درخت پر انگور لگا دو۔ اس نے شہد کی مکھی کو شہد بنانا سکھایا ہے، تم کسی اور مکھی کو شہد بنانا سکھا دو۔ یقیناً تم سے ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر تم ربّ نہیں ہو۔ ربّ تو وہی ہے جس نے ہر شئے کو اس کے کام پر لگا رکھا ہے اور وہی تمہارا بھی ربّ ہے۔ سارے دلائل سن کر جب وہ لاجواب ہو گیا تو کج بحثی پر اتر آیا۔ کہنے لگا: قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ۝ اے موسیٰ (علیہ السلام) پھر تم دونوں کا ربّ کون ہے؟ موسیٰ علیہ السلام نے بڑا خوبصورت جواب دیا: قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ۝ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو بنایا اور اس کو اس کے کام پر لگا دیا۔ جو چیز جس کام کے لیے بنائی ہے وہی کر رہی ہے۔ اسی خاک سے کہیں کونپلیں نکل رہی ہیں، پودے اُگ رہے ہیں کہیں پھول کھل رہے ہیں اور کہیں پھل لگ رہے ہیں۔ جس طرح کا بیج ہے ویسے ہی پھل لگ رہے ہیں۔ تم خود کو ربّ کہتے ہو تو اس نظام کو بدل کر دکھاؤ۔ اس دلیل سے تمہیں سمجھ آ جائے گی کہ تمہارے اختیار میں کچھ نہیں۔ لیکن ہر کج بحث جھگڑا کرتا ہے۔ جیسے ابراہیم علیہ السلام نے نمرود سے کہا کہ میرا ربّ تو وہ ہے جو زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے تو وہ کہنے لگا، میں بھی زندگی اور موت دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر اس نے دو قیدی بلائے، ایک کو قتل کرا دیا دوسرے کو چھوڑ دیا۔ اور کہا کہ میں نے بھی زندگی دی ہے اور موت بھی دی ہے۔ ابراہیمؑ نے ایسی دلیل دی کہ وہ مبہوت رہ گیا۔ آپؑ نے فرمایا، میرا ربّ سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے اور مغرب میں غروب کرتا ہے۔ تیرے اختیار میں کچھ نہیں تو اسے روک نہیں سکتا۔ اگر تو پروردگار ہے تو سورج کو مغرب سے نکال کر دکھا۔ اللہ کا بنایا یہ نظام تو تب سے چل رہا ہے جب تو نہیں تھا، تیرے آباء و اجداد بھی نہیں تھے۔

موسیٰ علیہ السلام کے دلائل سے جب فرعون عاجز آ گیا تو ایک داؤ لڑایا کہ قوم کو بھڑکانے کے لیے ایسی بات کہوں کہ ساری قوم موسیٰ (علیہ السلام) کے خلاف ہو جائے۔ فرعون نے کہا: قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ۝ اچھا! تو پھر یہ بتاؤ کہ ہمارے باپ دادا جو خدائی کے دعویدار تھے اور وہ جو مجھے سجدے کرتے رہے ان کا کیا حال ہوا؟ وہ کس انجام کو پہنچے۔ فرعون تو یہ چاہتا تھا کہ ایسی بات کہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) فرما دیں کہ وہ جہنمی تھے۔ صریح کفر پر مرنے والا جہنمی ہی ہوتا ہے لیکن آپؑ نے جو فرمایا اس میں سب کے لیے سلامتی تھی۔ آپؑ نے فرمایا: قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَلَا يَنْسَى ۝ ہر بندے کا اعمال نامہ لکھا جاتا ہے اور لوحِ محفوظ میں جمع ہو جاتا ہے۔ کس نے کیا، کیا اور کیا نہیں کیا، اس کا علم اللہ کے پاس ہے اور اللہ کے ہاں کوئی بات بھولتی نہیں اور وہاں غلطی کا امکان نہیں لہٰذا اس بحث کو چھوڑ دو۔ وہ لوگ جانیں اور ان کا ربّ جانے۔ میں مُردوں کی طرف مبعوث نہیں ہوا، میں

زندوں کی طرف مبعوث ہوا ہوں۔تم میرے ساتھ بات کرو۔اس پیغام کو سمجھو جس میں سب کے لیے سلامتی ہے۔

فرعون نے تو ایسی بات کہی تھی کہ موسیٰ علیہ السلام جواباً فرما دیں کہ آباء و اجداد کفر کرتے مر گئے لہٰذا وہ جہنمی ہیں اور یہ سن کر قوم بھڑک اٹھے لیکن موسیٰ علیہ السلام نے پیغمبرانہ فراست کا ثبوت دیا۔

تبلیغ کا قرآنی اسلوب:

تبلیغ کی بنیاد یہ ہے کہ جنہیں دعوت دی جائے ان کے لیے دل میں ہمدردی ہو۔ اللہ کی عظمت بیان کی جائے، اللہ کے احسانات کی طرف متوجہ کیا جائے۔ بات نرمی سے محبت سے پیار سے کی جائے۔ دل میں ان کی بھلائی ہو، محبت ہو، ان کا بھلا چاہنے والے ہوں اور بات دلیل سے کریں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کیسے دلیل سے بات کی! حالانکہ وہ جہنمی تھے کہ کفر پر مرے تھے لیکن آپؑ نے انہیں جہنمی نہیں کہا بلکہ فرمایا کہ میرے مخاطب تم ہو۔ جو دنیا سے جا چکے ہیں اُن کا معاملہ ان کے رب کے ساتھ ہے۔ ان کا نامہ اعمال اللہ کے ہاں محفوظ ہے جہاں نہ کوئی چیز بھولتی ہے نہ وہاں کسی غلطی کا امکان ہے لہٰذا تم اللہ کا پیغام سنو اور اسے اپنا کر سلامتی پالو۔

اس کے بعد آپؑ نے اسے ربّ کریم کے احسانات گنوانے شروع کیے۔ فرمایا: الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّسَلَكَ لَكُمْ فِیْهَا سُبُلًا وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ؕ فَاَخْرَجْنَا بِهٖۤ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾ وہی پروردگار ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو بچھونا بنا دیا۔ کرہ ارض تو بیضوی ہے لیکن انسان کے لیے بچھونے کی طرح بچھا دی گئی ہے اور زمین میں تمہارے لیے راستے بنا دیے گئے ہیں۔ اگر تم صحیح راستے پر چلتے ہو تو منزل پر پہنچتے ہو۔ یہ زمین اور اس میں راستے پتا دیتے ہیں کہ جو ہدایت کا راستہ اپنائے گا وہی کامیابی کی منزل پر پہنچے گا اور جو اللہ کی دی ہوئی ہدایت کو چھوڑ دے گا وہ بھٹک جائے گا، گمراہ ہو جائے گا، برباد ہو جائے گا۔

وہی پروردگار ہے جس نے بارش کا نظام بنا رکھا ہے۔ ہر چیز اپنی ڈیوٹی پر لگی ہوئی ہے۔ سورج کی تپش سے سمندروں کا پانی بخارات کی صورت میں اوپر اٹھتا ہے۔ آسمانوں کی بلندیوں پر پہنچتا ہے۔ ٹنوں پانی ہوا کے دوش پر ہوتا ہے۔ ہوا اسے لیے پھرتی ہے جہاں اللہ کا حکم ہو، وہاں برساتی ہے۔ بجلی کڑکتی ہے تو لرزا دیتی ہے۔ بادلوں میں بجلی کو کیسے چھپا رکھا ہے! یہ سب اس کی قدرت ہے۔

فرمایا، زمین ایک ہی ہے، پانی بھی وہی ہے لیکن ہم زمین سے مختلف اشیاء پیدا فرما دیتے ہیں۔ کہیں اناج اُگتا ہے، کہیں پھل، کہیں سبزیاں اور کہیں دوا کے لیے جڑی بوٹیاں۔ ہر شئے کی تاثیر جدا ہے، ذائقہ مختلف ہے، رنگ اور خوشبو فرق ہے۔

كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی النُّهٰى ﴿۵۴﴾ ان نباتات میں تمہارے لیے غذائیں ہیں اور تمہارے چار پایوں کے لیے بھی۔ ایک حصہ انسانوں کے لیے ہے اور ایک حصہ جانوروں کے لیے۔

اناج تم کھا لیتے ہو اور بھوسہ جانوروں کو دے دیتے ہو۔ پروردگار نے ہر ایک کو اس کا حصہ دیا ہے۔ انسان اناج استعمال کر لیتا ہے، جانور چارا چر لیتے ہیں۔

اس میں عقل والوں کے لیے اللہ کی قدرت پہچاننے کی نشانیاں ہیں۔ صاحب خرد لوگوں کے لیے ان میں بے پناہ دلائل ہیں۔ جو غور و فکر کرتا ہے وہ عظمتِ الٰہی کا قائل ہو جاتا ہے۔ عقل کا اصل کام دلائل کے ساتھ اللہ کی عظمت کا اقرار ہے لیکن جب عقل بھٹکتی ہے تو کج بحثی کرتی ہے اور اللہ کی عظمت کا انکار کر دیتی ہے۔ بے عقل کو کوئی دانا نہیں کہتا۔ جس طرح ایک پاگل شعور سے بے گانہ ہوتا ہے اور یہ پاگل پن اس کے احوال سے ظاہر ہوتا ہے اسی طرح عظمتِ الٰہی سے نا آشنا شخص بھی عقل سے عاری ہوتا ہے۔ اس کے حالات سے اس کی بے عقلی کا اظہار ہوتا ہے۔ وہ بدتہذیب ہوتا ہے، انا پرست ہوتا ہے، برائیوں کو پسند کرتا ہے اور خسارۂ آخرت کے راستے پر چلتا رہتا ہے

دانا وہی ہے جو عظمتِ الٰہی سے آشنا ہو کر اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کرتا ہے۔ اور یہ آشنائی اس کی زندگی کے ہر پہلو سیاسی ہو، عدالتی ہو، معاشی ہو یا معاشرتی پوری زندگی کو متاثر کرے۔ پوری زندگی اس طرح گزاری جائے جیسے اللہ کریم حکم دیتے ہیں۔

اگر ہم ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں، عبادات بجا لاتے ہیں اور اس کا اثر ہمارے معاملات، لین دین، ادائیگی حقوق اور معاشرت پر نہیں پڑتا۔ ہمارا کاروبار درست نہیں ہوتا، طریق انصاف صحیح نہیں ہوتا، طریقِ حکومت درست نہیں، معیشت صحیح نہیں تو یہ کس بات کی دلیل ہے؟ یہ ایمان کی کمزوری کی دلیل ہے۔

ایمان، یقین کا نام ہے۔ اللہ کی توحید پر یقین، عظمتِ الٰہی پر یقین، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر یقین، اللہ کی کتاب پر یقین اور آخرت پر مضبوط یقین۔ ان امور کی تبلیغ کا مقصد زندگی کو اللہ کے فرمان کے مطابق گزارنا ہے۔ تبلیغ خود مقصد نہیں ہوتی، تبلیغ مقصد کا ذریعہ ہوتی ہے۔ مقصد معاشرت ہے۔ اللہ کے ساتھ بندے کا تعلق معاشرت کا حصہ ہے۔ بندے کے ساتھ بندوں کا تعلق معاشرت کا بڑا حصہ ہے۔ ہر نبیؑ نے دین کے ان تینوں شعبوں کو مربوط رکھ کر تبلیغ فرمائی یعنی مکمل ضابطہ حیات عطا فرمایا تو زندگی کا لائحہ عمل ایمان کا نتیجہ اور ماحصل ہے۔

جس طرح ایک طالب علم سال بھر سکول جاتا رہے اور سال کے آخر میں فیل ہو جائے تو یہی سمجھا جاتا ہے کہ اس نے پڑھائی نہیں کی۔ اسی طرح انسان دعویٰ کرے کہ وہ مسلمان ہے، عبادات بھی انجام دے لیکن اس کے معاملات درست نہ ہوں، معاشرت صحیح نہ ہو تو اس کا مطلب ہے کہ نہ اس کا ایمان صحیح ہے نہ عمل درست۔ وہ اللہ کی رضا کے لیے عبادت نہیں کرتا دکھاوے کے لیے کرتا ہے۔ اگر وہ اللہ کی رضا کے لیے کرتا تو اس کی پوری معاشرت سدھر جاتی۔ وہ رزقِ حلال کماتا، اللہ کے حکم کے مطابق خرچ کرتا معاملات میں کھرا ہوتا، حقوق کی ادائیگی کرتا۔

سورۃ طٰہٰ رکوع 3 آیات 55 تا 76

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿٥٥﴾ وَلَقَدْ
اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَاَبٰى ﴿٥٦﴾ قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا
بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿٥٧﴾ فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ
مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَلَاۤ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿٥٨﴾ قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ
الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿٥٩﴾ فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿٦٠﴾
قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ
وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾ فَتَنَازَعُوْۤا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾
قَالُوْۤا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا
وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿٦٣﴾ فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ
اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿٦٤﴾ قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ
اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿٦٥﴾ قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ
مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿٦٦﴾ فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿٦٧﴾ قُلْنَا لَا
تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿٦٨﴾ وَاَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا
صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ؕ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿٦٩﴾ فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا
قَالُوْۤا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ﴿٧٠﴾ قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ
اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ

مِّنْ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۡ وَلَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا
وَّاَبْقٰى ﴿۷۱﴾ قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالَّذِيْ فَطَرَنَا
فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ۭ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ﴿۷۲﴾ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا
لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۷۳﴾
اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۭ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿۷۴﴾ وَمَنْ
يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿۷۵﴾ جَنّٰتُ
عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾

ہم نے تم کو اسی (زمین) میں سے پیدا فرمایا ہے اور اسی میں تمہیں (بعد موت)
لوٹائیں گے اور اسی سے تم کو دوسری بار نکالیں گے ﴿۵۵﴾ اور یقینا ہم نے اس
(فرعون) کو اپنی سب نشانیاں دکھائیں سو وہ جھٹلاتا اور انکار ہی کرتا رہا ﴿۵۶﴾
کہنے لگا کہ اے موسیٰ (علیہ السلام!) تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو تا کہ اپنے
جادو (کے زور) سے ہمیں ہمارے ملک سے نکال دو ﴿۵۷﴾ تو ہم بھی ضرور
تمہارے مقابلے میں ایسا ہی جادو لائیں گے تو ہمارے اور اپنے درمیان ایک وقت
مقرر کر لو کہ نہ تو ہم اس کے خلاف کریں اور نہ تم (یہ مقابلہ ہوگا ایک) ہموار میدان
میں۔ ﴿۵۸﴾ انہوں (موسیٰ ؑ) نے فرمایا تمہارے (مقابلہ کے) وعدے کا وہ
وقت ہے جس روز (تمہارا) میلہ (نوروز) ہوگا اور یہ کہ (اس دن) لوگ چاشت
کے وقت جمع کیے جائیں گے ﴿۵۹﴾ سو فرعون لوٹ گیا (دربار سے) پھر اپنا
(جادو کا) سامان جمع کیا پھر آیا ﴿۶۰﴾ موسیٰ (علیہ السلام) نے ان (جادوگروں)
سے فرمایا کہ وائے تمہاری کم بختی! اللہ پر جھوٹ مت باندھو پس وہ تمہیں عذاب سے فنا
کر دیں گے اور جس نے جھوٹ باندھا وہ یقیناً نامراد رہا ﴿۶۱﴾ پھر وہ باہم اپنے
معاملے میں جھگڑنے لگے اور چپکے چپکے باتیں کرتے رہے ﴿۶۲﴾ (بالآخر متفق ہو کر)
کہنے لگے یہ دونوں جادوگر ہیں یہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو (کے زور) سے تمہیں تمہاری

سرزمین سے نکال باہر کریں اور تمہارے عمدہ (مذہبی) طریقہ کو نابود کر دیں ﴿۶۳﴾
پس تم اپنی تدبیریں جمع کر لو اور صف باندھ کر (یکجان ہو کر) آؤ اور بے شک آج وہی
کامیاب ہے جو غالب ہوا ﴿۶۴﴾ کہنے لگے اے موسیٰ (علیہ السلام) یا تو آپ (اپنی
چیز) پہلے ڈال دیں اور یا ہم (اپنی چیزیں) پہلے ڈالنے والے بنیں ﴿۶۵﴾ انہوں نے
فرمایا بلکہ تم ہی ڈالو پھر یکایک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں ان (موسیٰ علیہ السلام)
کے خیال میں ان کے جادو کی وجہ سے ایسے آنے لگیں (جیسے) کہ وہ (سانپوں کی
طرح) دوڑتی ہوں ﴿۶۶﴾ سو موسیٰ (علیہ السلام) دل ہی دل میں تھوڑے سے خوف
زدہ ہوئے ﴿۶۷﴾ ہم نے فرمایا ڈریں نہیں بے شک آپ ہی غالب ہیں ﴿۶۸﴾
اور آپ کے داہنے ہاتھ میں جو (عصا) ہے اس کو ڈال دیں ان لوگوں نے جو کچھ بنایا
ہے یہ (عصا) اس سب کو نگل جائے گا بے شک جو کچھ انہوں نے بنایا ہے۔ یہ تو
جادوگروں کے ہتھکنڈے ہیں اور جادوگر جہاں جائے کامیابی نہیں پائے گا ﴿۶۹﴾
پس (یہ سب دیکھ کر) جادوگر سجدے میں گر پڑے کہنے لگے ہم ہارون اور موسیٰ
(علیہما السلام) کے پروردگار پر ایمان لائے ﴿۷۰﴾ (فرعون) بولا کہ پیشتر اس کے
کہ میں تمہیں اجازت دوں تم اس پر ایمان لے آئے یقیناً وہ تمہارا بڑا (استاد) ہے
جس نے تم کو جادو سکھایا ہے سو میں ضرور تمہارے ہاتھ اور پاؤں مخالف جانب سے
کٹوا دوں گا اور کھجور کے تنوں پر تم کو سولی دے دوں گا اور تم کو پتہ چل جائے گا کہ ہم
میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت اور دیر تک رہنے والا ہے ﴿۷۱﴾ انہوں نے کہا
جو دلائل ہمارے پاس آ گئے ہیں ان پر اور جس نے ہمیں پیدا فرمایا ہے اس پر ہم
تمہیں ہرگز ترجیح نہ دیں گے۔ پس تمہیں جو فیصلہ کرنا ہو کر دو، بے شک تم صرف اسی
دنیا کی زندگی میں حکم دے سکتے ہو ﴿۷۲﴾ ہم یقیناً اپنے پروردگار پر ایمان لائے
ہیں تاکہ وہ ہمارے گناہ معاف فرما دیں اور (اسے بھی) جو تم نے ہم سے زبردستی
جادو کرایا اور اللہ ہی بہتر اور باقی رہنے والے ہیں ﴿۷۳﴾ بے شک جو شخص مجرم ہو
کر اپنے پروردگار کے پاس آئے گا تو یقیناً اس کے لیے جہنم ہے نہ اس میں مرے گا

اور نہ جیئے گا ﴿۷۴﴾ اور جو اس کی بارگاہ میں ایماندار ہو کر آئے گا یقیناً اس نے نیک
کام بھی کیے ہوں تو ایسے ہی لوگوں کے لیے بلند درجات ہیں ﴿۷۵﴾ ہمیشہ رہنے
والے باغ جن کے تابع نہریں بہتی ہیں ہمیشہ ان میں رہیں گے اور جو شخص پاک ہو
اس کا یہی انعام ہے ﴿۷۶﴾

تفسیر و معارف

مُشتِ غبار کو تکبر زیب نہیں دیتا:

فرمایا: مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَفِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾ انسانو! تم اپنی حیثیت پر غور کرو، اپنے آپ کو دیکھو تو سہی کہ اسی مٹی سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ تم محض ذرّات تھے، اسی کرۂ ارض کی مٹی سے تمہاری تخلیق کی گئی۔ اللہ ربّ العالمین نے ایک نظام ترتیب دیا کہ اُن خاکی ذرّات کو کہیں سبزی کا روپ دیا، کہیں پھلوں کا، کہیں اناج کا اور وہی ذرّات انسانی قالب میں ڈھل گئے۔ اُنہی ذرّات سے نطفہ بنا، خون بنا انہی سے بچہ پیدا ہوا اور پلتا بڑھتا رہتا ہے، اور پھر تقدیرِ باری دوبارہ تمہیں خاک ملا دیتی ہے۔ تمہاری حیثیت یہ ہے کہ جس طرح کے مادّے کے ذرّات سے تمہارا وجود پیدا ہوا تھا پھر مِٹ کر اسی مادّے کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ کوئی مر کر مٹی میں دفن ہو جائے، یا جل کر راکھ ہو جائے یا کسی جانور کا لقمہ بن جائے، کسی بھی صورت میں بالآخر اسی مادّے کی صورت میں منتقل ہو جاتا ہے۔ انسان کو اپنی حیثیت پر غور کرنا چاہیے کہ مُشتِ غبار ہوتے ہوئے وہ کیسے تکبر کرتا ہے، اکڑتا ہے، اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، اپنے خالق سے سرکشی کرتا ہے؟ اسے یاد رکھنا چاہیے کہ بات موت پر ختم نہیں ہو جاتی۔

موت کے ساتھ یہ معاملہ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ موت ایک ابدی اور دائمی حیات کی ابتدا ہے۔ موت کسی فنا کا نام نہیں ہے، موت سے بندہ دنیا سے برزخ میں منتقل ہو جاتا ہے۔

موت کو سمجھا ہے غافل اختتامِ زندگی
ہے یہ شامِ زندگی، صبحِ دوامِ زندگی

بظاہر زندگی ختم ہو جاتی ہے، لیکن درحقیقت ایک ابدی زندگی شروع ہو جاتی ہے جسے کبھی ختم نہیں ہونا، اور حیات صرف روح کے لیے نہیں ہے بلکہ ایک وقت تک تمہارے جسموں کے ذرّات خاک میں رہیں گے۔ انہی

ذرّات کو اللہ کریم حکم دیں گے، وہ پھر سے انسانی وجود میں ڈھل جائیں گے۔ یوں تمہیں پھر سے کھڑا کر دیا جائے گا جہاں تمہیں اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھنا ہوگا۔ جو حیاتِ مستعار تم نے بسر کی اس کا جواب دینا ہوگا۔ اس دنیا میں جو عقیدہ، جو ایمان رکھا اور اس کے نتیجے میں جو کردار اپنایا، اس کے بارے میں حساب دینا ہوگا۔

یاد رہے کہ ایمان کا گواہ کردار ہوتا ہے، جتنا ایمان مضبوط ہوتا ہے اتنا ہی اعمال کی اصلاح ہوتی چلی جاتی ہے۔ اعمال کی اصلاح ہوتی ہے تو ایمان مزید مضبوط ہوتا ہے آخرت کا ایک دن اللہ کے نزدیک ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ اس حساب سے اگر دنیا میں کوئی سو سال بھی جیئے تو وہ اُس دن کا دسواں حصہ جیا، اور اس مختصر سی مدت میں جو اعمال کرے گا اس کے نتائج بھگتنے ہوں گے۔ پھر کتنا بے وقوف ہے وہ انسان جو لمحاتی لذتوں کے لیے ابدی زندگی کو تباہ کر دے۔ انسان اپنی حیثیت دیکھے، ایک مشتِ غبار سے پیدا کیا گیا، پھر اس پر اس نے خدائی دعوے بھی کیے لوگ بادشاہ اور حکمران بھی کہلائے، بڑے جابر بن گئے چور بنے ڈاکو بنے لیکن انجامِ کار پھر خاک میں ملا دیے گئے۔ خود کو تو بچا نہ سکے پھر دنیا پہ حکمرانی کے دعوے کس کام آئے؟ اگر خاک میں مل کر بھی بات ختم ہو جاتی تو خیر تھی لیکن انسانوں کو پھر کھڑا کیا جائے گا اور زندگی کی مہلت جو دنیا میں دی گئی تھی، سانسوں کی نقدی جو دی گئی تھی اس سے دنیا کے بازار سے کیا خریدا؟ اس کی جوابدہی ہوگی۔ حیاتِ مستعار کے سرمائے سے دنیا کے بازار سے جو بھی انسان خریدے گا وہ اس کا زادِ راہ بن جائے گا۔

معجزہ، کرامت اور شعبدہ:

فرمایا: وَلَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا۔۔۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بہت سے معجزات عطا فرمائے جو انہوں نے فرعون کو دکھائے۔ معجزہ اللہ کا فعل ہوتا ہے جو نبیؐ کے ہاتھ پہ صادر ہوتا ہے، اور نبیؐ کی نبوت اور صداقت کی دلیل ہوتا ہے۔ معجزہ کسی فرد کی ذات کی بڑائی کے لیے نہیں ہوتا بلکہ حق کو ثابت کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ معجزہ باطل کے مقابلے میں حق کو ثابت کرتا ہے، سربلند کرتا ہے اور ایسا فعل ہوتا ہے جو عقل کو عاجز کر دیتا ہے۔ ولی سے با اتباعِ نبیؐ یہی معجزہ کرامت کے طور پر صادر ہوتا ہے۔ ولی کی کرامت دراصل نبیؐ کا معجزہ ہوتی ہے جو اُسے نبیؐ کے اتباع سے نصیب ہوتی ہے۔ معجزہ حق کو ثابت کرنے کے لیے ہوتا ہے ویسے ہی کرامت بھی صرف اس فعل کو ہی کہا جائے گا جو احقاقِ حق کے لیے ہو، ابطالِ باطل کے لیے ہو۔ بدقسمتی سے آج کے دور میں کرامات کی جگہ خرافات نے لے لی ہے اور امت رسومات میں کھو گئی ہے اور حقیقت خرافات میں کھو گئی ہے۔ آج لوگ کہتے ہیں جی فلاں ولی کی کرامت سے میری بھینس نے بچھڑی دے دی، میری گائے شیر دار ہو گئی،

ولی کی کرامت سے میرا گھر گرنے سے بچ گیا۔ یہ کرامات نہیں ہیں۔ کرامت باطل کے مقابلے میں حق کو ثابت کرنے کے لیے ہوتی ہے اور ایسا کام ظاہر ہوتا ہے جو عقلاً محال ہو۔ کرامت احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کے لیے ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جو کام ہوں گے وہ شعبدہ بازی ہوگی وہ نظروں کا دھوکا ہوگا۔ شعبدہ بازی کا مقصد ذاتی شہرت اور دولت کا حصول ہوتا ہے اور یہی حال یہاں واضح ہو جائے گا کہ معجزات تو موسیٰ علیہ السلام نے دکھائے جبکہ عجائبات تو جادوگروں نے بھی بہت دکھائے، لیکن جادوگروں کے سارے شعبدے نظر کا دھوکا اور فرعونیت کو قائم رکھنے کے لیے تھے۔ اُن کے عجائبات دنیوی شہرت اور جادوگروں کے ذاتی مفادات کے لیے تھے اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ الْغٰلِبِيْنَ (113: الاعراف) جادوگروں نے فرعون سے عرض کی کہ اگر ہم جیت گئے تو ہمیں بہت بڑا انعام ملنا چاہیے تو گویا وہ بھی دولت اور شہرت کے طلبگار تھے۔

فرمایا، ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے بہت سارے معجزات فرعون کو دکھائے لیکن فَكَذَّبَ وَاَبٰى ﴿۵۶﴾ اس نے سب ٹھکرا دیے اور انکار پر ہی قائم رہا، بلکہ اس نے بات کو ہی الٹ دیا اور کہنے لگا: قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾ موسیٰ تم یہ جو کچھ دکھا رہے ہو یہ جادو ہے اور یوں لگتا ہے کہ تم اس کے ذریعے ہم سے ہماری مملکت چھیننا چاہتے ہو، ہماری ریاست وسلطنت چھیننا چاہتے ہو۔ گویا یہ حقیقت فرعون کو بھی معلوم تھی کہ جادو سے، شعبدہ بازی سے، دنیوی منفعت حاصل کرنا مراد ہوتی ہے اسی لیے اس نے کہا کہ آپ تو جادو کے زور پہ میری سلطنت چھیننا چاہتے ہیں۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ موسیٰ علیہ السلام کو نبی مان لے تو وہ تو پیروکار بن جائے گا اور موسیٰ علیہ السلام سلطنت کے مالک بن جائیں گے جس میں اس کا اپنا درجہ ایک عام آدمی کا ہوگا۔ لہٰذا فرعون نے انکار کر دیا لیکن موسیٰ علیہ السلام کے لائے گئے معجزات اتنے مضبوط، واضح اور روشن تھے کہ فرعون لرز گیا۔ وہ مطلق العنان حکمران تھا اس کے ایک اشارے پر موسیٰ علیہ السلام قتل کر دیے جاتے لیکن وہ یہ جرأت نہ کر سکا اس لیے کہ وہ معجزات سے خوفزدہ ہو گیا تھا اور سمجھ گیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام معمولی ہستی نہیں اور نہ کبھی انہیں قتل کیا جا سکے گا۔

فرعون نے محض اپنا بھرم رکھنے کے لیے قوم کو فریب دینا چاہا اور کہا کہ یہ جادو ہے اور موسیٰ علیہ السلام جادو کے زور پر ہم سے ہمارا ملک چھیننا چاہتے ہیں۔ مصر میں جادو کا دور تھا اور فرعون کے پاس بہت ماہر جادوگر تھے، کہنے لگا: فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ۔۔۔ ہم آپ کا مقابلہ جادو سے کریں گے۔ اگر آپ کہتے ہیں کہ لاٹھی کا سانپ بن جانا معجزہ ہے تو ہم بھی ایسے شعبدے باز لائیں گے جو جادو سے ایسا کر کے دکھائیں گے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کا مقابلہ:

فرعون کہنے لگا: فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَبَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهُ نَحْنُ وَلَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿٥٨﴾ آپ ہمارے ساتھ مقابلے کے لیے ایک دن مقرر کیجیے، کسی کھلے میدان میں مقابلہ ہو اور آپ بھی وہاں آ جائیں ہم تو مقابلے کے خواہشمند ہیں آپ مقابلے کا دن مقرر کر لیں اور اس کی مخالفت نہ کریں اس دن کو نہ بھولیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿٥٩﴾ یوم الزینہ، جو ان کا ایک طرح کا میلہ یا عید کا روز ہوا کرتا تھا، وہ مقرر کر لو اور چاشت کا وقت رکھو تاکہ لوگ تیار ہو کر پہنچ سکیں۔ اس دن لوگ فارغ ہوتے ہیں کام کاج پر نہیں جاتے، ناچتے گاتے اور خوشیاں مناتے ہیں تو وہی دن مقابلے کے لیے رکھ لیتے ہیں تاکہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد مقابلہ دیکھ سکے۔ اسی روز تم بھی آ جانا اور میں بھی آ جاؤں گا اور ضحیٰ یعنی قبل از دوپہر لوگ وہاں جمع ہو جائیں گے۔ تم بھی اپنے جادوگروں کو لے آنا، ہم دونوں بھائی بھی مقررہ وقت پر پہنچ جائیں گے۔ یہ بات طے ہو گئی ہے۔

چنانچہ فرعون نے اپنی پوری کوشش لگا دی: فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿٦٠﴾ اور ملک میں جتنے ماہر جادوگر تھے سب کو جمع کیا اور اُن سے کہا کہ وہ مقابلے کے لیے تیاری کریں۔ چنانچہ پوری تیاری کے ساتھ، ماہر جادوگروں کی ایک بہت بڑی تعداد کے ساتھ فرعون بھی میدان میں آ گیا۔ بعض حضرات نے جادوگروں کی تعداد آٹھ یا نو سو لکھی ہے، بہرحال صحیح تعداد کا تو علم نہیں ہے لیکن ماہر جادوگروں کا ایک بہت بڑا مجمع تھا جن کے ساتھ فرعون بھی میدان میں آ گیا اور خلقِ خدا بھی جمع ہو گئی۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام بھی تشریف لے آئے اور انہوں نے دیکھا کہ اتنی مخلوق جمع ہو گئی ہے تو انہوں نے سوچا کہ کیوں نہ اللہ کا پیغام دے دیا جائے اور جادوگروں پر بھی اتمامِ حجت ہو جائے۔

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: قَالَ لَهُمْ مُّوْسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۔۔۔ تم جانتے ہو کہ تم جادو کر رہے ہو اور جادو کے ذریعے حق کا راستہ روکنا چاہتے ہو۔ حق کو روکنا تو اللہ سے مقابلہ کرنے کے مترادف ہے اللہ نے مجھے نبیؐ مبعوث فرمایا ہے اور حق کو پھیلانے کا حکم دیا ہے اور یہ تمہاری بدبختی ہے کہ تم حق کو روکنا چاہتے ہو۔ جادو حق کو کبھی مغلوب نہیں کر سکے گا، حق غالب رہے گا لیکن تم تباہ ہو جاؤ گے۔ جادو کے سارے اعمال غلیظ، خبیث اور کفریہ ہوتے ہیں لہٰذا جادو کبھی حق پر غالب نہیں آ سکتا۔ تمہارا یہ دعویٰ کہ یہ طاقتیں تمہیں اللہ نے دی ہیں، صحیح نہیں ہے، یہ طاقتیں دراصل شیطانی ہیں لہٰذا تم اللہ پر جھوٹ نہ باندھو۔ اللہ کبھی باطل کو قوت نہیں عطا کرتے اور یہ جادو شیطانی طاقتیں ہیں جن کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور یہ حق کے مقابلے میں تباہ ہو جائیں گی۔ تمہیں

اس بات سے ڈرنا چاہیے کہ تمہارا یہ کردار تمہیں عذاب میں پھینکنے کا سبب بن جائے گا اور تم دائمی عذاب میں پھنس جاؤ گے۔ انسانیت کی تاریخ دیکھو، ہم سے پہلے بے شمار قومیں گزری ہیں، بہت سے حکمران گزرے ہیں اور بے شمار انبیاؑ گزرے ہیں اور انبیاؑ اور طاغوتی طاقتوں کے مقابلے ہوتے رہے ہیں۔ وَقَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿٦١﴾ اور دیکھ لو ہر مقابلے میں باطل کو ہی شکست ہوئی اور حق غالب رہا۔ تاریخِ عالم اس بات پر گواہ ہے کبھی کسی جادوگر، شعبدہ باز کو اللہ کے نبی پر غلبہ نصیب نہیں ہوا۔

تبلیغ کا قاعدہ:

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ تبلیغ کا ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ اُسے مدلل ہونا چاہیے اور تاریخی واقعات کو دلیل کے طور پر پیش کرنا چاہیے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دلیل پیش کی۔ پہلی قوموں کے حالات میں یہ سبق ہے کہ جس نے اللہ پر جھوٹ بولا وہ تباہ ہوا۔ ماضی قریب میں جو قومیں تباہ ہوئیں اُن کے کھنڈرات اُن کی تباہی کی گواہی دے رہے ہیں پھر تم کیوں تباہی کی طرف جا رہے ہو؟ تاریخِ عالم اس بات پر گواہ ہے کہ انبیاؑ کرام کے مقابلے میں کتنے بڑے شہنشاہ آئے اور منہ کی کھا کر تباہ ہوئے۔ سو تبلیغ کا یہ اصول ہے کہ محض حکم نہ لگایا جائے بلکہ اپنی بات کو دلیل سے ثابت کیا جائے، قرآن اور حدیث سے ثابت کیا جائے اور تاریخی واقعات سے دلیل دی جائے۔

جادوگروں کا مشورہ:

موسیٰ علیہ السلام کی مدلل تبلیغ نے جادوگروں میں اختلافِ رائے پیدا کر دی فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ ۔۔۔ وہ آپس میں جھگڑنے لگے اور اُن میں کچھ نے موسیٰ علیہ السلام کی بات کی تائید کی کہ انبیاؑ کے مقابلے میں آنے والی طاغوتی طاقتیں ہمیشہ تباہ ہوئی ہیں۔ اُن میں باہم اختلافِ رائے پیدا ہو گیا اور کچھ نے مشورہ دیا کہ فرعون کا آلہ کار نہیں بننا چاہیے اور یہ مقابلہ نہیں کرنا چاہیے۔ وَاَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿٦٢﴾ لیکن اُن میں سے بعض جادوگروں کی رائے مختلف تھی، وہ کہنے لگے کہ آہستہ بات کرو اور سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے کہ مقابلہ کرنا چاہیے۔ اتنے بڑے شہنشاہ نے اتنی عزت دی ہے کہ ہمیں مقابلے کے لیے بلایا ہے، ہم پر اتنا بھروسہ کیا ہے اور اتنی بڑی سلطنت میں سے ہمیں بلایا ہے تو ہمیں اُسے دغا نہیں دینا ہے یہ بزدلی نہ کرو اور ڈٹ جاؤ کہ ہمیں مقابلہ کرنا ہے۔ چنانچہ انہوں نے پوشیدہ سرگوشیوں میں طے کر لیا کہ موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ کرنا چاہیے۔

جادوگروں کا مؤقف "ملک اور تہذیب خطرے میں ہے":

جادوگروں نے طے کر لیا کہ مقابلہ کیا جائے اور کہنے لگے: قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ

يُخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَيَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿٦٣﴾ کہ یہ دونوں بھائی بھی جادوگر ہی ہیں البتہ بہت اعلیٰ پائے کے جادوگر ہیں جنہوں نے فرعون جیسے بادشاہ کو بھی مصیبت ڈال رکھی ہے۔ فرعون اِن دونوں سے اتنا مرعوب ہے کہ اتنا بھی نہیں کر سکا کہ اِن کے قتل کا فرمان صادر کر سکے بلکہ مجبوراً ان کی باتیں سن رہا ہے انہیں برداشت کر رہا ہے۔ فرعون چاہتا تو ان کی گرفتاری یا قتل کا حکم دے سکتا تھا لیکن یہ اتنے ماہر جادوگر ہیں کہ فرعون ایسا کچھ بھی نہیں کر سکا۔ یہ دونوں بھائی بنی اسرائیل سے ہیں جو نسلوں سے ہماری غلام ہے لہٰذا یہ چاہتے ہیں کہ اپنے جادو کے زور سے ہمیں غلام بنالیں اور بنی اسرائیل حاکم بن جائیں۔ یہ ہم سے ہمارا ملک چھیننا چاہتے ہیں۔ اگر بات یہاں تک رہتی کہ بنی اسرائیل حکمران اور قبطی محکوم بن جاتے تو بھی قابلِ برداشت ہوتی لیکن یہ تو ہمارے باپ دادا کے دین کو نابود کر دیں گے اور ایک نیا دین جس کے یہ داعی ہیں، نافذ کر دیں گے۔ آج تک ہم اور ہماری قوم فرعون کے ساتھ حکمران ہیں اور بنی اسرائیل ہمارے بے دام غلام ہیں، جن سے ہم بلا اجرت بیگار لیتے ہیں اور انہیں زندہ رکھنے کے لیے چند لقمے کھانا دے دیتے ہیں۔ ہم سے اقتدار کا چھن جانا اور حکمرانی کے بعد غلامی کا ملنا بھی بہت صدمے کی بات ہے اور یہ عجیب بات ہوگی کہ ہم بنی اسرائیل کے غلام بن جائیں لیکن اس سے بھی زیادہ عجیب یہ ہے کہ یہ ہمارے باپ دادا کے وقت سے رائج طریقوں کو ختم کر دیں اور ایک نیا دین رائج کر دیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر ہمارا دین بچے گا نہ دنیا۔ لہٰذا اس کے دفاع کے لیے ضروری ہے کہ بھرپور مقابلہ کیا جائے۔

کہنے لگے: فَاَجْمِعُوْا كَيْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَقَدْ اَفْلَحَ الْيَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿٦٤﴾ آج سب اکٹھے ہو جاؤ اور اپنی ساری تدبیریں جمع کرو، جتنی طاقت جادو کرنے کی کسی میں ہے وہ سب یکجا کر کے مقابلہ کرو۔ یہ معمولی مقابلہ نہیں ہے اس لیے کہ آج جو جیتے گا وہی حکومت کرے گا، اُسی کا دین رائج ہو جائے گا اور حکمرانی بھی اُسی کو ملے گی، ہارنے والے کی حکومت بھی جاتی رہے گی اور اس کی تہذیب بھی نابود ہو جائے گی۔ یہ انتہائی اہم مقابلہ ہے اور اس کے لیے نہ صرف اپنی ساری قوت کو جمع کر کے لاؤ بلکہ یکجان ہو جاؤ اور اس بات کو چھوڑ دو کہ انفرادی شہرت کسے ملے گی، یہ معاملہ ذاتی شہرت کا نہیں بلکہ قومی عزت اور وقار کا ہے۔ آج جو کامیاب رہا اُسے حکومت چھیننے سے بھی کوئی نہیں روک سکے گا اور وہ دین بھی اپنا رائج کرلے گا۔ جو ہار جائے گا وہ محکوم ہو جائے گا اور محکوموں کی بات سنی نہیں جاتی۔ چنانچہ سب مل کر پوری قوت سے مقابلے کے لیے آ گئے۔ گویا اتحاد کی بنیاد باہمی مفادات تھے۔

ادب کا ثمر:

جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام کو نبیؑ تو نہیں مانا لیکن انہیں یہ سمجھ ضرور آ گئی کہ موسیٰ علیہ السلام بہت چوٹی کی شخصیت ہیں جنہوں نے فرعون جیسے متکبر کو ہلا کر رکھ دیا ہے، یقیناً یہ بہت اعلیٰ پائے کے ماہر جادوگر ہیں۔ چنانچہ ازراہِ ادب

انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا: قَالُوْا يٰمُوْسٰۤى اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰى ﴿٦٥﴾ یا موسیٰ! آپؑ اپنا معجزہ پہلے دکھائیں گے یا ہمیں اجازت ہے کہ ہم اپنا کمال پہلے دکھائیں۔

یہ بات قابلِ غور ہے کہ جادوگر موسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا نبی نہیں مانتے تھے لیکن ایک بہت بڑا ماہرِ فن جادوگر سمجھ کر اُن کی تعظیم کر رہے ہیں اور بہت ادب سے اُن سے اجازت طلب کر رہے ہیں۔ انبیاؑ کی تعظیم، اہل اللہ کا ادب، ہدایت نصیب کر دیتا ہے۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزے کو دیکھ کر جادوگروں کو ایمان نصیب ہو گیا جبکہ فرعون اور اُس کے پیروکار مزید گمراہی میں چلے گئے۔ ایک ہی دوا سے ایک مریض صحت یاب ہو سکتا ہے تو دوسرا مر بھی سکتا ہے کیونکہ دوا کا اثر انسانی مزاج کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر کسی کا مزاج اتنا بگڑ چکا ہو تو دوا کی خوراک سے مر سکتا ہے جبکہ وہی دوا کی خوراک ایک اصلاح پذیر مزاج کے حامل کو صحتمند کر سکتی ہے۔

جادو قوتِ مُتَخَیِّلَہ کو متاثر کرتا ہے:

جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام سے بہت ادب سے کہا کہ آپؑ اپنا معجزہ پہلے ظاہر کریں گے یا ہمیں اجازت دیں گے کہ ہم اپنا کمال دکھائیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: بَلْ اَلْقُوْا ۔۔۔ تم اپنا کمال پہلے دکھا دو۔ مفسرینِ کرام فرماتے ہیں کہ جادوگروں نے میدان کو بڑے بڑے شہتیروں سے، لکڑیوں سے اور بڑے بڑے رسّوں سے بھر دیا تھا اور لوگوں کو بہت خوفزدہ کیا کہ پیچھے ہٹ جائیں اپنی صفوں میں رہیں کہ یہ تمام چیزیں اژدھے بن کر کہیں کسی کو نگل نہ لیں ورنہ وہ کسی قسم کے نقصان کے ذمہ دار نہ ہوں گے۔ اس طرح انہوں نے لوگوں پر خوف طاری کر دیا۔ یہ حقیقت ہے کہ جب انسان خوفزدہ ہو جائے تو اس پر جادو کا اثر زیادہ ہوتا ہے۔ اسی لیے تمام جادوگر پہلے بندے کو ڈراتے ہیں کہ تمہارا تو بیٹا مرنے والا ہے، بیٹی تباہ ہونے والی ہے تم نے آنے میں بہت دیر کر دی۔ تمہارا تو علاج ممکن نہیں اب تو بہت دیر ہو چکی لہٰذا بندہ خوفزدہ ہو کر زیادہ پیسے اُن کی نذر کرتا ہے۔ بہر حال جادوگروں کو اپنا کمال دکھانے کی اجازت مل گئی: فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَعِصِيُّهُمْ يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى ﴿٦٦﴾ ان کے جادو سے لوگوں کی قوتِ متخیلہ متاثر ہوئی اور اُنہیں وہ رسّے اور لکڑیاں سانپ اور اژدھے دکھائی دینے لگے۔ قرآن کے یہ الفاظ غور طلب ہیں، بالخصوص ان لوگوں کے لیے جو یہ مانتے ہیں کہ جادو سے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ قرآن کے الفاظ یہ واضح اعلان کر رہے ہیں کہ جادو سے کچھ نہیں ہوتا صرف انسان کی قوتِ متخیلہ کو دھوکا لگتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ ایسا ہو گیا ہے۔ یہاں بھی لوگوں کو میدان میں سانپ اور اژدھے نظر آئے جبکہ وہ رسیاں اور لکڑیاں تھیں۔ قوت متخیلہ ایک ایسا خودکار نظام (Automatic system) ہے کہ اِدھر آپ آنکھ کھولتے ہیں، آنکھ کے شیشے میں جو نظر آتا

ہے۔قوت متخیلہ اُسے مجسم کر کے دماغ کو بھیجتی ہے اور آنِ واحد میں دماغ تجزیہ کر کے آپ کو دِکھا دیتا ہے اور سمجھ آجاتی ہے کہ یہ چارپائی ہے یہ راستہ ہے، یہ چاند ہے، وہ سورج ہے۔اب اگر قوتِ متخیلہ متاثر ہو جائے تو آپ چاند کو دیکھ رہے ہوں گے لیکن دِکھانے والا آپ کو سورج دکھائے گا۔اسی طرح آپ دیوار کو دیکھ رہے ہوں گے جادوگر کہے گا یہ سڑک ہے اور آپ کو وہ سڑک ہی نظر آئے گی۔ چونکہ فرعون کی قوم بے دین تھی، اُن میں نورِ ایمان نہیں تھا جو قوتِ مدافعت پیدا کرتا ہے اُن کی قوتِ متخیلہ جادو سے متاثر ہوگئی۔جتنا ایمان کمزور ہوتا ہے اتنا ہی جادو اثر انداز ہوتا ہے۔اگر اُن لوگوں میں ایمان کی قوت ہوتی تو وہ ہرگز جادو کے چکر میں نہ آتے۔ چنانچہ لوگوں کو وہ رسیاں اور شہتیر بڑے بڑے اژدھا دکھائی دینے لگے جو میدان میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے جبکہ اصل میں وہ رسیاں اور شہتیر ہی تھے۔حق یہ ہے کہ جادو سے چیزوں کی حقیقت نہیں بدلتی اس لیے جادوگروں سے خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے۔آج بھی اگر کوئی جادوگر کے سامنے ڈٹ جائے تو وہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا،لیکن اگر بندہ کمزور پڑ جائے اور اُسے یہ خیال ہو کہ جادوگر کچھ کرنے کی قوت رکھتا ہے تو پھر اس کی قوتِ متخیلہ کو جادو متاثر کر دیتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے خوفزدہ ہونے کا سبب:

فرمایا: فَاَوْجَسَ فِیْ نَفْسِهٖ خِیْفَةً مُّوْسٰی ﴿۶۷﴾ اس مظاہرے کو دیکھ کر موسیٰ علیہ السلام بھی دل ہی دل میں خوفزدہ ہوئے لیکن اُن کے خوف کا سبب اُن کی اپنی ذات نہیں تھی۔وہ یہ نہیں سوچ رہے تھے کہ یہ اژدھا مجھے نگل جائیں گے بلکہ اُن کی فکر بہت بلند تھی۔وہ اللہ کے نبیؑ تھے اُن کا خوف اور اندیشہ اللہ کی مخلوق کے لیے تھا۔وہ سوچ رہے تھے کہ یہ اتنی تعداد میں جو لوگ اس مظاہرے کو دیکھ رہے ہیں اور جن میں اتنی قوت بھی نہیں ہے کہ اپنا دفاع کر سکیں اور انہیں تو سانپ اور اژدھے ہی دکھائی دے رہے ہیں تو ایسا نہ ہو کہ وہ سب جادوگروں کے خوف سے ان کے ساتھ مل جائیں۔

قرآن کریم کا یہ فرمانا کہ موسیٰ علیہ السلام نے بھی دل ہی دل میں خوف محسوس کیا تو یہ بڑی سادہ سی بات ہے کہ انبیاؑ میں بھی بشری تقاضے تو بہرحال ہوتے ہیں لیکن یہ ڈر یا خوف جادوگروں یا اُن کے مظاہرے کا نہیں تھا۔بھلا اللہ کے نبیؑ کو جادوگروں کا کیا ڈر ہو سکتا ہے۔اُن کو یہ اندیشہ تھا کہ اُن کی ساری محنت رائیگاں نہ چلی جائے اور یہ تمام خلقت جو یہ مظاہرہ دیکھ رہی ہے کہیں جادوگروں کو ہی نہ ماننا شروع کر دے۔

اللہ کے رسولؑ ہی غالب رہتے ہیں:

فرمایا: قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰی ﴿۶۸﴾ موسیٰ (علیہ السلام) یہ خطرے محسوس نہ کرو کہ لوگ

دینِ حق کو نہیں مانیں گے تو فکر نہ کرو ایسا کرنے والے تمہارے ربّ کا، تمہارے دین کا اور تمہارا کچھ نہیں بگاڑیں گے۔ رہی بات مقابلے کی تو یہ جان لو کہ قُلْنَا لَا تَخَفْ إِنَّكَ أَنْتَ الْأَعْلَىٰ ﴿٦٨﴾ تم ہی کامیاب رہو گے کہ تم اللہ کے رسولؑ اور نبیؑ ہو، تم حق پر ہو، تم ہی غالب رہو گے۔

فرمایا: وَأَلْقِ مَا فِي يَمِينِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوا۔۔۔ یہ جو آپ کے داہنے ہاتھ میں عصا ہے اسے میدان میں ڈال دیجیے یہ نہ صرف جادوگروں کے جادو کو باطل کر دے گا بلکہ اُن کے ہزاروں سانپوں اور اژدھوں کو بھی نگل لے گا اور سارا میدان صاف کر دے گا۔ چنانچہ آپ علیہ السلام نے عصا پھینکا تو وہ اتنا بڑا اژدھا بن گیا کہ سب پر چھا گیا اور جیسا کہ سانپوں کی عادت ہوتی ہے کہ بڑا سانپ چھوٹے کو کھا جاتا ہے، اس نے سب سانپوں اور اژدھوں کو نگلنا شروع کر دیا اور پلک جھپکنے میں سارا میدان صاف کر دیا۔

یہ اس لیے کہ: إِنَّمَا صَنَعُوا كَيْدُ سَاحِرٍ۔۔۔ جادوگر جو کچھ بھی بناتا ہے وہ محض مکروفریب ہوتا ہے، دکھاوا ہوتا ہے۔

جادوگر کبھی کامیاب نہیں ہوگا:

فرمایا: وَلَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ أَتَىٰ ﴿٦٩﴾ جادوگر کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتا اور اُن میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ وہ خود بھلائی سے محروم ہوتے ہیں تو کسی کو کیا دیں گے۔ آج کی مروجہ زبان میں پروفیسر یا عامل کہلانے والے کسی بھی صورت بھلائی حاصل نہیں کر سکتے اور عامل بڑے عملیات کر کے جو فریب بُنتا ہے کامل کی ایک نگاہ سے وہ سب زائل ہو جاتے ہیں۔ یہ قرآن کے الفاظ ہیں کہ جادوگر کے کسی کام میں بھلائی نہیں ہے۔

ایک دردمندانہ درخواست:

یہ تشریح اُن دوستوں کے لیے ہے جو اپنے اہل خانہ کو جادوگروں، عاملوں کے پاس دم کروانے یا تعویذ لینے کے لیے لے جاتے ہیں۔ جو لوگ جادوگروں کے پاس شفا ڈھونڈتے ہیں انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ جادوگروں کے پاس جانے سے کبھی خیر یا بھلائی نصیب نہیں ہوگی۔ اُن کے پاس جانا گناہ ہے اور ایمان ضائع ہونے کا خطرہ ہے۔ اگر کوئی اس اعتقاد کے ساتھ جادوگروں کے پاس جائے کہ ان کے ہاتھ میں شفا ہے تو یہ کفر ہے۔ جب قرآنِ کریم نے اعلان کر دیا کہ جادوگر محض مکر کرتے ہیں اور اُن کے کسی کام میں بھلائی نہیں اور وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے تو پھر لوگوں سے دردمندانہ درخواست ہے کہ ان منتر پڑھنے والے عاملوں اور جادوگروں کے پاس مت جائیں۔ صحت، بیماری اور موت اللہ کی طرف سے آتی ہے، ہم اللہ کے بندے ہیں اور ہمیں اس کی منشاء کے مطابق جینا ہے۔ جادوگروں، عاملوں

کے پاس جانے کی بجائے اللہ سے دعا کرو، آخر وہ سب کا ربّ ہے، تمہارا بھی ربّ ہے، تمہیں پیدا کرنے والا ہے، تمہیں پالنے والا ہے۔ تم پانچ مرتبہ اس کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنی گزارشات پیش کر سکتے ہو تو پھر خود کیوں نہیں عرض کرتے کہ بارِ الٰہا! میں کمزور ہوں، مجھے اس مصیبت سے نجات دے دے۔ اگر یہ میرے گناہوں کا وبال ہے تو مجھے معاف کر دے۔ بس اتنی سی بات کرنے کی بجائے جادوگروں کے پاس چلے جاتے ہو اور قرآن کہتا ہے کہ جادوگر کچھ بھی کرے اس کے کام میں بھلائی نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کو بھی دیکھا ہے جو ذکر اللہ بھی کرنے آتے ہیں پھر جادوگروں کے پاس بھی چلے جاتے ہیں۔ شاید ذکر پر یقین نہیں ہوتا، جادو پر ہوتا ہے، اور پھر کچھ عرصے بعد خط بھی لکھتے ہیں کہ تکلیف ہوئی اور فلاں جادوگر کے پاس بھی گیا فلاں کے پاس بھی گیا لیکن فائدہ نہیں ہوا۔ مجھے یہ بات سمجھ نہیں آتی کہ اللہ کے نام کی عظمت کو انہوں نے سمجھا کیوں نہیں، مانا کیوں نہیں؟ جادوگروں سے مایوس ہوتے ہیں تو ادھر آتے ہیں۔ بس سب کے لیے دعا ہی کی جاسکتی ہے اور سمجھایا ہی جاسکتا ہے۔

جادو اور معجزے میں فرق:

جادوگروں نے مقابلے پر آنے سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو، اعلیٰ جادوگر سمجھ کر ہی سہی، موسیٰ کا بڑا ادب کیا۔ بہت احترام دیا اور اُن سے عرض کیا کہ آپؑ پہلے اپنا معجزہ دکھانا پسند کریں گے یا ہمیں اجازت دیں گے۔ انہوں نے ہرگز ایسی کوئی بات نہیں کی کہ للکارا ہو یا میدان میں بے ادبی سے پکارا ہو بلکہ بہت احترام سے اجازت مانگی۔ یہی ادب اُن جادوگروں کے کام آگیا اور اُن پر جادو اور معجزے کا فرق واضح ہو گیا۔

حضرت مولانا اللہ یار خانؒ فرماتے تھے کہ جادو کے زور سے اگر کوئی جادوگر سانپ بناتا ہے اور دوسرا کوئی شخص اس جادو کو باطل کر دیتا ہے تو اگر وہ رسّی تھی تو پھر سے رسّی نظر آنے لگتی ہے۔ اگر لاٹھی کو جادو کے اثر سے سانپ بنایا تو جادو کا اثر زائل ہونے کے بعد دوبارہ لاٹھی نظر آئے گی، فنا تو نہیں ہو جائے گی۔ لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا جب اژدھا بنا تو وہ سارے سانپوں اور اژدھوں کو جو لاکھوں کی تعداد میں تھے، نگل گیا اور جب دوبارہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پکڑا تو واپس ساڑھے چار ہاتھ کی لاٹھی بن گیا۔ اس کا حجم بھی وہی رہا، اور وہ ساری لکڑیاں اور رسیاں سب جانے کہاں گئیں اور عصا تو وہی ہاتھ میں پکڑنے والی لاٹھی ہی رہی۔ یہ دیکھنا تھا کہ جادوگروں کو اللہ کریم نے یہ نکتہ سمجھا دیا کہ یہ جادو نہیں ہے بلکہ معجزہ ہے اور اگر موسیٰ علیہ السلام اُن سے بڑے جادوگر ہوتے تو اُن کے جادو کو باطل کر دیتے۔ لوگوں کو سانپ نظر نہ آتے، رسیاں اور لاٹھیاں تو نظر آتیں، وہ تو میدان میں رہتی۔ جادوگر سمجھ گئے کہ یہ اللہ کا کام ہے اور یہ اللہ کے نبیؑ ہیں۔

جادوگروں کو ایمان نصیب ہو گیا:

فرمایا: فَأُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى ۝ سب جادوگر سجدے میں گر گئے اور کہنے لگے ہم اُسی پروردگار کو اپنا ربّ مانتے ہیں، اپنا پروردگار مانتے ہیں جو ہارون اور موسیٰ علیہم السلام کا ربّ ہے۔ اُسی اللہ کو مانتے ہیں جسے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام منوانا چاہتے ہیں۔ جادوگروں کے پاس دلیل تھی اور مظاہرے سے قبل موسیٰ علیہ السلام کے وعظ سے متاثر بھی ہو چکے تھے۔ مفسرینِ کرام لکھتے ہیں کہ جب جادوگر سجدے میں گئے تو اللہ کریم نے اُن پر برزخ منکشف کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی توجہ اور فیضانِ نظر کا یہ اثر ہوا کہ جب انہوں نے سجدے میں سر رکھا تو اللہ نے اُن پر برزخ کے پردے ہٹا دیے اور انہوں نے دل کی آنکھ سے قیامت کا منظر دیکھا، سوال و جواب دیکھے، دوزخ کو دیکھا، جنت کا مشاہدہ کیا اور جب سجدے سے سر اٹھایا تو دینی علوم سے معمور تھے۔

فرعون کا متکبرانہ رویہ:

یہی معجزہ فرعون نے بھی دیکھا، اُس کی قوم نے بھی دیکھا اور جادوگروں نے بھی دیکھا لیکن فرعون پر اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ بھڑک اٹھا کہنے لگا: قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۔۔۔ تم نے میری اجازت کے بغیر کیسے فیصلہ کر لیا ایمان لانے کا؟ اگر یہ سچا ہوتا اور میں مانتا تو میں تمہیں اجازت دیتا کہ تم بھی مانو۔ تم کون ہوتے ہو میری اجازت کے بغیر فیصلہ کرنے والے اور موسیٰ (علیہ السلام) پر ایمان لانے والے؟

فرعون کی سیاسی چال:

چونکہ فرعون بہت بدمعاش تھا اور یقیناً جو لوگ قوموں کو دھوکا دیتے ہیں وہ اگرچہ دیکھنے میں بھولے بھالے بھی نظر آئیں تو اندر سے بہت بدمعاش ہوتے ہیں اور قوموں کو بہت چکر دیتے ہیں۔ فرعون بھی کہنے لگا کہ مجھے سمجھ آ رہی ہے کہ: اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۔۔۔ کہ یہ موسیٰ (علیہ السلام) تم سب کا استاد ہے اور تم لوگوں نے مل کر یہ سازش کی ہے کہ مقابلہ ہوگا اور تم ہار مان جاؤ گے اور موسیٰ (علیہ السلام) جیت جائیں گے۔ تم سب میرے اور میری قوم کے خلاف سازش کر رہے ہو۔ فرعون نے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے اور اپنے ساتھ ملانے کے لیے یہ جھوٹ گھڑا کہ اُسے یہ سمجھ آ گیا ہے کہ موسیٰ (علیہ السلام) اور جادوگر مل کر سازش کر رہے ہیں۔ کہنے لگا یہ جو موسیٰ (علیہ السلام) دس سال غائب رہے ہیں یہ تمہیں جادو سکھاتے رہے ہیں اور یہ

تمہارے استاد ہیں۔ تم سب نے مل کر یہ سازش کی ہے میری قوم کے خلاف، کہ ہم سے سلطنت چھین لو گے اور تم خود تو موسیٰ (علیہ السلام) کے درباری بن جاؤ گے اور یہ قوم نکال دی جائے گی۔ تم سب نے مل کر میرے ساتھ اور میری قوم کے ساتھ بدمعاشی کی ہے۔ فرعون جانتا تھا کہ حقیقت کیا ہے لیکن وہ لوگوں کی حمایت لینے کے لیے یہ سیاسی بیان دے رہا تھا، جھوٹ گھڑ رہا تھا۔ اسی کو آج ہمارے عہد میں سیاست کہتے ہیں کہ دھوکا دیا جائے اور بے ایمانی کی جائے۔ اس معیار پر فرعون بھی اپنے عہد کا بہت بڑا سیاستدان تھا۔

سیاست کا اصل مفہوم:

سیاست کا حقیقی مفہوم ملک کا انتظام وانصرام ہے۔ ملک کو چلانے کے لیے، قوم کی آزادی اور خوشحالی کو قائم رکھنے کے لیے جو انتظامی امور انجام دیے جاتے ہیں اس سارے عمل کو سیاست کہتے ہیں۔ امورِ سلطنت کو حق اور انصاف کے مطابق سرانجام دینا حقیقی سیاست ہے۔

جادوگروں کا استقلال:

فرعون نے لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے جھوٹ بھی گھڑا کہ موسیٰ (علیہ السلام) جادوگروں کے استاد ہیں اور یہ مل کر سازش کر رہے ہیں اور کوئی مقدمہ یا عدالت لگانے کی بجائے فوراً ہی سزا بھی تجویز کر دی تا کہ لوگوں پر بھی خوف طاری ہو جائے۔ کہنے لگا: فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيۡدِيَكُمۡ وَاَرۡجُلَكُمۡ مِّنۡ خِلَافٍ وَّلَاُوصَلِّبَنَّكُمۡ فِىۡ جُذُوۡعِ النَّخۡلِ ۚ وَلَتَعۡلَمُنَّ اَيُّنَاۤ اَشَدُّ عَذَابًا وَّاَبۡقٰى ۝ میں تمہارے ایک طرف کے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کٹوا دوں گا اور تمہارے گلوں میں رسّی کا پھندا ڈال کر کھجور کے بڑے بڑے اونچے تنوں پر لٹکوا دوں گا۔ جب تمہارے ہاتھ پاؤں کٹے ہوں گے، خون بہہ رہا ہوگا گلے میں پھانسی کا پھندا ہوگا اور تڑپ تڑپ کے مرنے لگو گے تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ کس کا عذاب سخت ہے اور کون باقی رہنے والا ہے۔ تم کہتے ہو کہ موسیٰ (علیہ السلام) کے ربّ کے پاس اختیار ہے تو تم جان لو گے کہ اختیار میرے پاس ہے اور ہم میں سے کس کا عذاب زیادہ سخت ہے اور کون زیادہ دیر تک رہنے والا ہے۔ فرعون نے لوگوں کو مرعوب کرنے کے لیے اپنا فیصلہ وہیں پر نافذ بھی کر دیا تا کہ لوگ بھی دیکھ لیں اور اس کا دبدبہ قائم رہے۔ جادوگروں نے جواب میں کہا: قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الۡبَيِّنٰتِ وَالَّذِىۡ فَطَرَنَا فَاقۡضِ مَاۤ اَنۡتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقۡضِىۡ هٰذِهِ الۡحَيٰوةَ الدُّنۡيَا ۝ جو دلیل ہم نے دیکھ لی ہے، جو باتیں ہمارے علم میں آئی ہیں جو موسیٰ علیہ السلام نے ہم تک پہنچائی ہیں اور جو ہم نے سجدے میں دکھایا ہے ان کے مقابلے میں تیری حیثیت پرکاہ کی بھی نہیں، ہم تجھے کوئی وقعت ہی نہیں دیتے۔ اگر تو ہمیں مار دے گا تو قتل کرنے کا جرم اپنے سر

لے گا لیکن موت تو اللہ کی طرف سے آئے گی اور ہم شہید ہوں گے۔ لیکن جو دلائل ہم نے دیکھ لیے ہیں ہم اُن کے مقابلے میں اب تجھے کیا حیثیت دیں کہ تیری کوئی حیثیت ہے ہی نہیں اور جس نے ہمیں پیدا فرمایا ہے، ہمارا پروردگار ہے اس پر ہم تجھے ہرگز ترجیح نہیں دے سکتے۔ تو خود ہماری طرح چند دن کا مہمان ہے اور تیرے پاس عارضی اختیار ہے، ہم خالق کے مقابلے میں تجھے کوئی اہمیت نہیں دیتے لہٰذا: فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ۔۔۔ جو کر سکتا ہے کر لے۔ جو فیصلہ تجھے کرنا ہے، ہاتھ پاؤں کاٹنے ہیں پھانسی دینی ہے یا اس کے علاوہ کوئی عذاب دینا ہے، جو تیرے بس میں ہے کر گزر، اس لیے کہ ہم نے یہ دیکھ لیا ہے کہ تیرے پاس وقتی طور پر اختیار ہے جو اللہ نے تجھے دارِ دنیا میں اختیار دیا ہے۔ تُو جو ظلم کر رہا ہے اپنے آپ پر کر رہا ہے۔ ہم پر کرے گا تو ہمیں اللہ اس کا کئی گناہ زیادہ اجر دیں گے لہٰذا جو کر سکتا ہے کر گزر مگر یاد رکھ تیرا فیصلہ صرف دنیا کی زندگی کو متاثر کرے گا اور ہمارے نزدیک اس زندگی کا خاتمہ اس کی بارگاہ میں حاضری کا ذریعہ ہوگا۔ اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَمَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝ ہم تو اپنے پروردگار کو مان چکے ہیں اور اب ہم اس سے ہٹنے والے نہیں ہیں۔ ہم نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم اب اس سے نہیں ہٹیں گے اور ہم اپنے رب سے امید رکھتے ہیں کہ ہم سے زندگی میں جو خطائیں سرزد ہوئیں وہ ہمیں بخش دے گا ہم پر رحم فرمائے گا۔ تُو نے زبردستی ہم سے یہ بہت بڑا گناہ کروایا کہ تو ہمیں اللہ کے رسولؑ، اللہ کے نبیؑ کے مقابلے پر لے آیا، یہ بہت ہی بڑا گناہ ہے۔ اب اگر اس کے بعد تو ہمیں قتل کر دے تو شاید ہی ہماری بخشش اور معافی کا سبب بن جائے۔ ہم تو اللہ سے معافی کے خواستگار ہیں ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ زندگی بھر جو جادو کیے اُن کی بھی معافی مل جائے اور یہ بہت بڑا گناہ جو تو نے جبراً ہم سے کروایا ہے کہ ہم جادو لے کر اللہ کے نبیؑ کے مقابلے پر آ گئے یہ جرم اگر قتل ہو کر بھی بخشا جائے تو سودا مہنگا نہیں ہے۔ یاد رکھ اللہ ہی کی طرف سب خیر ہے، سب سے بہتر، سب سے بھلا اللہ ہے اور اسی کے لیے بقا ہے، تُو فانی بھی ہے اور خیر سے محروم بھی ہے۔ تجھے دھوکا لگا ہے کہ تو ہمیشہ رہے گا، آج ہمیں مار دے گا، کل تیری موت بھی آئے گی کہ باقی رہنے والی ذات صرف اللہ کی ہے۔

جادوگروں کا اللہ کی ربوبیت پر ایمان کا ثمر:

جادوگروں کی قوتِ ایمانی ملاحظہ ہو کہ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ ہم اللہ پر ایمان لا چکے بلکہ فرمایا: اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا۔۔۔ ہم اپنے پروردگار پر ایمان لا چکے جس نے ہمیں پیدا کیا ہے اور جو ہمیں پال رہا ہے اور جو ہمیں موت دے گا اور جو بعد الموت فیصلے کرے گا، وہ ہمارا پروردگار ہے۔ ہم تو اپنے پروردگار سے شرمندہ ہیں کہ ہم زندگی بھر گناہ کرتے رہے، اور سب بڑا جرم اللہ کے رسولؑ کے مقابلے میں جادو کرنے کا کیا جو تیرے شاہی دبدبے میں کیا۔ یہ اتنا بڑا جرم ہے کہ ہم تو لرز رہے ہیں تو اب اگر تُو ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر پھانسی دے دے تو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

اللہ کے نزدیک ہمارے گناہ جھڑ جائیں گے اور ہماری بخشش ہو جائے گی۔ یہ سودا تو بہت سستا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جنہیں صبح کے سورج نے فرعون کے جادوگروں کے روپ میں دیکھا جن کا اللہ پر ایمان نہیں تھا جو رب العالمین کو جانتے نہیں تھے۔ اُن کی امیدوں کا مرکز فرعون تھا اور وہ اللہ کے رسول ؑ کو نہیں مانتے تھے بلکہ اس کے مقابلے کے لیے آئے تھے۔ اُسی دن کے ڈوبتے سورج نے انہیں موسیٰ علیہ السلام کے جاں نثار شہداء کے روپ میں دیکھا۔ یہ کیا معاملہ ہوا، کیا فرق پڑا؟ فرق یہ پڑا تھا کہ انہوں نے یہ اعلان کر دیا: اِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا۔۔۔ ہم نے اپنے پروردگار کو مان لیا ہے۔ ایمان کا خاصہ یہ ہے کہ جو دوپہر تک فرعون کا ساتھ دے رہے تھے، اس کی رضا کے لیے کوشش کر رہے تھے جب انہیں نورِ ایمان نصیب ہوا تو انہوں نے فرعون کے سامنے حق بیان کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ تو ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹ دے گا، پھانسی دے گا تو یہ ہمارے گناہوں کی بخشش کا سبب بن جائے گا اور ہم شہید ہو جائیں گے، اس سے اچھی بات کیا ہوگی!

مردم شماری کے مسلمان:

اس تناظر میں آج کے مسلمان پتا نہیں کیسے مسلمان ہیں جو جادوگروں سے امیدیں لگاتے ہیں۔ آج بھی اکثر یہ رونا روتے ہیں کہ کسی نے ہماری شادی ہونا روک دیا ہے کسی نے ہماری روزی بند کر دی ہے۔ یہ بات سمجھ لو کہ اللہ رب العالمین ہے اور وہ سب کا پروردگار ہے۔ یہ جادوگر جو ڈراتے ہیں تمہیں یہ تو تم سے پیسے لے کر اپنے شام کے کھانے کا انتظام کرتے ہیں۔ ان کے پاس تو کھانا کھانے کے لیے بھی پیسے نہیں ہوتے اگر یہ تمہاری روزی بند کر سکتے تو اپنے لیے روزی نہ کھول لیتے؟ اگر ان کے پاس اتنی طاقت ہے تو یہ اپنی روزی کیوں نہیں کما سکتے؟ خود ساری عمر گدا کر کے لوگوں سے جھوٹ بول کر اُن کا مال کیوں ٹھگتے ہیں؟

اصل بات یہ ہے کہ ہم حقیقتِ ایمان کو تلاش نہیں کرتے، اور نہ ہی اُسے پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ بس مردم شماری میں دعویٰ کر دیتے ہیں کہ ہم مسلمان ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ کافی ہے۔ یاد رکھیے صرف دعویٰ کافی نہیں ہے، حقیقی ایمان چاہیے اس کی ضرورت ہے۔ ہمیں پروردگار کو ماننا ہے کہ وہی ہمیں صحت دینے والا ہے، بیماری دینے والا ہے۔ وہی ہمیں فراخی دینے والا ہے اور تنگی بھیجنے والا بھی ہے۔ اس نے ہمیں حق دیا ہے کہ تکلیف آئے تو ہم اس سے دعا کریں۔ ہمیں اس کی بارگاہ میں عرض کرنی چاہیے کہ اے اللہ! ہم کمزور ہیں، یہ تکلیف بھی نعمت ہے کہ تیری طرف سے ہے، ہماری تکلیف ہٹا کے ہمیں آسانی کی نعمت عطا فرما۔ یہ بیماری بھی نعمت ہے لیکن ہم کمزور ہیں اسے دور فرما کر صحت کی نعمت عطا فرما۔ دعا کا حق اللہ نے دیا ہے اور اگر کسی بیماری کی طفیل اللہ سے بات کرنے کی سعادت نصیب ہو جائے تو اور کیا چاہیے؟ اس بیماری نے تو ساری قیمت ادا کر دی۔ ہمارے لیے تو

یہ ہی کافی ہے کہ ہم اس کی اطاعت کے لیے کوشاں رہیں، باقی سب معاملات اس کے ہیں۔ لیکن اس سب کے لیے حقیقی ایمان چاہیے اور اگر موسیٰ علیہ السلام کے جادوگروں پر برزخ واضح ہوسکتا ہے تو ہم تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہیں ہم پر کیوں نہیں ہوسکتا؟ ہم برزخ میں کیوں نہیں جھانک سکتے؟ زندگی میں ان جادوگروں نے پہلا سجدہ کیا ان پر برزخ واضح ہوگیا تو ہماری تو عمر گزر گئی سجدے کرتے، ہمیں نظر کیوں نہیں آتا؟ اس لیے کہ انہوں نے کامل ایمان کے ساتھ سجدہ کیا تھا اور ہمیں اس لیے نظر نہیں آتا کہ ہمارے دل متذبذب ہی رہتے ہیں کہ شاید ایسا ہوجائے شاید نہ ہو۔ انہوں نے جب تک نہیں مانا تو نہیں مانا لیکن جب مانا تو ماننے کا حق ادا کردیا، اور اس کامل یقین کے ساتھ اللہ کو ربّ العالمین ماننے کا ثمر یہ ملا کہ انہیں بغیر کسی وعظ ونصائح کے، تمام حقائق سمجھ میں آگئے۔ کہیں یہ تذکرہ نہیں ملتا کہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کوئی سبق سیکھا ہو لیکن دیکھیے وہ کہتے ہیں: وَاللّٰهُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿٧٣﴾ تیرے (فرعون کے) پاس تو چند لمحے ہیں تھوڑی سی مہلت ہے جو اللہ نے تجھے دی ہے۔ تجھے بھی مرنا ہے اور باقی صرف اللہ نے رہنا ہے۔

آج مسلمانوں کے لیے بھی یہی پیغام ہے کہ اللہ کو رب العالمین مانو اور کامل یقین سے مانو اور پھر اس کا ثمر دیکھو۔

شرح صدر اور علم لدُنّی:

جادوگروں نے فرعون سے کہا کہ یاد رکھ: اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ۭ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ﴿٧٤﴾ جو جرم اور گناہ کرتے کرتے، مجرم اور گناہگار بن کر مرجائے گا اور اس حال میں اللہ کے روبروپیش ہوگا اس کے لیے اللہ نے دوزخ تیار کررکھی ہے۔ دوزخ ایسی جگہ ہے جہاں موت کا تصور ہی نہیں اور جہاں زندگی بھی زندگی نہیں ہے صرف عذاب ہے۔

یہ تمام حقائق جادوگروں کو کس نے بتائے؟ یہ ثمر تھا شرح صدر کا کہ نبیؑ پر ایمان لانے سے، نبیؑ سے تعلق قائم ہونے کی وجہ سے نبیؑ کے قلب سے علوم جادوگروں کے قلوب میں براہ راست منتقل ہوئے۔ جادوگروں کو شرح صدر سے جو علم نصیب ہوا، اسے اصطلاح میں علمِ لدنی کہتے ہیں۔ اس حوالے سے سوچا جائے کہ آج کلمہ پڑھنے والا کتنا خوش نصیب ہے کہ اس کا تعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قائم ہوجاتا ہے۔ جب قلب اطہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیفیات ایمان اس کے قلب میں آجائیں تو کلمہ پڑھنے کا مزا آجاتا ہے۔

کہنے لگے: وَمَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿٧٥﴾ اور جو

ایمان کے ساتھ اللہ کے روبرو جائے، اور اس کے ایمان کی دلیل یہ ہوگی کہ اس نے زندگی میں نیک عمل کیے ہوں گے اور اس کا کردار اس کے ایمان کے مطابق رہا ہوگا۔ اس نے صرف دعویٔ ایمان ہی نہیں کیا ہوگا بلکہ اس کا کردار بھی مومن ہوگا تو ایسے مومن کے لیے بہت اعلیٰ و بلند منازل ہیں۔ ان منازل اور عالی شان درجات کی حقیقت کو سمجھنا مادّی عقل سے ممکن نہیں۔ وہاں ایسی نعمتیں ہیں: جَنّٰتُ عَدْنٍ۔۔۔ ہمیشہ رہنے والے باغات ہیں جو سدابہار ہیں جن میں کبھی خزاں نہیں آتی اور وہ ہمیشہ رہنے والے ہیں کبھی تباہ نہیں ہوں گے۔ اور ان باغات کی شان یہ ہے: مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا۔۔۔ نہریں ان کے تابع ہو کر بہتی ہیں۔

یاد رہے کہ دنیا کے باغات پانی کے تابع ہوتے ہیں۔ جہاں پانی پہنچ جائے وہاں باغ لگایا جا سکتا ہے۔ لیکن جنت کے باغات ایسے ہیں کہ پانی اُن کے تابع ہیں۔ جہاں کوئی باغ لگائے گا پانی کی مجبوری ہے کہ وہاں پہنچے، پانی کو وہاں جانا پڑتا ہے۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا۔۔۔ جنت میں داخل ہوں گے تو پھر ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے، وہاں سے انہیں کوئی نہیں نکالے گا۔ اور اے فرعون! یہ انعام ہے: وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾ اس کے لیے جس نے زندگی پاکیزگی میں گزاری، اللہ پر یقینِ محکم کے ساتھ اس کی اطاعت میں زندگی گزاری اور اللہ کی ربوبیت پر یقین اور ایمان میں ثابت قدم رہا۔

یہاں یہ قصہ تمام ہوا، جادوگر شہید ہو گئے اور اپنی منزل کو پا گئے۔ کیا عجیب سماں ہوگا کہ ابھرتے سورج نے جنہیں فرعون کا جادوگر دیکھا، ڈھلتے ہوئے سورج نے انہیں موسیٰ علیہ السلام کے شہدا کے روپ میں دیکھا۔ سبحان اللہ!

سورۃ طٰہٰ رکوع 4 آیات 77 تا 89

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِيْقًا فِي
الْبَحْرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخْشٰى ۝٧٧ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُوْدِهٖ
فَغَشِيَهُمْ مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ۝٧٨ وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ وَمَا هَدٰى ۝٧٩
يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ
الْاَيْمَنَ وَنَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۝٨٠ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ
وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ
هَوٰى ۝٨١ وَاِنِّيْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ۝٨٢ وَمَآ
اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝٨٣ قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰٓى اَثَرِيْ وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ
رَبِّ لِتَرْضٰى ۝٨٤ قَالَ فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ
السَّامِرِيُّ ۝٨٥ فَرَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ
يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ
يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ۝٨٦ قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا
مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا
فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ۝٨٧ فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا
هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۥ فَنَسِيَ ۝٨٨ اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ

وَّلَا يَمۡلِكُ لَهُمۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا ﴿۸۹﴾

اور ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) پر وحی بھیجی کہ ہمارے ان بندوں (بنی اسرائیل) کو راتوں رات لے جایئے پھر ان کے لیے سمندر میں (عصا) مار کر خشک راستہ بنا دیں تا کہ آپ کو کسی قسم کے تعاقب کا اندیشہ نہ رہے، اور نہ (پکڑے جانے کا) ڈر ﴿۷۷﴾ پس فرعون اپنے لشکروں کو لے کر ان کے پیچھے گیا تو سمندر (کی موجوں) نے انہیں ڈھانپ لیا (غرق کر دیا)، جیسا کہ ان کو ڈھانپنا تھا ﴿۷۸﴾ اور فرعون نے اپنی قوم کو گمراہ کیا اور سیدھی راہ نہ دکھائی ﴿۷۹﴾ اے بنی اسرائیل! بے شک ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات بخشی اور ہم نے تم سے (تمہارے پیغمبر سے) طور کی داہنی جانب (آنے) کا وعدہ فرمایا اور (وادی تیہ میں) ہم نے تم پر من اور سلویٰ نازل فرمایا ﴿۸۰﴾ ہم نے جو پاکیزہ چیزیں تم کو دی ہیں ان سے کھاؤ اور اس (کھانے) میں حد سے مت گزرو کہیں پھر ایسا نہ ہو کہ تم پر میرا غضب نازل ہو جائے اور جس پر میرا غضب نازل ہوا پس یقیناً وہ ہلاک (گیا گزرا) ہو گیا ﴿۸۱﴾ اور یقیناً میں ایسے لوگوں کو بخشنے والا (بھی) ہوں جو توبہ کر لیں اور ایمان لائیں اور نیک کام کریں پھر (اسی) راہ پر (قائم بھی) رہیں ﴿۸۲﴾ اور اے موسیٰ (علیہ السلام)! آپ نے اپنی قوم سے (آگے چلے آنے میں) کیوں جلدی کی؟ ﴿۸۳﴾ عرض کیا وہ میرے پیچھے (آ رہے) ہیں اور اے میرے پروردگار! میں نے آپ کی طرف (آنے میں) جلدی اس لیے کی تا کہ آپ راضی ہوں ﴿۸۴﴾ ارشاد ہوا تو ہم نے تمہاری قوم کو تمہارے بعد آزمائش میں ڈالا اور ان کو سامری نے گمراہ کر دیا ﴿۸۵﴾ پس موسیٰ (علیہ السلام) غصہ (اور) غم میں بھرے ہوئے اپنی قوم کے پاس واپس آئے فرمانے لگے اے میری قوم! کیا تم سے تمہارے پروردگار نے ایک اچھا وعدہ نہ فرمایا تھا تو کیا تم پر (معیاد مقررہ سے کچھ) زیادہ زمانہ گزر گیا تھا یا تم نے چاہا کہ تم پر تمہارے پروردگار

کی طرف سے غضب نازل ہو پس اس لیے تم نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف کیا؟ ﴿۸۶﴾ وہ کہنے لگے ہم نے آپ سے جو وعدہ کیا تھا اس کے خلاف اپنے اختیار سے نہیں کیا ولیکن قوم (قبط) کے زیور سے ہم بوجھ اٹھائے ہوئے تھے سو اس کو ہم نے (سامری کے کہنے پر آگ میں) ڈال دیا پھر ایسے ہی سامری نے بھی ڈال دیا ﴿۸۷﴾ اس نے ان لوگوں کے لیے ایک بچھڑا (بنا کر) نکالا (وہ) ایک قالب (تھا) جس میں ایک (بے معنی) آواز تھی تو لوگ (ایک دوسرے سے) کہنے لگے یہی تمہارا معبود ہے اور یہی موسیٰ (علیہ السلام) کا (بھی) معبود ہے پس وہ بھول گئے ہیں ﴿۸۸﴾ پھر کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے تھے کہ وہ ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیتا اور نہ ان کے نقصان اور نفع کا کچھ اختیار رکھتا ہے ﴿۸۹﴾

تفسیر و معارف

بعثتِ انبیاؑ کا مقصد:

یہ ایک بہت ضروری اور غور طلب بات ہے، سمجھنے کی بات ہے کہ اللہ کا نبیؑ جب مبعوث ہوتا ہے تو صرف چند عقائد لے کر نہیں آتا نہ ہی محض چند عبادات کا طریقہ بتاتا ہے اور نہ یہ کہتا ہے کہ پس یہ عقیدہ رکھو یہ عبادت کرو اور باقی جو چاہے کرو۔ ایسا نہیں ہوتا بلکہ اللہ کا نبیؑ عقیدہ بھی لاتا ہے اور اس عقیدے کے مطابق پوری زندگی کا لائحہ عمل لاتا ہے۔ اس لائحہ عمل میں سیاسیات بھی ہیں، اس میں عدل بھی ہے، اس میں تعلیم اور تعلم بھی ہے اور اس میں معیشت اور کاروبار بھی ہے یعنی پوری زندگی کا لائحہ عمل اللہ کا نبیؑ لے کر مبعوث ہوتا ہے۔

جب اللہ کے آخری نبی آقائے نامدار حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو قیامت تک کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی رسالت ہے۔ قیامت تک، عقیدہ اور پوری زندگی کا عمل اسلام ہی ہے۔ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم و تعلم کا خیال نہیں رکھا؟ کیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاملات، لین دین اور معیشت نہیں سکھائی؟ کاروباری قافلے چلتے تھے تو کیا کاروبار نہیں ہوتا تھا؟

ایک فرانسیسی مصنف نے ایک کتاب لکھی ہے، "پیغمبرِ اسلام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)"، اور اس میں

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ولادتِ باسعادت سے لے وصال تک پوری سوانحِ حیات مرتب کی ہے۔ وہ مسلمان نہیں ہے فرانسیسی ہے اس کا اپنا عقیدہ ہے لیکن حقائق تو حقائق ہوتے ہیں اور اس کی بھی زبان سے بولتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے انقلاب پر وہ لکھتا ہے حیرت ہوتی ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) ہجرت فرما کر مدینہ منورہ آئے تو سنِ ہجری کی ابتدا ہوئی اور اسلامی ریاست کی بنیادی اینٹ رکھ دی گئی نو برس تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے اسلامی ریاست کو چلایا، اسلام کے قانون کی تشکیل کی، اسلام کو عملاً نافذ کیا۔ لکھتا ہے کہ مجھے حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ 10 ہجری میں جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کا وصال ہوا تو سارا جزیرہ نمائے عرب اسلامی ریاست کے زیرِ نگین تھا۔ مصنف نے یہ کتاب ایسے ہی نہیں لکھی بلکہ جزیرہ نمائے عرب کا چپہ چپہ پھر کے دیکھا۔ جہاں جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے سفر فرمائے، سفرِ ہجرت فرمایا، جہاں جہاد فرمائے، جن قبائل میں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم تشریف لے گئے اور جو قبائل مسلمان ہو گئے اور جن کے ساتھ مسلمانوں نے جہاد کیے یہ سب اس نے سفر کر کے تحقیق کی۔ لکھتا ہے کہ میں حیران اس بات پر ہوں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کا جب وصال ہوا تو سارا جزیرہ نمائے عرب اسلامی ریاست میں شامل ہو چکا تھا۔ اگر اس کا رقبہ نو سالوں پر تقسیم کیا جائے تو ہر روز 824 مربع کلومیٹر فتوحات بنتی ہیں، یعنی یومیہ 824 مربع کلو میٹر علاقہ ریاستِ اسلامیہ میں شامل ہو تو تب جا کر نو سالوں میں جزیرہ نمائے عرب پر ریاست بنتی ہے۔ قربان جائیے اس جرنیل کے جس نے مدینہ کی ایک بستی سے لے کر پورے جزیرہ نمائے عرب پر ریاستِ اسلام قائم کر دی، جس کا نظام اسلامی تھا، جس کی سیاست اسلامی تھی، جس کی تجارت اسلامی تھی۔ جس کی بنیادی اینٹ جب رکھی جا رہی تھی اس ریاست میں بچوں کی تعلیم کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ اندازہ لگائیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی توجہ تعلیم و تعلم پر کس قدر تھی کہ بدر کے قیدیوں کو فرمایا کہ جو فدیہ نہیں دے سکتے اور لکھنا پڑھنا جانتے ہیں تو مدینہ کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں یہی ان کا فدیہ ہے۔

آج نہ جانے یہ کیا نیا فلسفہ آ گیا ہے کہ دین تو بندے کا ذاتی معاملہ ہے اور ریاستی امور اور سیاست یہ الگ شے ہے۔ اگر سیاست کو دین سے الگ کر دیا جائے تو دین کی اجتماعیت ختم ہو جائے گی پھر تو لوگ فرد فرد ہو کر جئیں گے۔ اسلام لوگوں کو فرد فرد نہیں رہنے دیتا بلکہ اسلام پوری انسانی زندگی کو اجتماعیت کی طرف دعوت دیتا ہے۔ اسلام تو کافروں کو بھی زندہ رہنے کے حقوق دیتا ہے کہ یہ مسلم ریاست میں اپنے حقوق حاصل کر کے معاشرتی سطح پر اچھی زندگی بسر کریں خواہ کفر پر ہی رہیں۔

دورِ حاضر کی زبوں حالی:

اب ہماری اپنی زندگیاں اسلام سے خالی ہو چکی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف کریں، پھر ہم میں سے جو اقتدار میں آتا ہے وہ چاہتا ہے کہ اسلام کی بندشیں مجھ پر نہ ہوں اور میں فرعون کی طرح اپنی ہر خواہش اپنی مرضی سے پوری کرتا رہوں۔ پھر وہ کہتا ہے کہ اسلام کو تو الگ رکھو، معاشی نظام الگ ہوگا۔ پھر معاشی نظام کیا بنایا کہ پورے ملک کو سود کھانے پر لگا دیا۔ پورا ملک اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حالتِ جنگ میں ہے۔ پھر کہتے ہیں مصیبتیں آتی ہیں، جنگ میں تو تکلیفیں ہی آئیں گی۔ جب اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ قومی حیثیت سے جنگ کر رہے ہیں، پھر جنگ میں تو زخم لگتے ہیں تو چیخنے چلانے کی کیا بات ہے۔ اس افراتفری میں بھی جو سود نہیں کھاتا وہ ان دکھوں سے محفوظ ہے۔ اللہ اتنا کریم ہے کہ کروڑوں کی آبادی میں سے چند نفوس کو توفیق بخشی ہے جو سود نہیں کھاتے تو اُن کو وہ تکلیفیں بھی نہیں جو سود خوروں کو ہیں۔ وہ آرام سے رہتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے پہلے دن سے لے کر فرعون کے غرق ہونے تک تقریباً چالیس برس کا عرصہ لگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ساری عمر جہاد میں گزر گئی۔ جب اتمامِ حجت ہو گیا کہ اب فرعون نہیں مانے گا، جادوگروں کا مقابلہ بھی ہو گیا، معجزات بھی دیکھ لیے اور کم و بیش چالیس برس کا عرصہ اس میں گزر گیا۔ اب بات آگئی سیاست کی کہ یہ تبلیغ سے نہیں مان رہا تو آپ علیہ السلام ایسا کریں: وَلَقَدْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ ۔۔۔ ہم نے موسیٰ (علیہ السلام) پر وحی کی کہ میرے بندوں کو لے کر رات کو نکل جاؤ۔ اِسراء رات کے سفر کو کہتے ہیں۔

بنی اسرائیل کا رویہ اور اللہ کی شانِ کریمی:

اس سارے عرصے میں بنی اسرائیل تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طعنے ہی دیتے رہتے تھے کہ آپ علیہ السلام کے آنے سے پہلے تو ہمیں مار پڑتی ہی تھی لیکن آپؑ کے مبعوث ہونے کے بعد بھی ہمیں مار ہی پڑتی ہے تو ہمیں کیا فرق پڑا ہے۔ ہم کیا جانیں کہ ہمارا بھلا ہو رہا ہے؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرماتے کہ صبر کرو، حوصلہ رکھو اللہ تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہارے لیے راستہ بنا دے گا اس لیے کہ اللہ کے نیک بندے ہمیشہ کامیاب رہتے ہیں۔ اللہ کا کرم کتنا وسیع ہے کہ بنی اسرائیل تو شکایت ہی کرتے رہتے تھے اور اللہ کریم فرماتے ہیں کہ میرے بندوں کو لے کر رات کو نکل جاؤ یہ نہیں فرمایا کہ بنی اسرائیل کو لے کر نکل جاؤ۔ واہ مالک! تیرا کرم کتنا وسیع ہے! بنی اسرائیل کا یہ رویہ ہجرت کر کے سمندر کے پار اترنے کے بعد بھی برقرار رہا۔ کبھی کہتے تھے کہ

ہمیں کوئی معبود بنا دو اور گوسالے کو پوجنے لگ گئے۔ کبھی جہاد سے جی چراتے اور جہاد کے حکم کے جواب میں کہتے: فَاذۡهَبۡ اَنۡتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَاۤ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوۡنَ (المائدہ: 24) موسیٰ علیہ السلام آپ اور آپ کا رب لڑو، ہم تو یہ بیٹھے ہیں۔ بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے حکم دیا کہ میرے بندوں کو لے کر رات کو نکل جائیں اور سمندر پر جب پہنچیں تو: فَاضۡرِبۡ لَهُمۡ طَرِيۡقًا فِى الۡبَحۡرِ يَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّلَا تَخۡشٰى ﴿77﴾ آپ علیہ السلام سمندر پر لاٹھی ماریئے گا تو اس میں بارہ راستے بن جائیں گے۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل تھے اس لیے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹے تھے اور ہر بیٹے کا اپنا قبیلہ تھا۔ يَبَسًا۔۔۔ سمندر پھٹ جائے گا اور راستوں میں کیچڑ تو کیا، نمی کا اثر تک نہیں ہوگا، بالکل خشک راستے بن جائیں گے۔ آپ علیہ السلام تعاقب یا پکڑے جانے کا بھی اندیشہ نہ کریں۔

بنی اسرائیل کو راتوں رات لے کر نکلنا ایک سیاسی فیصلہ تھا:

بنی اسرائیل کو رات کے اندھیرے میں لے کر نکل جانا ایک سیاسی فیصلہ تھا تو دین سیاست سے الگ کیسے ہو سکتا ہے؟

موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو روانہ ہونے کا حکم دے دیا۔ چونکہ بنی اسرائیل قبطیوں کے بے دام غلام تھے، اُن کے گھروں میں ان سے ہر طرح کی خدمت لی جاتی تھی۔ وہ گھروں کے بھید جانتے تھے زیورات، کپڑے، جوتے وغیرہ اور قیمتی اشیاء کی صفائی، حفاظت وغیرہ سب انہی کے ذمے تھی۔ چونکہ تنومند اور توانا بھی تھے تو جب موسیٰ علیہ السلام نے نکل جانے کا حکم دیا تو بنی اسرائیل کے ہاتھ جو زیور کپڑا یا قیمتی اسباب لگا، وہ بھی انہوں نے قبطیوں کے گھروں سے اٹھا لیا اور نکل پڑے۔

فرعون نے تعاقب کیا:

صبح جب فرعون کو خبر ملی کہ بنی اسرائیل، موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ راتوں رات نکل گئے ہیں تو اس نے فوراً فوج کو تیار کیا اور تعاقب میں نکل گیا۔ بنی اسرائیل پیدل تھے یا سست رو سواریوں پر تھے جبکہ فرعون کے لشکر کے پاس تیز رفتار گھوڑے اور جنگ میں استعمال ہونے والی سواریاں تھیں لہٰذا فرعونی لشکر بہت تیزی سے بنی اسرائیل کے تعاقب میں رواں دواں رہا۔ بنی اسرائیل چلتے چلتے صبح جہاں پہنچے تو آگے سمندر تھا اور پیچھے فرعون کا لشکر طوفان اٹھاتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے پانی پر عصا مارا تو پانی میں راستے بن گئے۔ يَبَسًا۔۔۔ خشک راستے جن میں نمی کا اثر تک نہ تھا۔ راستوں کے گرداگرد پانی کی ایسی بلند دیواریں کھڑی ہو گئیں کہ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے: فَكَانَ

كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيمِ۔۔۔(الشعراء:63) جیسے بلند پہاڑ کھڑے ہوں تو اس طرح سے پانی کے ٹکڑے بن گئے اور درمیان میں راستے بن گئے اور ان راستوں میں ہوا بھی چلنا شروع ہو گئی۔ ہر قبیلہ ایک ایک راستے پر چلنا شروع ہو گیا۔ بنی اسرائیل سمندر کے درمیان میں پہنچے تھے کہ فرعون اور اس کا لشکر کنارے پر پہنچ گئے۔ فرعون نے اپنے لشکر کو تو تعاقب میں سمندر میں اتار دیا لیکن خود ہچکچایا اور کھڑا رہا۔ مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ فرعون سفید رنگ کے شاہی گھوڑے پر سوار تھا اور خود آگے بڑھتے ہوئے ہچکچا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ لشکر کو جانے دوں اور خود بچ جاؤں۔ اتنے میں جبرائیل امین ایک گھوڑی پر سوار ہو کر آئے اور وہ گھوڑی منجانب اللہ ایسی تھی کہ انہوں نے اُسے فرعون کے گھوڑے کے قریب سے گزارا تو گھوڑا اس کے پیچھے لگ گیا، جبرائیلؑ نے گھوڑی کو سمندر میں اتار دیا۔ یوں فرعون کا گھوڑا اُسے لے کر سمندر میں اتر گیا۔

فرعون اپنے لاؤ لشکر سمیت غرق ہو گیا:

فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهِ فَغَشِيَهُم مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿٧٨﴾ فرعون نے اپنے لشکر سمیت ان کا تعاقب کیا اور پیچھے پیچھے سمندر میں اتر گیا۔ بنی اسرائیل تو پار پہنچ گئے جبکہ فرعون اور اس کا لشکر ابھی درمیان میں تھے کہ لہریں آپس میں مل گئیں۔ وہ جو پانی کے بڑے بڑے بلند پہاڑ کھڑے تھے، جب فرعون اور اس کا لشکر گھوڑے دوڑاتے، بگھیاں دوڑاتے سمندر کے درمیان میں پہنچے، وہ پانی کے پہاڑ پھر سے آپس میں مل گئے۔ سمندر کی گہرائیاں تو ربّ ہی جانے کہاں کتنی ہیں؟ بعض جگہ تو میلوں کے حساب سے ہیں، کہیں سے دو میل، کہیں سے پانچ میل وغیرہ، اب پتا نہیں وہاں سمندر کتنا گہرا تھا کہ جب راستے بنے تو کئی سو فٹ بلند پانی کے پہاڑ کٹ کر الگ ہو گئے تھے۔ فرعونیوں کو موجوں نے اس طرح ڈھانپ لیا جس طرح ڈھانپنے کا حق ہو اور سب نابود ہو گئے۔

فرعون کا ایک جرم:

فرمایا: وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَا هَدَىٰ ﴿٧٩﴾ فرعون ایسا بدنصیب تھا کہ اپنی ساری قوم کو بھی گمراہی میں لے گیا اور ان کی راہنمائی کا حق ادا نہ کر سکا۔ فرعون اپنی قوم کو ہدایت کی طرف نہ لا سکا، یہ اس کی کتنی بڑی بدنصیبی تھی کہ اللہ نے اُسے پوری قوم کی راہنمائی سونپی تھی۔ اُسے قوم پر حکومت دی تھی، فضیلت دی تھی اور وہ اس کے حکم پر چلتے تھے تو اس کا فرض تھا کہ اُن کی راہنمائی کرتا۔

یہ اصول ہر زمانے کے حکمرانوں کے لیے ہے کہ قومی راہنماؤں کا فرض ہے کہ قوم کو ہدایت اور نیکی کی طرف لے کر جائیں۔ حکمرانوں کا یہ حق نہیں ہے کہ قوم پر مسلط ہو جائیں، خود اچھا کھائیں اور اچھا پہنیں اور بڑی بڑی

گاڑیاں استعمال کریں اور عوام بد سے بدتر حال سے دوچار ہوتے رہیں۔ حکمران کے پاس اقتدار ہے تو اس کا فرض ہے کہ پوری قوم کی راہنمائی کرے اور اُسے نیکی، ہدایت اور کامیابی کی طرف لے کر جائے۔ فرعون نے یہ حق ادا نہیں کیا اور پوری قوم کو گمراہ کر کے تباہی سے دوچار کر دیا۔

بنی اسرائیل پر اللہ کے احسانات:

بنی اسرائیل سے مخاطب ہو کر ربِّ کریم فرماتے ہیں: یٰبَنِیٓ اِسْرَآءِیْلَ قَدْ اَنْجَیْنٰکُمْ۔۔۔ ہم نے تم پر کتنا احسان فرمایا کہ تمہارے دشمن سے تمہیں نجات دے دی، حالانکہ افرادی قوت اور مادی وسائل سے تم فرعون کا مقابلہ کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ اللہ نے کیسا انتظام فرمایا کہ فرعون ہی نہیں بلکہ فرعون کی پوری فوج، اس کا تمام لاؤ لشکر تمہارے سامنے ایک ہی جھٹکے میں غرق کر دیا اور تمہاری جان چھڑا دی۔ یاد رہے کہ اس زمانے میں فوج آج کی طرح نہیں بنائی جاتی تھی بلکہ پورے ملک میں جتنے نوجوان ہوتے تھے سب لڑنے کی تربیت لیتے تھے اور سب فوجی ہوتے تھے۔ گنتی کے ملازم فوجی رکھے جاتے تھے جو ڈیوٹی کرتے تھے، باقی سب اعلانِ جنگ ہوتے ہی اپنا اپنا گھوڑا اور اپنا ہتھیار لے کر پہنچ جایا کرتے تھے۔ جب فرعون نے تعاقب کا اعلان کیا تو اس کی قوم کے سارے نوجوان جمع ہو گئے اور اللہ کریم نے سب کو غرق کر دیا اور فرعونیوں کی ہر شئے بنی اسرائیل کی ملکیت میں آ گئی۔

ایک بات ضمناً عرض ہے کہ عہدِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام اور خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی فوج کا یہی نظام تھا کہ جب کوئی جہاد پیش آتا تو اعلان کر دیا جاتا اور لوگ اپنا گھوڑا یا اونٹ لے آتے اور سواری نہ ہوتی تو پیدل ہی شامل ہوتے اور اپنا اسلحہ ساتھ لاتے۔ اسی لیے جس کے پاس سواری ہوتی اسے مالِ غنیمت سے دو حصے ملتے تھے جبکہ جس کے پاس سواری نہ ہوتی اُسے غنیمت میں سے ایک حصہ ملتا تھا۔

فرمایا: وَوٰعَدْنٰکُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَیْمَنَ۔۔۔ پھر ہم نے تمہیں طور کی جانب دعوت دی کہ اب سمندر سے پار اتر آئے ہو تو اب طور کی ایک وادی میں سارے لوگ آ جاؤ۔ فرمایا: وَنَزَّلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰی ﴿۸۰﴾ جب تم وادیِ تیہ میں بھٹک رہے تھے اور تمہیں کھانے پینے کی کوئی شئے میسر نہیں آ رہی تھی کہ نہ زمین پر کوئی روئیدگی تھی جو تم کھا سکتے اور نہ ہی اس ویرانے میں پانی تھا کہ تم پی لیتے۔ ہم نے تم پر آسمانوں سے کھانے نازل کیے جو میٹھے اور نمکین دونوں طرح کے تھے۔ دیکھا جائے تو کھانا دو ہی طرح کا ہوتا ہے خواہ مختلف ترکیبوں سے بنا لیں پکوان بہرحال دو قسموں پر تقسیم ہو جاتے ہیں، میٹھے یا نمکین۔ سو فرمایا، ہم نے تم پر من و سلویٰ میٹھے اور نمکین کھانے

آسمانوں سے نازل فرمائے، اور حکم دیا: كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۔۔۔کہ بے تکلف کھاؤ جتنا کھا سکتے ہو کھاؤ۔

غضبِ الٰہی کو دعوت دینے کا کام:

فرمایا: وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۔۔۔لیکن اس میں زیادتی نہ کرنا کہ اپنا رکھ کر دوسرے کا چھیننے لگ جاؤ یا آج کا کھا کر دوسروں سے چھپا کر کل کے لیے الگ کرلو، تو ایسی ہیرا پھیری نہ کرنا جو کھا سکتے ہو کھاؤ کہ یہ روز تازہ نازل ہوجاتا ہے اگر اس میں بھی ہیرا پھیری کروگے تو تم پر میرا غضب نازل ہوگا۔

غور کیجیے کہ اللہ کا نظام ایسا ہے کہ مفت میں اُن پر آسمانوں سے کھانے نازل فرمائے اور روزانہ تازہ اتارے جاتے لیکن اللہ کریم کو اپنے بندوں کا پتا ہے کہ یہ اس پر بھروسہ نہیں کریں گے اور سوچیں گے کہ کیا پتا اگلے دن کھانا نازل ہو یا نہ ہو، لہٰذا اگلے روز کے لیے کچھ نہ کچھ چھپا کے رکھ لیں یا کسی دوسرے کے حصے سے مٹھی بھر لیں۔ فرمایا، اگر ایسا کروگے تو تم پر میرا غضب نازل ہوگا، میرا غصہ واقع ہوگا۔ تمہارے کام بگڑ جائیں گے، صحتیں خراب ہو جائیں گی، فراخی کی جگہ تنگی آجائے گی۔ صحت کی جگہ بیماری آجائے گی، کام رک جائیں گے۔ اللہ کی رحمت کو پانا چاہتے ہو تو لوگوں کے حقوق کا خیال رکھو اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ کے حکم کے مطابق استعمال کرو۔ فرمایا، اگر زیادتی کرو گے، چھینا جھپٹی کروگے، لوگوں کے حقوق پامال کروگے تو تم پر میرا غضب واقع ہوگا۔ فرمایا: وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ﴿٨١﴾ جس پر میرا غصہ وارد ہوگیا وہ تو سمجھو اُڑن چھو ہوگیا، وہ گیا گزرا ہوگیا، اُسے کوئی چھڑانے والا نہیں ہوگا۔ جو غضبِ الٰہی کی لپیٹ میں آگیا وہ ایک بگولے میں اڑ گیا، اس کی نہ کوئی نشانی ملے گی، نہ اس کی کہیں قبر بنے گی، نہ ہی اس کو کوئی یاد کرے گا، اس لیے اللہ کے غضب سے بچو۔

اپنا جائزہ لیں:

قرآن کریم کا موضوع تاریخ نہیں ہے بلکہ تعلیم دینے کے لیے قصے بیان فرماتا ہے۔ ہم اپنی بات کریں، آج ہم کہتے ہیں کہ ہم بڑی تکلیف میں ہیں، ہم بہت دکھی ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم بھی اسی طرح دوسروں کا حق مارتے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم جہاں کام کرتے ہیں وہاں چوری کرتے ہیں، دس گھنٹے کی تنخواہ لے کر آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی کرتے ہیں۔ کام پر گھنٹہ تاخیر سے گئے اور چھٹی سے گھنٹہ پہلے اُٹھ آئے۔ جس کا کام کیا، اس سے کچھ نہ کچھ وصول کرلیا اور کچھ نہیں تو چائے پی لی یا دو سگریٹ ہی نکلوا لیے۔ دوسروں کا حق دبا لیا، چوری چوری پیسے جمع کر لیے اور پھر زکوٰۃ بھی ادا نہ کی۔ ہمیں مصائب کا شکوہ تو رہتا ہے لیکن ہمیں اپنا جائزہ بھی لینا چاہیے کہ کہیں ہم ناجائز کردار اپنا کر اللہ کے غضب کا نشانہ تو نہیں بن رہے؟ معاملاتِ دنیا، ہی نہیں آج تو عبادات میں بھی اپنی مرضی ہی کی جاتی ہے۔

ایک قاعدہ ہے کہ جو بندہ عمرہ ادا کرتا ہے اور اس نے ابھی تک حج ادا نہیں کیا ہوتا تو اس پر حج ادا کرنا فرضِ عین ہوجاتا ہے۔ اس لیے کہ اس پر مکہ مکرمہ، حرمین میں آنے جانے کی استطاعت ثابت ہوگئی۔ اس کے پاس اخراجات، صحت اور وقت کی استطاعت ثابت ہو جاتی ہے لہٰذا اب اس پر حج فرضِ عین ہے، ورنہ جس کے پاس استطاعت نہ ہو اس پر حج فرض نہیں ہے۔ اب مزے کی بات ہے کہ ملک میں اکثر لوگ حج ادا نہیں کرتے لیکن سال میں دو مرتبہ عمرہ ادا کرآتے ہیں۔ یہ اللہ کی اطاعت تو نہ ہوئی یہ تو ذاتی شہرت یا سیر سپاٹا ہوا۔ اگر اللہ کی اطاعت مقصود ہوتی تو پہلے حج کرتے پھر حسبِ توفیق زندگی بھر عمرے کرتے رہتے۔ حج تو فرض ہے جبکہ عمرہ تو ایک نفلی عبادت ہے، جس میں وقت کی کوئی قید نہیں ہے۔ یہ ایک رواج بن گیا ہے اور یہ بات واضح ہوجائے کہ جس نے حج نہیں کیا اور وہ عمرہ کرتا ہے تو اس پر حج شرعاً فرض ہوجاتا ہے لہٰذا اُسے حج کرنا چاہیے۔ ایسے لوگ جو حج نہیں کرتے اور ہر سال عمرہ کرتے ہیں مجرم گردانے جاتے ہیں۔

مصائب کی حقیقت:

مصائب نیک لوگوں پر بھی آتے ہیں اور انبیاؑ پر بھی آئے ہیں۔ اللہ کے مقرب بندوں پر جو مصیبتیں آتی ہیں وہ ترقیءِ درجات کا سبب بنتی ہیں۔ بعض منازل قرب ایسی ہیں جن کو پانے کے لیے مصائب کے سمندر سے گزرنا پڑتا ہے۔ مثلاً شہادت کو پانے کے لیے قتل کی تکلیف سہنی پڑتی ہے، قتل ہونا پڑتا ہے تب جا کر رتبہءِ شہادت ملتا ہے اور اللہ کے عظیم مقرب بندوں نے سب کچھ سہا۔ خانوادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شہادت کی عظمت کو پایا لیکن ایک صحرا میں سینے چھلنی کروا کر، گلے کٹوا کر جانیں دے کر، یہ رتبہ حاصل کیا۔ نیک لوگوں پر اگر بظاہر تکلیف آتی ہے تو ترقیءِ درجات کے لیے ہوتی ہے۔

عام مومن پر جو مصیبت آتی ہے وہ تلافیءِ مافات ہوتی ہے، کہ اس تکلیف کے بدلے میں اللہ کریم اس کی بہت سی خطائیں معاف کر دیتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا مفہوم ہے کہ مومن کے پاؤں میں اگر ذرا سا کانٹا بھی چبھ جائے تو اس کے بدلے میں اس کے کئی گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔ کافر، بدکار، بے دین پر جو بھی مصیبت آتی ہے از قسمِ عقوبات ہوتی ہے۔

توبہ کا دروازہ کھلا ہے:

ہم جب معاملات میں اللہ کی اطاعت نہیں کریں گے تو یہ اللہ کے غضب کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ جب اللہ کا غضب آئے گا تو ہماری کوئی حیثیت نہیں رہے گی اور ہم حالات کے تھپیڑے کھاتے ہوئے

ذلیل ہوتے رہیں گے۔

بار الٰہا پھر کیا کریں؟ فرمایا: وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى ﴿۸۲﴾ میں ہی بخشنے والا ہوں اگر کوئی بہت گناہ کر چکا ہے، بہت بھٹک چکا ہے اپنی ساری زندگی تباہ کر چکا ہے تو اب توبہ کر لے، واپس آ جائے کہ وہ کتنے بھی گناہ کرے، میری بخشش کو عاجز تو نہیں کر سکتا۔ شرط یہ ہے کہ خلوصِ دل سے توبہ کرے، آج اپنی اصلاح کر کے وہ برائیاں چھوڑ دے اور میری بارگاہ میں آ جائے۔ میں بخشنے کے لیے موجود ہوں۔ توبہ یہ ہے کہ اپنا عقیدہ صحیح کرے، ایمان خالص ہو، اپنا عمل درست کرے اور عقیدے کے مطابق اعمال بھی صالح ہوں تب وہ ہدایت یافتہ ہو جائے گا۔ اس کے سارے گناہ معاف کر دوں گا ساری گمراہیاں معاف کر دوں گا اور اس پر سے سارے عذاب ہٹا لوں گا اور ساری مصیبتیں رفع ہو جائیں گی۔ یہ اس لیے کہ وہ ہدایت کو پا گیا، میری رحمت کو پا گیا، لیکن ایسا تب ہوگا جب خلوصِ دل سے توبہ کرے۔ اس بات کی فکر نہ کی جائے کہ کتنے گناہ ہو چکے ہیں۔ جتنے بھی گناہ ہو چکے ہوں، وہ اللہ کی رحمت کو عاجز نہیں کر سکتے۔ یہ کتنی بڑی رعایت ہے، تو انسان کو پہلے لمحے میں توبہ کر لینی چاہیے کہ اگلی سانس کے آنے کا بھروسہ نہیں ہوتا اور اللہ سے وعدہ بھی کرے، معافی بھی مانگے اور اپنے عقیدے کو پرکھے اور جانچے۔ اللہ سے دعا بھی کی جائے کہ اے اللہ! میں کمزور ہوں آپ مجھے نیکی پر چلنے اور قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

ایک خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ لکھا تھا کہ کسی نے ہمارا رزق بند کر دیا ہے، کسی نے ہمارے رشتے بند کر دیے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اللہ کی کائنات میں کوئی اور بھی ایسا ہے جو رزق دیتا ہے یا بند کر دیتا ہے، یا جو اولاد دیتا ہے یا روک لیتا ہے؟ یہ اسلام نہیں یہ تو شرک ہے اور ہم نے کلمہ پڑھ کر بھی شرک اپنا رکھا ہے۔ یہ ٹھیک نہیں ہے۔ چنانچہ حکم ہو رہا ہے کہ توبہ کرنے والا عقیدہ ٹھیک کرے اور اس کے ساتھ کردار کی اصلاح کرے، تو یہ توبہ ہے۔ ورنہ زبانی توبہ کہتا رہے تو وہ توبہ نہیں ہے۔

نیک لوگوں کا ساتھ اختلافات سے بچاتا ہے:

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا: وَوٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ۔۔۔ کہ ہم نے تم سب سے وعدہ کیا تھا کہ طور کی دائیں جانب کی وادی میں آؤ۔ یہ دعوت پوری قوم کی تھی، اور غرقِ فرعون کے بعد جب سمندر کے پاس بنی اسرائیل چل رہے تھے تو موسیٰ علیہ السلام ذوق و محبت میں گرفتار جلدی چلے گئے اور قوم سے آگے نکل گئے۔ چونکہ قوم بارہ قبائل پر مشتمل تھی اور اس میں بچے، بوڑھے، عورتیں سامان اور گاڑیاں بھی تھے جو اپنی رفتار سے چل رہے

تھے، پہنچنا تو انہیں بھی وہیں تھا لیکن یہ ابھی پیچھے تھے۔ لیکن عجیب بات ہوئی کہ جب موسیٰ علیہ السلام جلدی چلے گئے، تو ان کے جانے کے بعد بنی اسرائیل اختلافات کا شکار ہو گئے۔

جب موسیٰ علیہ السلام وادیِ طور میں پہنچے تو ارشاد ہوا: وَمَآ اَعۡجَلَكَ عَنۡ قَوۡمِكَ يٰمُوۡسٰى ﴿۸۳﴾ موسیٰ (علیہ السلام) آپؑ اپنی قوم کو چھوڑ کر جلدی آ گئے، ایسی کیا جلدی تھی، کس بات نے آپ کو اس جلدی پر تیار کیا اور آپ قوم کو پیچھے چھوڑ کر خود آ گئے؟ عرض کی: قَالَ هُمۡ اُولَاۤءِ عَلٰٓى اَثَرِىۡ وَعَجِلۡتُ اِلَيۡكَ رَبِّ لِتَرۡضٰى ﴿۸۴﴾ بارالٰہا وہ تو میرے پیچھے پیچھے آ رہے ہیں پہنچ جائیں گے، میں تو آپ کی رضامندی اور خوشنودی کے لیے جلدی چلا آیا۔ میں ذوقِ محبت میں گرفتار تھا اس لیے پہلے پہنچ گیا کہ آپ خوش ہوں گے، مجھ سے راضی ہوں گے۔ میں جلدی حاضر ہو گیا کہ تعمیلِ ارشاد میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔

فرمایا: قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۡۢ بَعۡدِكَ۔۔۔ جب آپؑ انہیں چھوڑ آئے تو ہم نے ان پر آزمائش ڈال دی ہے۔ انہیں امتحان میں ڈال دیا تا کہ ان کی جانچ ہو جائے کہ یہ کس حیثیت کے لوگ ہیں اور اطاعت کرتے ہیں یا نہیں۔ یہاں سے یہ مسئلہ اخذ ہوتا ہے کہ نیک لوگوں کے ساتھ رہنے اور ان سے الگ ہونے سے فرق پڑتا ہے۔ نیک لوگوں کے ساتھ رہنے سے بندہ بہت سی آزمائشوں سے بچا رہتا ہے۔ اگر موسیٰ علیہ السلام قوم کو ساتھ لے کر جاتے تو شاید وہ اختلافات سے بچ جاتی اور لوگ غضبِ الٰہی سے، گمراہی سے محفوظ رہتے۔ ان کے جانے کے بعد اگرچہ ہارون علیہ السلام قوم کے ساتھ تھے لیکن قیادت تو بہر حال موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں تھی۔

یہاں سے ایک اور مسئلہ اخذ ہوتا ہے کہ تعمیلِ ارشاد میں جتنی جلدی ممکن ہو، کرنی چاہیے۔ موسیٰ علیہ السلام کے اس عمل سے یہ پتا چلتا ہے کہ عبادات میں جلدی بہتر ہے، تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔ جب نماز کا وقت ہو جائے تو پہلے نماز پڑھنی چاہیے اور باقی کام مؤخر کر دینے چاہیے۔ بعض اوقات تاخیر سے خلل واقع ہو جاتا ہے۔ نیکی میں تاخیر نہیں کرنی چاہیے۔

بنی اسرائیل پہ آزمائش:

فرمایا: قَالَ فَاِنَّا قَدۡ فَتَنَّا قَوۡمَكَ مِنۡۢ بَعۡدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِىُّ ﴿۸۵﴾ جب آپؑ چلے آئے تو ہم نے آپؑ کی قوم کو آزمائش میں ڈال دیا کہ ان کو پتا چلے کہ یہ خود کیسا عمل کرتے ہیں؟ جب موسیٰ علیہ السلام چلے گئے تو بنی اسرائیل ایسے بدنصیب تھے کہ انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ موسیٰ علیہ السلام تو طور پر چلے گئے ہیں۔ جو کچھ ہونا ہے وہ خود ہی سن کر آ جائیں گے ہمیں کیا ضرورت ہے جانے کی یا پروا کرنے کی۔ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہونے کی یہ برکت تھی

کہ کسی میں اختلاف کی جرأت نہیں تھی لیکن اُن کے جانے کے بعد طرح طرح کے 'محقق' پیدا ہو گئے۔ سب رائے دینے لگے کہ موسیٰ علیہ السلام نبی ہیں ہمارے پیغمبرؑ ہیں، امام ہیں، انہیں اللہ نے کتاب عطا فرمانی ہے اور وہ تشریف لے گئے ہیں تو اللہ انہیں کتاب دے دے گا۔ اب ہم جا کر کیا کریں گے چنانچہ پڑاؤ ڈال کر بیٹھ گئے حالانکہ دین کے معاملات سب کے لیے یکساں ہیں۔ فرائض سب پر فرض ہیں، واجبات سب پر واجب ہیں، سنن سب کے لیے سنن ہیں۔ حلال حرام سب کے لیے ہے، ہر فرد کے لیے ہے۔ اب یہ کہہ دینا کہ میرا باپ بڑا نیک تھا، ولی اللہ تھا تو مجھے مجاہدہ کرنے کی ضرورت نہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔ اگر باپ نے مجاہدہ کیا تو اس کا اجر اُس نے خود پایا ہے تم کرو گے تو اجر پاؤ گے، نہیں کرو گے تو نہیں پاؤ گے۔ بنی اسرائیل پڑاؤ ڈال کر بیٹھ گئے اور چونکہ فرعونیوں کے گھروں سے نکلتے ہوئے اُن کا مال و متاع زیورات وغیرہ بھی اٹھا لائے تھے ان کے پاس بہت سا سونا اور زیورات بھی تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کے جانے کے بعد یہ بات چلی کہ یہ اتنے زیورات کیسے لے کر پھرتے رہیں، ان کا کیا کیا جائے؟ مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ قوم نے حضرت ہارون علیہ السلام سے یہ سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ یہ کافروں کا مال ہے وہ تو غرق ہو گئے لیکن اس طرح سے اُن کا مال لینا بھی جائز نہیں ہے۔ یہ تمہارے لیے حلال نہیں لہٰذا اسے آگ میں ڈال کر گلا لو اور ایک ایک گولا سا بنا کر رکھ لو۔ جب موسیٰ علیہ السلام واپس آئیں گے تو اُن سے فیصلہ لے لیں گے۔

گمراہی کبھی کمال نہیں ہوتی:

وَأَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿٨٥﴾ سامری نے انہیں گمراہ کر دیا۔ سامری بنی اسرائیل میں سے ہی تھا لیکن وہ جادوگر تھا اور جادو کا بہت دلدادہ تھا۔ مصر میں جادو بہت عروج پر تھا۔ مصر کے جادوگر تو موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر تائب ہو گئے لیکن یہ جادوگر ہی رہا۔ جب موسیٰ علیہ السلام قوم کو لے کر نکلے تو سامری بھی ساتھ چلا آیا لیکن جادو والی خُو اس کے ساتھ ہی رہی۔ یہ بہت عجیب بات ہے کہ سامری نے بظاہر موسیٰ علیہ السلام کو مانا بھی، اتباع کیا، اُن کے ساتھ ہجرت کی، سمندر کے پار بھی اتر گیا لیکن استفادہ نہ کر سکا اور جادوگر ہی رہا۔ حتیٰ کہ ایمان بھی نصیب نہ ہوا۔ جو لوگ عملیات میں مشغول ہو جاتے ہیں کہ اس سے مؤکل کی تسخیر کر لیں یا ہمزاد کو مسخر کر لیں، وہ گمراہ ہو جاتے ہیں۔ یہ سب گمراہی ہے، کمال نہیں ہے۔ گمراہی کبھی کمال نہیں ہوتی۔ کمال ہوتا ہے حق پر استقامت۔

فرمایا، آپؑ کے بعد ہم نے بنی اسرائیل کا امتحان لیا، انہیں سامری نے گمراہ کر دیا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ جب بنی اسرائیل نے سارا سونا اور زیورات ایک بھٹی میں ڈال دیا تو سامری نے جو جادوگر تھا اس نے اُس بھٹی میں وہ خاک بھی ڈال دی جو اس نے جبرائیلؑ کے گھوڑے کے پاؤں سے اٹھائی تھی۔ بعض

مفسرینِ کرام نے لکھا ہے کہ سمندر سے پار اترنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کو طور پر لے جانے کے لیے جبرائیل امین گھوڑے پر سوار ہو کر آئے تو سامری نے دیکھا کہ جہاں زمین پر گھوڑے کا پاؤں لگتا ہے وہاں روئیدگی ہو جاتی ہے۔ اس نے سوچا کہ ضرور اس میں کوئی تاثیر ہو گی چنانچہ اس نے وہاں سے مٹی اٹھالی اور گلتے ہوئے سونے اور زیورات میں وہ مٹی بھی ڈال دی۔ جس سے اس بچھڑے میں سے کچھ آواز آنے لگی یعنی مٹی کی تاثیر سے وہ آواز نکالنے لگا۔ کچھ حضرات کی رائے میں جب فرعون نے لشکر کو سمندر میں اترنے کا حکم دیا تو خود وہ کنارے پر گھوڑے پر سوار کھڑا تھا۔ جبرائیل امین ایک گھوڑی پر سوار ہو کر آئے اور اس کے پاس سے گزرے تو فرعون کا گھوڑا بھی بے قابو ہو کر پیچھے چل پڑا۔ سامری نے اس وقت دیکھا کہ اس سوار کے گھوڑے کے پاؤں جہاں لگتے ہیں وہاں سبزہ اگ جاتا ہے، تو اس نے پاؤں کے نشان سے کچھ مٹی اٹھالی۔ لیکن پہلی روایت زیادہ قرینِ قیاس لگتی ہے کیونکہ جب فرعون سمندر میں داخل ہو رہا تھا اس وقت تک بنی اسرائیل سمندر کے درمیان تک پہنچ چکے تھے اور جب فرعون کا لشکر درمیان میں پہنچا تو سمندر آپس میں مل گیا۔ بنی اسرائیل تو پار اتر گئے تھے اور فرعون اپنے لشکر سمیت غرقاب ہو گیا تھا۔ بہر حال اس مٹی کی تاثیر سے بچھڑے کا قالب بن گیا جس میں سے آواز بھی نکلتی تھی۔ بعض مفسرینِ کرام نے یہ بھی لکھا ہے کہ سامری نے بچھڑا بنایا ہی ایسا تھا کہ اس میں سوراخ ایسے رکھے تھے جن سے ہوا گزرتی تھی تو آواز آتی تھی جبکہ بعض کی رائے میں اس خاک کی تاثیر سے ایک طرح کی حیات پیدا ہو گئی تھی کہ وہ آواز نکال سکتا تھا۔ صحیح یہی لگتا ہے کہ اس مٹی کی وجہ سے آواز نکلتی تھی کہ اگر سوراخ بنا کر ہی آواز نکالنا تھی تو پھر وہ مٹی اٹھا کر لانا اور سونے میں ڈالنا، اس سب سے کیا حاصل تھا؟

قوم تین گروہوں میں تقسیم ہو گئی:

مفسرینِ کرام فرماتے ہیں کہ جب سامری نے بنی اسرائیل کو گمراہ کر دیا تو ان کے تین گروہ بن گئے۔ کچھ لوگ ہارون علیہ السلام کے ساتھ تھے۔ ہارون علیہ السلام قوم کو منع کرتے رہے اور جو لوگ اُن کے ساتھ تھے وہ بھی دوسروں کو سمجھاتے رہے کہ غلط کر رہے ہو۔ یہ لوگ، گو تعداد میں کم تھے مگر اس بات پر جم گئے کہ وہ اللہ کے نبی کا حکم ہی مانیں گے اور برائی میں شامل نہیں ہوں گے۔

دوسرا گروہ اُن لوگوں کا تھا، جنہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ فی الحال قوم کے ساتھ شامل ہو جائیں لیکن صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واپس تشریف لانے تک۔ اگر انہوں نے آ کر کہا کہ یہ غلط ہے تو اصلاح کر لی جائے۔

ایک تیسرا گروہ جو بہت بڑا تھا وہ اس بات پر جم گیا کہ یہی ہمارا معبود ہے جبکہ موسیٰ (علیہ السلام) بھول گئے

ہیں اور نجانے کہاں چلے گئے ہیں خدا تو خود ہمارے پاس آ گیا ہے چنانچہ اس کی پوجا میں لگ گئے۔ یہ گروہ اس بات پر ڈٹ گیا کہ جب موسیٰ واپس آئیں گے تو انہیں بھی ایسا ہی کرنا پڑے گا جیسا ہم کر رہے ہیں۔

مجاہدہ ترقیٔ درجات کی بنیادی شرط:

موسیٰ علیہ السلام سے تیس دن کا وعدہ تھا، پھر اللہ کریم نے دس دن اور بڑھا دیے اور یوں موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر چلّہ لگایا۔ چالیس دن کے بعد اللہ نے انہیں کتاب عطا کر دی، اس کا مطلب ہے کہ ترقیٔ درجات یا حصولِ مراقبات کے لیے مجاہدہ شرط ہے۔ چلّے لگانا پڑتے ہیں، محنت کرنا پڑتی ہے اور اللہ کریم اس کو قبول فرما کر انعامات عطا کرتے ہیں۔ سو ترقیٔ درجات کے لیے مجاہدہ بنیادی شرط ہے اور مجاہدہ یہ ہے کہ شریعت پر پوری سختی سے عمل کیا جائے۔ فرائض و واجبات ادا کیے جائیں، نوافل پڑھے جائیں اور ذکر اللہ کیا جائے اور یہ سب پوری محنت سے کیا جائے۔

موسیٰ علیہ السلام کی واپسی:

فرمایا: فَرَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۔۔۔ موسیٰ علیہ السلام بہت غم اور غصے میں لوٹے۔ انہیں دکھ ہوا کہ یہ کیسی عجیب قوم ہے جسے فرعون کے مظالم اور غلامی سے اللہ نے نجات دی۔ فرعون ان پر کتنے مظالم ڈھاتا، ان کے بیٹے قتل کر دیتا اور بیٹیاں زندہ رہنے دیتا اور کتنی سزائیں دیتا تھا۔ اللہ نے ان کے لیے سمندر میں خشک راستے بنا دیے۔ یہ کیسی عجیب قوم ہے کہ اللہ نے انہیں وادیٔ سینا میں بلایا اور یہ راستے میں بیٹھ کر بت پوجنے میں مشغول ہو گئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو غصہ بھی بہت آیا اور دکھ بھی بہت ہوا۔ فرمایا: قَالَ يٰقَوْمِ اَلَمْ يَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۔۔۔ کیا تمہارے پروردگار نے تم سے خوبصورت وعدہ نہیں کیا تھا کہ تمہیں وادیٔ سینا میں اپنے حضورِ حق میں بلایا تھا؟ یہ کتنی بڑی سعادت تھی کہ تمہیں بارگاہِ حق میں حاضری کے لیے بلایا تا کہ تم پر مزید انعامات کی عطا ہو اور تم ایسے بدبخت ہو کہ راستے میں ہی بیٹھ گئے اور تمہیں اس دعوت کی عظمت کا خیال ہی نہیں آیا۔ اَفَطَالَ عَلَيْكُمُ الْعَهْدُ ۔۔۔ کیا اس بات کو بہت زمانے گزر گئے تھے کہ تم بھول گئے! ابھی کل ہی کی تو بات ہے اللہ تمہیں دعوت دے رہے ہیں۔ رب العالمین تمہیں اپنی بارگاہ میں بلا رہے تا کہ تم پر اپنی رحمتوں اور انوارات کی بارش کریں اور تم اتنی جلدی بھول گئے۔ کیا اس بات کو زمانے بیت گئے یا اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ يَّحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۔۔۔ تم نے یہ نیت کر لی تھی کہ تم اپنے پروردگار کے غضب کو دعوت دے رہے ہو تا کہ اللہ کا عذاب تم پر نازل ہو۔ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِيْ ﴿٨٦﴾ اور تم نے جو مجھ سے وعدہ کیا تھا اس کے خلاف عمل کیا۔ تم نے وعدہ کیا تھا کہ پیچھے

آؤ گے لیکن تم نے وعدہ خلافی کی اور وعدہ خلافی غضبِ الٰہی کو دعوت دینے والی بات ہے۔ جتنی وعدہ خلافی کوئی کر رہا ہے اتنا وہ غضبِ الٰہی کو دعوت دے رہا ہے۔

آج کے مسلمانوں کا حال:

اللہ کریم نے بنی اسرائیل کو وادیٔ سینا میں بلایا تھا، اپنی بارگاہ میں حاضری کی دعوت دی تا کہ ان پر مزید انعامات اور انوارات کی بارش ہو، یہ کتنی عظمت تھی!

یہاں سے پتا چلتا ہے کہ مسلمانوں پر جو نمازیں فرض کی گئی ہیں اس سے مراد ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر اُمتی کو، جو عاقل بالغ ہے، اسے اللہ کریم نے اپنی بارگاہ میں بلایا ہے۔ اُسے دعوت ہے کہ دن شروع کرنے سے پہلے میری بارگاہ میں آؤ، میری حمد وثنا کرو، اپنی عاجزی کا اعتراف بھی کرو، اپنا دکھ سکھ بیان کرو، مجھ سے مدد بھی مانگو اور انوارات و برکات سمیٹ کر دن کا آغاز کرو۔ اس ملاقات سے تمہارے دل میں ایک نور آ جائے گا اور تمہیں حلال وحرام کا احساس رہے گا۔ یہ نور تمہاری راہنمائی کرے گا۔ تمہیں برائی سے روکے گا اور اچھائی کی طرف لے کر جائے گا۔ دوپہر کو کام سے وقفہ لیتے ہو، کھانے کا وقفہ ہے، تو فرمایا پھر میری بارگاہ میں آ جاؤ، کھانا بھی کھاؤ، آرام بھی کرلو، تم جہاں بھی ہو گے تمہارے لیے زمین کا وہی ٹکڑا وادیٔ سینا ہے۔ اگر تم مسجد میں پہنچ سکتے ہو تو ٹھیک ہے، نہیں پہنچ سکتے تو ساری زمین مسجد ہے۔ جہاں ہو وہیں سربسجود ہو جاؤ۔ مجھ سے ملو، مجھے اپنی ضرورتیں بتاؤ، مجھ سے مانگو، میری حمد وثنا کرو، پھر کام پر چلے جاؤ۔ جب کام سے فارغ ہو تو پھر آ جانا، پھر باتیں کریں گے، تمہارے دل میں نور اور تجلیات آئیں گی اور تمہیں دنیا اور دنیا کے دھوکوں کا مقابلہ کرنے کی قوت ملے گی۔ ملاقات کر کے چلے جاؤ۔ جب سورج ڈوب جائے پھر آ جانا پھر باتیں کریں گے، حاضری لگوا کر چلے جانا۔ سونے سے پہلے پھر آ جانا، اپنے دکھ سکھ عرض کرنا اور عشاء ادا کر کے سو جانا۔ صبح بیدار ہو گے تو پھر حاضر ہو جانا۔

آج مسلمان بھی بنی اسرائیل جیسا رویہ اپنائے ہوئے ہیں، کہتے ہیں جی ہم نے نمازیں نہیں پڑھی جاتیں جو پڑھتے ہیں، پڑھتے رہیں، اللہ خود بخش دے گا، جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ جیسے بنی اسرائیل نے وعدہ خلافی کی اور وادیٔ سینا جانے کی بجائے راستے میں ہی پڑاؤ ڈال کر بیٹھ گئے ویسے ہی آج کا مسلمان وعدہ خلافی کر رہا ہے۔ جو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھتا ہے وہ اللہ سے وعدہ کرتا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو معبود نہیں مانے گا، اس کے علاوہ کسی کے

سامنے دستِ سوال دراز نہیں کرے گا اور وہی کرے گا جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ اس وعدے کے بعد فرائض ترک کر دینا، رشوت لینا، لوگوں کو لوٹنا، قتل کرنا، کیا یہ ساری وعدہ خلافیاں نہیں ہیں؟ آج لوگ زکوٰۃ ادا نہیں کرتے۔ کہتے ہیں ہم سے نہیں دی جاتی۔ بینک سے سود لیتے ہیں اور جواز دیتے ہیں کہ بینک والے ہمارا پیسہ استعمال کرتے ہیں تو ہم یہ کیوں نہ لیں۔ پھر اس کو سود نہیں، بلکہ منافع کہہ دیتے ہیں۔ بھلا کسی چیز کا نام بدلنے سے اس کی حقیقت بدل جائے گی؟ خنزیر کو دنبہ کہنے سے وہ دنبہ نہیں ہو جائے گا، خنزیر ہی رہے گا۔ سود منافع کہنے سے حلال نہیں ہو جاتا، حرام ہی رہتا ہے۔ حاصلِ کلام یہی ہے کہ وعدہ خلافی عذابِ الٰہی کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔

بنی اسرائیل کا عذر:

بنی اسرائیل کہنے لگے: قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَلٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿۸۷﴾ ہم نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔ ہمیں تو سامری نے گمراہ کر دیا، ہمیں تو سامری نے تباہ کر دیا۔ ہم جو سونا اور زیورات لیے پھرتے تھے، اُسے ہم نے آگ میں ڈالا تو سامری کے پاس کوئی خاک تھی جو اس نے بھی ڈال دی۔ جب سامری نے وہ مٹی ڈالی تو: فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ ۔۔۔ پگھلے ہوئے سونے سے ایک بچھڑے کی شکل کا ایک جانور سا بن گیا جو صرف آواز نکالتا تھا اس کے علاوہ اس میں کوئی زندگی کے آثار نہ تھے۔ وہ نہ دیکھتا سنتا تھا، نہ ہی چلتا پھرتا تھا، بس صرف ایک آواز اس سے نکلتی تھی۔ بنی اسرائیل کو یہ سمجھ لینا چاہیے تھا کہ سامری تو جادوگر تھا اور وہ اپنے کمالات دکھا کر خود کو بڑا بنانا چاہتا تھا اور لوگوں کو اپنے پیچھے لگانا چاہتا تھا شہرت کا طالب تھا۔ بہرحال انہوں نے سامری کی بات مانی۔ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوْسٰى ۔۔۔ جب انہوں نے اس بچھڑے کو دیکھا تو ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یہ تمہارا معبود ہے جو اس بچھڑے میں آ گیا ہے، اس سے آواز آ رہی ہے۔ تمہارا اللہ، تمہارا رب اس بچھڑے میں آ گیا ہے، موسیٰ کا بھی تو یہی الٰہ معبود ہے۔ فَنَسِيَ ﴿۸۸﴾ لیکن موسیٰ بھول گئے، موسیٰ علیہ السلام کو غلطی لگی ہے، وہ تو پہاڑوں میں بھٹکتے پھرتے ہیں جبکہ اللہ تو اس بچھڑے میں آ گیا ہے اور اندر سے آوازیں دے رہا ہے۔ یہی ہمارا پروردگار ہے اور موسیٰ علیہ السلام کا بھی یہی ہے، موسیٰ علیہ السلام بھول گئے ہیں انہیں سمجھ نہیں آئی۔

قرآنِ حکیم دعوتِ فکر دیتا ہے:

یاد رکھیں! قرآنِ کریم کا موضوع تاریخ بیان کرنا نہیں ہے بلکہ قرآن کریم یہ سب قصے سبق دینے کے

لیے بیان کرتا ہے۔ یہ دعوتِ فکر دیتا ہے کہ یہ دیکھو پہلی قوموں نے کیا کیا اور کیا انجام پایا تو تم ایسا نہ کرنا۔ بنی اسرائیل کی اس بات کو ہی لے لیں کہ کہہ رہے ہیں کہ ہم جو کہہ رہے ہیں، وہ صحیح ہے جبکہ موسیٰ علیہ السلام کو غلطی لگی ہے۔ آج بھی جتنے گمراہ لوگ ہیں، ان سے اگر پوچھیں تو وہ کہتے ہیں کہ علمائے حق کو غلطی لگی ہے انہیں بات سمجھ نہیں آئی۔ آج کے برائے نام دانشور، جو دنیوی اعتبار سے بڑے پڑھے لکھے ہیں ان میں اکثر ایسے ہیں جو کلمہ بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے۔ ان سے جب بات ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ مولوی کو غلطی لگی ہے خواہ مخواہ لوگوں کو گمراہ کر رہا ہے، ہم جو کہتے ہیں وہ صحیح ہے۔

اللہ کریم فرماتے ہیں کہ یہ کیسے جاہل اور بدگمان لوگ تھے، فرمایا: اَفَلَا یَرَوْنَ اَلَّا یَرْجِعُ اِلَیْهِمْ قَوْلًا۔۔۔ انہوں نے یہ تو دیکھا کہ اس میں سے ایک آواز آتی ہے۔ لیکن یہ نہ دیکھا کہ کیا وہ ان کی بات سنتا سمجھتا بھی ہے اور اس کا جواب دیتا ہے؟ اس میں سے آواز آتی بھی رہے لیکن اگر وہ بات نہ سن سکتا ہے نہ سمجھ سکتا ہے اور نہ کچھ بتا سکتا ہے تو اس سے کیا حاصل ہوگا؟ فرمایا: وَّلَا یَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ وہ ان کی کسی بات کا جواب نہیں دیتا؟ وہ اگر اسے توڑ دیں، جلا دیں، خاک کر دیں تو یہ جل جائے گا لیکن اپنا دفاع نہیں کر سکے گا تو پھر لوگوں کا نفع نقصان کیا کرے گا؟ یہ اس کی پوجا کس لیے کر رہے ہیں؟

بنی اسرائیل کو کم از کم یہ تو سوچنا چاہیے تھا کہ مخلوق کو جو خود عاجز ہے، خود محتاج ہے، اپنے وجود کو بھی باقی رکھنے میں محتاج ہے، اُسے کیوں معبود مانیں؟ اس ہستی کو کیوں نہ مانیں، جس نے عدم سے وجود بخشا اور ہر لمحے ہماری ہر ضرورت پوری کر رہا ہے۔

سورۃ طٰہٰ رکوع 5 آیات 90 تا 104

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ
الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْۤا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾ قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى
يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْۤا ﴿۹۲﴾ اَلَّا
تَتَّبِعَنِ ؕ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ﴿۹۳﴾ قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ ۚ
اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ﴿۹۴﴾ قَالَ
فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿۹۵﴾ قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً
مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ ﴿۹۶﴾ قَالَ فَاذْهَبْ
فَاِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ ۪ وَاِنَّ لَكَ مَوْعِدًا لَّنْ تُخْلَفَهٗ ۚ
وَانْظُرْ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِيْ ظَلْتَ عَلَيْهِ عَاكِفًا ؕ لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنْسِفَنَّهٗ فِي
الْيَمِّ نَسْفًا ﴿۹۷﴾ اِنَّمَاۤ اِلٰهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ
عِلْمًا ﴿۹۸﴾ كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ ۚ وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ
لَّدُنَّا ذِكْرًا ۖۚ ﴿۹۹﴾ مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ۙ ﴿۱۰۰﴾ خٰلِدِيْنَ
فِيْهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ۙ ﴿۱۰۱﴾ يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ
الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ۖۚ ﴿۱۰۲﴾ يَّتَخَافَتُوْنَ بَيْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾
نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَقُوْلُوْنَ اِذْ يَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِيْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا يَوْمًا ﴿۱۰۴﴾

اور یقیناً ان لوگوں سے ہارون (علیہ السلام) نے (موسیٰ علیہ السلام کے لوٹنے سے)

پہلے بھی فرمایا تھا کہ اے میری قوم! بے شک اس سے تمہیں صرف آزمایا گیا ہے اور
بے شک تمہارا (حقیقی) پروردگار رحمٰن (بڑے رحم والا) ہے۔ سو میری پیروی کرو اور
میری بات مانو ﴿۹۰﴾ وہ کہنے لگے جب تک موسیٰ (علیہ السلام) ہمارے پاس
واپس نہ آ جائیں ہم اسی (کی عبادت) پر برابر جمے رہیں گے ﴿۹۱﴾ (پھر موسیٰ ؑ
نے واپسی پر ہارونؑ سے) فرمایا اے ہارون! جب آپ نے انہیں گمراہ ہوتے
ہوئے دیکھا تو آپ کو کس چیز نے روکا تھا ﴿۹۲﴾ کہ آپ میرے پیچھے نہ چلے آئے
بھلا آپ نے میرے حکم کے خلاف (کیوں) کیا؟ ﴿۹۳﴾ وہ فرمانے لگے اے
میرے بھائی! میری داڑھی اور میرے سر (کے بالوں) کو مت پکڑیئے یقیناً میں تو
اس بات سے ڈرا کہ آپ کہیں گے کہ تم نے بنی اسرائیل میں تفرقہ ڈال دیا اور تم نے
میری بات کا پاس نہ کیا ﴿۹۴﴾ (سامری سے) فرمانے لگے اے سامری! پس تیرا
کیا معاملہ ہے؟ ﴿۹۵﴾ اس نے کہا مجھے ایسی چیز نظر آئی جو دوسروں نے نہیں دیکھی تو
میں نے اللہ کے بھیجے ہوئے (فرشتے) کے نقش پا سے ایک مٹھی (بھر) مٹی اٹھا لی
پھر اس کو اس (بچھڑے کے قالب) میں ڈال دیا اور میرے جی کو یہی بات اچھی
لگی ﴿۹۶﴾ فرمایا تو جا پس تجھ کو (دنیا کی) زندگی میں یہ سزا ہے کہ کہتا پھرے کہ
(مجھے) کوئی ہاتھ نہ لگانا اور یقیناً (اس کے علاوہ) تیرے لیے (عذاب کا) ایک
(اور) وعدہ ہے جو تجھ سے ہرگز ٹل نہ سکے گا اور جس (معبود کی پوجا) پر تو قائم
(معتکف) تھا اپنے اس معبود کی طرف دیکھ ہم اس کو ضرور جلا دیں گے پھر اس (کی
راکھ) کو اڑا کر دریا میں بکھیر دیں گے ﴿۹۷﴾ بے شک تمہارا (حقیقی) معبود تو اللہ
ہے جس کے سوا کوئی عبادت کا مستحق نہیں اور اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے ﴿۹۸﴾ اس
طرح ہم آپ سے وہ حالات بیان فرماتے ہیں جو پہلے گزر چکے ہیں اور یقیناً ہم نے
آپ کو اپنی طرف سے ایک نصیحت نامہ (قرآن) عطا فرمایا ہے ﴿۹۹﴾ جو شخص
اس سے منہ پھیرے گا تو یقیناً وہ قیامت کے روز (گناہ کا) بوجھ اٹھائے گا ﴿۱۰۰﴾

(ایسے لوگ) ہمیشہ اس (عذاب) میں مبتلا رہیں گے اور یہ بوجھ قیامت کے روز ان کے لیے بُرا ہوگا ﴿۱۰۱﴾ جس روز صور پھونکا جائے گا اور ہم گناہگاروں کو اکٹھا کر دیں گے، اس دن (ان کی) نیلی آنکھیں (ہوں گی) ﴿۱۰۲﴾ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوں گے کہ تم (دنیا میں) صرف دس دن ہی رہے ہو ﴿۱۰۳﴾ جو باتیں یہ کریں گے، ہم خوب جانتے ہیں جب ان میں سے سب سے اچھی راہ والا (عقلمند) کہے گا (نہیں بلکہ) تم صرف دن بھر ٹھہرے ہو ﴿۱۰۴﴾

تفسیر ومعارف

حضرت ہارون علیہ السلام کی تبلیغ:

فرمایا: وَلَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی واپسی سے پہلے حضرت ہارون علیہ السلام نے بھی قوم کو بہت سمجھایا تھا کہ اے قوم یہ تم پر آزمائش آگئی ہے۔ تم نے زیورات جلانے کے لیے ڈالے تھے اور سامری نے، اپنی شہرت اور باکمال کہلانے کے لیے اور تم لوگوں سے موسیٰ علیہ السلام کی بجائے اپنی پیروی کروانے کے شوق میں ایسا کیا اور یہ بچھڑا بن گیا جس سے ایک آواز بھی نکلتی ہے۔ اے قوم! یہ تم پر آزمائش آگئی ہے تو تم وَاِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ ۔۔۔ یاد رکھو کہ تمہارا پروردگار اللہ ہی ہے جو بہت بڑا مہربان ہے جو گناہوں اور غلطیوں کے باوجود تمہیں رزق دے رہا ہے، جس نے تمہیں زندگی دے رکھی ہے، انسانی وجود اور روح دے رکھا ہے اور تمام انسانی کمالات عطا کیے ہیں۔ تمہارا رب، تمہارا پروردگار وہی ہے۔ اے میری قوم! فَاتَّبِعُوْنِيْ وَاَطِيْعُوْٓا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾ میری بات سنو، میری بات مانو اور میری پیروی کرو۔

جب قوم گمراہ ہوئی تو حضرت ہارون علیہ السلام نے تبلیغ کا حق ادا کیا اور اپنی پوری کوشش کی کہ وہ ہدایت پر آ جائے۔ انہوں نے بہت سمجھایا کہ یہ آزمائش ہے اور تم اس میں ناکام ہو رہے ہو۔ اس بچھڑے کو رب مان رہے ہو جس کو تم نے خود زیورات سے بنایا ہے۔ بھلا سوچو وہ تمہاری ضرورتیں کیسے پوری کرے گا۔ تمہارا پروردگار وہی ہے جو بہت بڑا مہربان ہے جو غلطیوں کوتاہیوں اور گستاخیوں کے باوجود تمہیں نعمتیں پہنچا رہا ہے اور تمہیں ایک وقت تک مہلت دے رکھی ہے۔ تمہارے پاس ابھی فرصت ہے لہٰذا میری بات مانو، میری پیروی کرو، توبہ کرو اور حق کو قبول کرو۔

اہلِ حق کی ذمہ داری:

یہاں یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جب قوم یا لوگ، قبیلہ یا دوست غلطی کی طرف جائیں تو جو حق پر ہے اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ انہیں احسن طریقے سے حق کا پیغام دیں۔ یہ پیغام خوبصورت انداز میں دیا جائے، لڑائی جھگڑے سے نہیں، اور یہ واضح کر دیا جائے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ اس کے بعد یہ اُن کی ذمہ داری ہے کہ وہ کیا عمل کرتے ہیں۔

حضرت ہارون علیہ السلام کی تلقین اور نصیحت کے جواب میں ایک گروہ کہنے لگا: قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ۞ کہ موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک تو ہم اسی کی پوجا کریں گے۔ یہ بات پہلے بھی گزر چکی ہے کہ قوم تین حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ایک گروہ ان خوش نصیب لوگوں کا تھا جو ہارون علیہ السلام کے ساتھ حق پر قائم رہے لیکن اُن کی تعداد بہت کم تھی۔ ایک گروہ کہنے لگا کہ موسیٰ علیہ السلام کے آنے تک تو اسی بچھڑے کی پوجا کریں گے البتہ اگر موسیٰ علیہ السلام نے آ کر منع کیا اور اسے غلط کہا تو چھوڑ دیں گے۔ تیسرے گروہ نے کہا کہ اس کی پوجا ہی حق ہے اور موسیٰ علیہ السلام آئے تو ہم ان سے بھی کہیں گے کہ اس کی پوجا کریں۔ ہم اس کی پوجا پر قائم رہیں گے اور موسیٰ علیہ السلام کو بھی اسی کی پوجا کرنی چاہیے کیونکہ خدا اس میں آ گیا ہے۔

اجتہاد:

جب موسیٰ علیہ السلام واپس پہنچے تو قوم کا حال دیکھ کر بہت ناراض ہوئے، ہارون علیہ السلام کے سر کے بال پکڑ لیے، انہیں داڑھی سے پکڑ لیا اور خوب جھنجھوڑا اور فرمایا: قَالَ يٰهٰرُوْنُ مَا مَنَعَكَ اِذْ رَاَيْتَهُمْ ضَلُّوْٓا ۞ آپ کیا کر رہے تھے؟ میں آپ کو اپنی جگہ نائب بنا کر، خلیفہ اور امیر بنا کر چھوڑ کر گیا تھا، تو جب آپ نے دیکھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو آپ نے ان کو روکا کیوں نہیں؟ کس چیز سے آپ گھبرا گئے اور آپ نے ان کو منع نہیں کیا؟ کیا آپ نے اَلَّا تَتَّبِعَنِ۔۔۔ بھی میرے حکم کی خلاف ورزی کی، جو میں کہہ گیا تھا نہیں کیا؟ اَفَعَصَيْتَ اَمْرِيْ ۞ کیا آپ نے بھی میری نافرمانی کی؟ حضرت ہارون علیہ السلام نے عرض کی: قَالَ يَبْنَؤُمَّ لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِيْ وَلَا بِرَاْسِيْ۔۔۔ اے میرے ماں جائے! مجھے داڑھی اور سر کے بالوں سے نہ پکڑیں۔ بات یہ تھی: اِنِّيْ خَشِيْتُ اَنْ تَقُوْلَ فَرَّقْتَ بَيْنَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَلَمْ تَرْقُبْ قَوْلِيْ ۞ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی، منع بھی کیا مگر یہ گروہوں میں بٹ گئے۔ جو حق پر قائم رہے، وہ میرے ساتھ تھے لیکن وہ بہت ہی کم تھے۔ میں نے انہیں اس لیے برداشت کر لیا کہ مجھے آپؑ کا انتظار تھا کہ آپؑ آ جائیں تو شاید یہ بھی واپس آ جائیں۔ اگر میں ان کو زبردستی روکنے کی

کوشش کرتا، جہاد کرتا۔ لڑائی کرتا، خواہ ہم مارے جاتے یا یہ مارے جاتے تو بات ایک انتہا پر چلی جاتی پھر یہ واپس حق پر نہ آتے ان کا واپس آنا ممکن نہ رہتا۔ مجھے یہ ڈر تھا کہ آپؑ واپس آ کر یہ نہ کہیں کہ آپؑ نے میرا انتظار نہیں کیا اور میرے آنے سے پہلے قوم میں تفریق ڈال دی، ان میں گروہ بنا دیے جن میں لڑائی ہوگئی۔

مفسرینِ کرام لکھتے ہیں کہ یہ اجتہاد ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کا اجتہاد یہ تھا کہ جب قوم نے اللہ کی نافرمانی کی، بت پرستی اختیار کی تو ہارون علیہ السلام انہیں تبلیغ کرتے اور وہ نہیں مانتے تو اُن سے جہاد کرتے اور اُن کی گردنیں اڑا دیتے۔ یہ اجتہادی رائے تھی موسیٰ علیہ السلام کی اور صحیح تھی۔ دوسرا اجتہاد اسی مسئلے پر ہارون علیہ السلام کا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے تو یہ لوگ مان نہیں رہے لیکن ممکن ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے واپس آنے پر اُن کی بات یہ لوگ مان جائیں۔ اگر ہم لڑ پڑے تو پھر واپسی کا راستہ تو بند ہو جائے گا اور دو فریق بن جائیں گے اور سب اپنے اپنے موقف پر ڈٹ جائیں گے۔ یہ تھا ہارون علیہ السلام کا اجتہاد اور انہوں نے اپنے اجتہاد پر عمل کیا۔ دونوں کی رائے ٹھیک تھی۔

اور یہی اختلاف مجتہدین میں ہوتا ہے کہ بات درست ہوتی ہے اور مقصد لوگوں کی بھلائی، ہدایت اور راہنمائی ہوتا ہے۔ دونوں راستے صحیح ہوتے ہیں ایک مجتہد ایک راستہ اختیار کر لیتا ہے اور دوسرا مجتہد دوسرا راستہ اختیار کر لیتا ہے۔ اجتہاد یہ نہیں ہے جس طرح آج کل کے یہ دنیادار کر رہے ہیں۔ دین میں تبدیلیاں شروع کرنا چاہتے ہیں۔ اجتہاد کے لیے شرط ہے کہ مجتہد کو قرآن اور قرآنی علوم تفاسیر و تراجم، حدیث شریف عربی زبان اور فقہی احکام پر مکمل عبور حاصل ہو اور وہ اُن احکام کے مقصد اور نتائج سے آگاہ ہو اور کس طرح سے روایات کی اسناد کو تواتر سے ثابت کر سکتا ہو۔ علوم دینیہ کو گہرائی سے جانتا ہو تب اجتہاد کر سکتا ہے۔ جزوی علوم رکھنے والا اجتہاد نہیں کر سکتا۔

اب موسیٰ علیہ السلام کا اپنا اجتہاد تھا اور ہارون علیہ السلام کا اپنا تھا لیکن اللہ کریم نے دونوں کو قبول فرمایا اور کسی کی تردید نہیں کی۔

سامری نفس کا غلام تھا:

موسیٰ علیہ السلام سامری کی طرف متوجہ ہوئے فرمایا: قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يٰسَامِرِيُّ ﴿٩٥﴾ سامری تجھے کیا ہو گیا، تیرا کیا معاملہ ہے؟ تو نے یہ گوسالہ کیوں بنایا اور لوگوں کو اس کی پرستش پر لگا دیا؟ سامری نے کہا: قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا۔۔۔ میں نے ایک ایسی چیز دیکھی جو لوگوں کو نظر نہیں آئی کہ جب آپ کے پاس وہ سوار آیا تو اس کے گھوڑے کے پاؤں جہاں لگتے تھے وہاں زندگی کے آثار پیدا ہو جاتے تھے، وہاں ریت میں بھی روئیدگی پیدا ہو جاتی تھی۔ یہ بات کسی نے محسوس نہیں کی لیکن

میں نے دیکھا اور میں نے آنے والے کی سواری کے نقشِ پا سے ایک مٹھی مٹی کی اٹھالی تھی۔ جب لوگوں نے سونا چاندی گلانے کے لیے آگ میں ڈالا تو میں نے وہ مٹی اس میں ڈال دی۔ یہ کام میں نے اس لیے کیا: وَ كَذٰلِكَ سَوَّلَتۡ لِيۡ نَفۡسِيۡ ۝۹۶ کہ میرے نفس نے مجھے یہ ترغیب دی تھی کہ ایسا کرو، ایسا کرنے سے لوگ موسیٰ علیہ السلام کی بجائے تمہارے پیچھے لگ جائیں گے اور تم بڑے بزرگ مانے جاؤ گے، تمہاری بڑی شہرت ہو جائے گی اور لوگ تمہارے سامنے عقیدت مندی کا اظہار کریں گے۔ لہٰذا میں نے اپنے نفس کی بات مان لی اور وہ مٹی ڈال دی۔ سامری شہرت اور دنیوی اقتدار کا بھوکا تھا اور لوگوں کو اپنے سامنے سربسجود کرانا چاہتا تھا تو اللہ کریم نے اس کی سزا بھی اسے اس کے مطابق دی۔

سامری کی سزا:

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اللہ تمہیں سزا بھی ایسی ہی دے گا: قَالَ فَاذۡهَبۡ فَاِنَّ لَكَ فِي الۡحَيٰوةِ اَنۡ تَقُوۡلَ لَا مِسَاسَ۔۔۔ تم نے جو ظلم کیا ہے، اس کی سزا دنیا میں یہ ہے کہ تم بندوں سے چھپتے پھرو گے اور جب بھی کوئی بندہ نظر آئے گا تو تم چیخ اٹھو گے کہ میرے قریب نہ آنا، مجھے مت چھونا۔ اللہ کے حکم سے اس میں یہ تاثیر پیدا ہو گئی کہ اگر کوئی سامری کو چھولیتا تو سامری کو اور اسے چھونے والے دونوں کو تیز بخار ہو جاتا اور بخار کی شدت سے سے بے ہوش ہو جاتے۔ سامری نے تو کوشش کی تھی کہ لوگ اس کے پیروکار بن جائیں، اس کے گرد جمع ہو جائیں۔ لیکن اللہ کریم نے اسے یہ سزا دی کہ اسے جب بھی کوئی نظر آتا تو وہ چیختا ہوا دور بھاگتا کہ مجھے ہاتھ نہ لگانا، میرے قریب نہ آنا۔ یہ تو صرف دنیوی سزا ہے۔ فرمایا: وَاِنَّ لَكَ مَوۡعِدًا لَّنۡ تُخۡلَفَهٗ۔۔۔ اور تیرے لیے ایک وعدہ ہے جو تجھ سے ٹل نہ سکے گا یعنی موت آئے گی، پھر اس کے بعد جادو اور کفر پر اخروی سزائیں تیری منتظر ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ دنیا کی سزا پر ہی قصہ تمام ہو جائے گا، حساب برابر ہو جائے گا بلکہ آخرت کی سزاؤں کا وعدہ اپنی جگہ ہے۔ جب موت آئے گی تو کفر اور اللہ اور اللہ کے نبیؐ کی نافرمانی کی جو سزائیں مقرر ہیں، وہ بھگتنا پڑیں گی، وہ وعدہ ٹلے گا نہیں، پورا ہوگا۔ یہ معبود، جو تو نے بنایا ہے، اپنے اس معبود کی طرف دیکھ۔ وَانۡظُرۡ اِلٰۤى اِلٰهِكَ الَّذِيۡ ظَلۡتَ عَلَيۡهِ عَاكِفًا۔۔۔ جس کو تو سجدے کرتا تھا اور جس کے سامنے معتکف تھا: لَنُحَرِّقَنَّهٗ ثُمَّ لَنَنۡسِفَنَّهٗ فِي الۡيَمِّ نَسۡفًا ۝۹۷ ہم اس کو جلا کر راکھ کر دیں گے اور اس کی خاک کو دریا میں بہا کر ضائع کر دیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا اے سامری! تو دیکھتا رہ، تیرے سامنے اس بت کو، جسے تو معبود سمجھتا ہے، ہم جلا کر راکھ کر دیں گے اور اس راکھ کو ہم دریا کی موجوں کے سپرد کر دیں گے، تاکہ اس کا نام و نشان تک مٹ جائے۔

موسیٰ علیہ السلام کا ایک اور معجزہ:

یہ بھی موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا کہ سونے اور چاندی سے بنا بچھڑا پلک جھپکتے میں راکھ ہو گیا ورنہ سونا اور چاندی ایسی دھاتیں ہیں جو آگ میں جل کر بھی ختم نہیں ہوتیں۔ انہیں آگ میں جلایا جائے تو دھات بن جاتی ہیں۔ طبیب جو سونے کا اور چاندی کا کشتہ کرتے ہیں تو وہ راکھ بنتی ہے لیکن وہ کشتہ بھی پھر دوبارہ سونا یا چاندی بن سکتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ سامری کا بنایا ہوا بچھڑا تو سونے اور چاندی سے بنا تھا لیکن موسیٰ علیہ السلام نے اُسے پلک جھپکتے میں راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تھا ورنہ سونا چاندی راکھ نہیں ہوتی۔

اللہ کریم کا کوئی ثانی نہیں:

موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: اِنَّمَآ اِلٰـهُكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ۔۔۔ یقیناً تمہارا معبود اللہ ہے۔ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ اللہ ہی وہ ہستی ہے جو واحد و لاشریک ہے، جس کے سوا کسی دوسرے کی عبادت کے استحقاق کا تصور بھی نہیں ہے۔ اللہ کی شان یہ ہے: وَسِعَ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿۹۸﴾ اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ ہر شے کو وہ اپنے ذاتی علم سے ہر وقت جانتا ہے۔ اس کی ذات لازوال ہے، ازلی ہے، ابدی ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے اور ہر شے کو، ہر فرد کو اس کی ضروریات و حاجات کو، اس کے دکھ اور تکلیف کو خود اس سے زیادہ جانتا ہے۔ کوئی ضرورت مند اپنی ضروریات سے اتنا باخبر نہیں جتنا اللہ اس کی ضرورتیں جانتا ہے اس لیے کہ وہ اس کا پروردگار ہے، ربّ ہے اور سب کی ضرورتیں پوری فرما رہا ہے۔ کوئی اس کا ثانی نہ ہے اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ وہ واحد ہے لاشریک ہے اس کی ذات اور صفات میں کوئی شریک نہیں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوت اور صداقت کی دلیل:

حضرت موسیٰ علیہ السلام، اُن کی قوم فرعون کے اور سامری کے سارے قصے کو بیان کرنے کے بعد ارشاد فرمایا: كَذٰلِكَ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ مَا قَدْ سَبَقَ۔۔۔ اس طرح یہ گزشتہ واقعات جو پہلی قوموں پر بیت چکے، ہم آپ کو بتاتے ہیں۔ اللہ کریم ہی وہ ذات ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو یہ باتیں تعلیم فرماتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے دنیا کے کسی انسان، کسی مدرسے، کسی ادارے سے کچھ نہیں سیکھا۔ انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام دنیوی اساتذہ کے محتاج نہیں ہوتے۔ دنیوی کتب کے محتاج نہیں ہوتے کہ انہیں علوم کے خزانے منجانب اللہ عطا ہوتے ہیں۔ فرمایا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوت اور صداقت کی دلیل ہے کہ یہ باتیں جو پڑھتے پڑھاتے تھے،

اُن کے پاس بھی صحیح نہیں تھیں۔ جو کتابیں لکھی گئیں اُن میں بھی اِن واقعات کو ملا جلا کر بہت سی کہانیاں بنا دی گئیں۔ بہت سے قصّے گھڑ لیے گئے جس میں حقیقت گم ہو گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے جو ارشاد فرمایا ہے یہ سارا حق ہے اور جیسے واقعات ہوئے بعینہٖ ویسے ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمائے اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو اللہ کریم نے خود تعلیم فرمائے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی صداقت اور نبوت کی دلیل بھی ہیں۔

فرمایا: وَقَدْ اٰتَيْنٰكَ مِنْ لَّدُنَّا ذِكْرًا ﴿۹۹﴾ ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کو اپنی طرف سے ایک مکمل نصیحت نامہ یعنی قرآنِ کریم عطا فرمایا ہے۔ قرآنِ حکیم اوّل تا آخر اللہ کریم کی طرف سے نازل کیا گیا اور اللہ کے بندوں کے لیے یہ ایک نصیحت نامہ ہے۔ چنانچہ لوگوں کو چاہیے کہ اس سے نصیحت حاصل کریں، اس پر ایمان لائیں اور اسے سمجھ کر اس پر عمل کریں۔

قرآنِ کریم سے اعراض کی صورتیں:

قرآنِ کریم کی شان تو یہ ہے: مَنْ اَعْرَضَ عَنْهُ فَاِنَّهٗ يَحْمِلُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وِزْرًا ﴿۱۰۰﴾ جن لوگوں نے قرآن کریم کی طرف سے منہ پھیر لیا یعنی اس کے احکامات اور نصیحت کی پروا نہ کی تو یہ عدم توجہی یعنی اعراض کا بوجھ انہیں قیامت کے دن اٹھانا پڑے گا جو ایک بہت بڑا بوجھ ہوگا۔ علمائے حق قرآنِ کریم سے اعراض کی دو صورتیں نقل فرماتے ہیں۔ پہلی صورت تو یہ ہے کہ کوئی قرآن کریم پر ایمان ہی نہ لائے۔ اُس نے اپنے ساتھ بہت بڑا ظلم کیا بہت زیادتی ہے کہ وہ کفر میں مبتلا ہوا، شرک میں مبتلا ہوا اور تباہ ہو گیا۔ دوسری صورت اعراض کی یہ ہے کہ کوئی مسلمان ساری زندگی اللہ کی کتاب کی پروا ہی نہ کرے۔ یہ جاننے کی کوشش ہی نہ کرے کہ اس میں کیا ہے؟ ہم الحمدللہ مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے اور ہمیں وراثتاً کلمہ نصیب ہوا۔ اب اگر زندگی بھر کوئی یہ پرواہی نہ کرے کہ میں اس کتاب کو پڑھوں تو سہی، سمجھوں تو سہی کہ اس کا مفہوم کیا ہے، تو یہ اعراض ہے۔ بے شمار مسلمان عمریں بسر کر جاتے ہیں لیکن زندگی بھر کبھی قرآن کو کھولتے ہی نہیں۔ جبکہ بعض پڑھ تو لیتے ہیں جو بچپن میں ماں یا دادی یا کسی پڑھانے والی نے پڑھا دیا تھا اس کے بعد زندگی بھر اپنی اصلاح کی فکر ہی نہیں کرتے کہ تلفظ کی غلطیاں یا قرأت کی کوئی غلطی ہو تو اُسے ٹھیک کر لیا جائے۔ بعض لوگ عمر بھر قرآن کریم کا ترجمہ جاننے یا سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ یہ قرآنِ کریم سے اعراض برتنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ پہلی شدید تر ہے یعنی کفر ہے اور دوسری اس سے ہلکی ہے جو مسلمانوں سے سرزد ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم تو انسانیت کے ہر فرد کو خطاب فرماتا ہے۔ حتیٰ کہ کفار سے بھی بات کرتا ہے يٰۤاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۔۔۔ کہہ کر دعوت دیتا ہے کہ بات تو سنو! کوئی دلیل لاؤ اپنے کفر پر، تمہارے پاس اللہ کے شریک بنانے

کی کیا دلیل ہے؟ تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے تو قرآن کے دلائل پر غور کرو اور قائل ہو جاؤ۔ قرآن تو کافروں سے بھی مخاطب ہے کہ اگر وہ سمجھیں تو انہیں ایمان نصیب ہو جائے اور مسلمانوں سے تو نہایت محبت اور شفقت سے بات کرتا ہے۔ لیکن یہ کتنی بدنصیبی ہے کہ زندگی بھر تلاوت کو شعار نہ بنایا جائے یا پھر معنی پر غور نہ کیا جائے۔ اس لیے فرمایا کہ قرآن کریم سے عدم توجہی ایک بہت بڑا بوجھ ہوگا جو اعراض کرنے والوں کو میدان حشر میں اٹھانا ہوگا۔ خٰلِدِيْنَ فِيْهِ ؕ وَسَآءَ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حِمْلًا ﴿۱۰۱﴾ ایسا کرنے والے پر یہ بوجھ ہمیشہ لدا رہے گا کہ قرآن پر توجہ نہ کر کے اس نے اپنے حق میں اچھا نہیں کیا۔ جو کفر و شرک پر مرا اس کا بوجھ تو ویسے ہی رہے گا البتہ جسے ایمان نصیب ہو گیا لیکن اس نے قرآن کریم پر توجہ نہیں کی تو اس نے اپنے حق میں ظلم کیا۔ اللہ اُسے معاف فرما دیں تو وہ کریم ہیں لیکن قرآن کریم سے اعراض کرنا ایک بہت بڑا بوجھ ہے جو حشر میں اٹھانا ہوگا۔ یہ بوجھ بہت برا اور تکلیف دہ بوجھ ہوگا۔ دنیا میں اگر یہ طرزِ عمل ہو کہ حکمران کوئی حکم جاری کرے اور بندہ اُس کو نہ پڑھے نہ جاننے کی کوشش کرے اور پھر جب حکمران کے سامنے ایسے بندے کی پیشی ہو اور حکمران کو بتایا جائے کہ اس بندے نے عمل تو کیا کرنا تھا، آپ کے حکم کو اتنی اہمیت بھی نہیں دی کہ اُسے پڑھ ہی لیتا کہ آپ نے کیا کہا تھا، تو پھر کیا صورت حال ہوگی؟

اللہ کریم ہمیں معاف فرمائے ہم نے مذہب مولوی کے ذمے ڈال دیا ہے کہ مولوی جانے اور مذہب جانے۔ حلال وحرام، جائز ناجائز بھی وہی سمجھے۔ بس ہمارے لیے اتنا کافی ہے کہ پیدا ہوں تو اذان کہہ دے، مر جائیں تو جنازہ پڑھ دے۔ اتنا اسلام ہم کافی سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ توحید، رسالت، عقائد، آخرت اور قرآن کی تفسیر جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی جسے حدیث شریف کہتے ہیں، اس کے بارے میں ہم جاننے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔

آخرت کا مدار دنیا کی زندگی پر ہے:

قرآن نے آخرت کا مدار دنیا کی زندگی پر رکھ دیا ہے۔ جو عقیدہ اور عمل دنیا میں اختیار کیا جائے گا اسی پر آخرت کی تعمیر ہوگی۔ آخرت کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی ہے جبکہ دنیا میں قیام بہت مختصر ہے تو اس تھوڑے سے وقت میں ابدی زندگی کو سنوار لینا کتنی آسان سی بات ہے۔

فرمایا: يَّوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ وَنَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ زُرْقًا ﴿۱۰۲﴾ جب صور پھونکا جائے گا اور حکم ہوگا کہ اے گلے سڑے چیڑو! اے ریزہ ریزہ ہڈیو! اے بوسیدہ جسمو! تمہیں تمہارے اللہ نے حکم دیا ہے دوبارہ کھڑے ہو جاؤ، زندہ ہو جاؤ تو سب دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ موت آئی تو ہماری ہڈیاں خاک ہو جائیں گی، وجود بکھر جائیں گے اور بات ختم ہو

جائے گی۔ ایسا نہیں ہے بلکہ جب صور پھونکا جائے گا، سب دوبارہ اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس دن گناہگاروں کو اس حال میں کھڑا کیا جائے گا کہ اُن کی آنکھیں کرنجی ہوں گی، ڈراونی ہوجائیں گی، رنگ بھی خوفناک ہوجائے گا اور صورت بھی ہیبت ناک ہوگی۔

دنیا کی زندگی آخرت کے مقابلے میں کتنی مختصر ہے:

فرمایا: یَّتَخَافَتُوْنَ بَیْنَهُمْ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا عَشْرًا ﴿۱۰۳﴾ یہ لوگ اس وقت آپس میں سرگوشیاں کر رہے ہوں گے، اندازے لگا رہے ہوں گے کہ ہم زیادہ سے زیادہ دنیا اور برزخ مِلا کر آٹھ یا دس دن رہے ہوں گے اور یہ قیامت قائم ہوگئی۔ یعنی ہم دنیا میں بہت تھوڑا عرصہ رہے اور برزخ میں بھی بہت ہی تھوڑا عرصہ رہے۔ زیادہ سے زیادہ دس دن ہی گزرے ہوں گے اور قیامت قائم ہوگئی ہے۔

اللہ کریم فرماتے ہیں: نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ اِذْ یَقُوْلُ اَمْثَلُهُمْ طَرِیْقَةً اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا یَوْمًا ﴿۱۰۴﴾ ہمیں خوب علم ہے جو کچھ یہ لوگ کہتے تھے اور دنیا میں جو کچھ یہ کرتے تھے۔ یہ لوگ جو لمبی امیدیں باندھتے تھے اور اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے کیا کیا حیلے کرتے تھے۔ یہ لوگ مخلوقِ خدا پر کیسے کیسے مظالم ڈھاتے تھے اور اپنی دولت کو بچانے اور چھپانے کے لیے کیا کیا حیلے کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ انہیں ہمیشہ دنیا میں ہی رہنا ہے۔ دنیا میں ایسی عمارتیں اور محلات بناتے تھے گویا انہیں چھوڑ کر جانا ہی نہیں۔ اور اب میدانِ حشر میں کہہ رہے ہیں کہ یہ ساری مدت تو ہفتہ دس دن ہی تھی اور اب تو قیامت سامنے آگئی ہے۔ یہ تو بڑا ظلم ہوگیا کہ ہم نے سب کچھ ضائع کردیا۔ بلکہ ان میں جو ذرا سمجھدار لوگ ہوں گے وہ کہیں گے کہ دس دن کہاں یہ تو ایک دن کے برابر بھی نہیں بنتا۔ یہ تو ایک پہر ہی تھا جو گزر گیا اور جسے ہم نے ضائع کردیا کیونکہ قیامت کا دن پچاس ہزار سال کے برابر ہے، اس کے مقابلے میں تو شاید دنیا کی زندگی تھوڑی پڑ جائے۔ پھر وہ دن اللہ کے ہوں گے۔ جیسا کہ ارشاد ہے کہ تمہارا ہزار سال بیت جاتا ہے جبکہ عنداللہ ایک دن گزرتا ہے لہٰذا اگر اُن دنوں کے حساب سے قیامت کا دن پچاس ہزار سال کا ہوا تو پھر تو دنیا کی ساری عمر بھی تھوڑی سی نظر آئے گی چہ جائیکہ انسان اپنی عمر کا حساب کرے۔

سورۃ طٰہٰ رکوع 6 آیات 105 تا 115

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ فَيَذَرُهَا قَاعًا
صَفْصَفًا ﴿۱۰۶﴾ لَّا تَرٰى فِيْهَا عِوَجًا وَّلَاۤ اَمْتًا ﴿۱۰۷﴾ يَوْمَئِذٍ يَّتَّبِعُوْنَ الدَّاعِيَ لَا
عِوَجَ لَهٗ ۚ وَخَشَعَتِ الْاَصْوَاتُ لِلرَّحْمٰنِ فَلَا تَسْمَعُ اِلَّا هَمْسًا ﴿۱۰۸﴾
يَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهٗ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾
يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِهٖ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَعَنَتِ
الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ ۭ وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ
الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿۱۱۲﴾ وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ
قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ
ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۚ وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ
يُّقْضٰۤى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۫ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَلَقَدْ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اٰدَمَ
مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾

اور وہ آپ سے پہاڑوں کے بارے پوچھتے ہیں سو فرما دیجیے کہ میرا پروردگار ان کو
بالکل اڑا دے گا ﴿۱۰۵﴾ پھر اس (زمین) کو ہموار میدان کر دیں گے ﴿۱۰۶﴾
جس میں تو (اے مخاطب!) نہ ہی ناہمواری دیکھے گا اور نہ کوئی بلندی ﴿۱۰۷﴾ اس
روز (سب کے سب) ایک پکارنے والے کے پیچھے چلیں گے، اس کی (پیروی) سے
انحراف نہ کر سکیں گے اور تمام آوازیں رحمٰن (اللہ) کے سامنے (مارے ہیبت کے)

دب جائیں گی پھر (اے مخاطب!) تم کھسر پھسر کے علاوہ کوئی آواز نہ سنو گے ﴿۱۰۸﴾ اس روز (کسی کی) سفارش کوئی فائدہ نہ دے گی سوائے ایسے شخص کے جس کے لیے رحمٰن (اللہ) نے اجازت بخش دی ہو اور اس کی بات کو پسند فرمائیں ﴿۱۰۹﴾ جو کچھ ان کے آگے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے وہ (اللہ) سب جانتے ہیں اور اپنے علم سے اُس (کے علم) پر احاطہ نہیں کر سکتے ﴿۱۱۰﴾ اور اس زندہ قائم رہنے والے کے سامنے منہ نیچے ہو جائیں گے اور جس نے (شرک کے) ظلم کا بوجھ اٹھایا بے شک وہ نامراد رہا ﴿۱۱۱﴾ اور جو نیک کام کرے گا اور (اس حال میں کہ) وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا تو اس کو نہ زیادتی کا خوف ہوگا اور نہ کمی کا ﴿۱۱۲﴾ اور ہم نے اسی طرح قرآنِ عربی نازل فرمایا ہے اور اس میں طرح طرح کے (عذاب سے) ڈرانے والے واقعات بیان فرما دیے ہیں تا کہ وہ لوگ پرہیزگار بنیں یا (یہ قرآن) ان کے لیے کسی قدر شعور پیدا کر دے ﴿۱۱۳﴾ پس اللہ جو حقیقی بادشاہ ہیں، بڑے عالیشان ہیں اور آپ قرآن (پڑھنے) میں جلدی نہ کیجیے اس سے پہلے کہ آپ پر اس کی پوری وحی نازل ہو چکے اور یہ دعا کیجیے کہ اے میرے پروردگار! میرا علم بڑھا دیجیے ﴿۱۱۴﴾ اور یقیناً ہم نے پہلے آدم (علیہ السلام) سے عہد لیا تھا پھر وہ (اسے) بھول گئے اور ہم نے ان میں پختگی (ثابت قدمی) نہ پائی ﴿۱۱۵﴾

تفسیر و معارف

کفار کے جاہلانہ سوالات:

فرمایا: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْجِبَالِ فَقُلْ يَنْسِفُهَا رَبِّيْ نَسْفًا ﴿۱۰۵﴾ یہ کہتے ہیں کہ ان بڑے پہاڑوں اور سنگلاخ چٹانوں کا کیا ہوگا، کیا یہ بھی ٹوٹ جائیں گے؟ کہتے ہیں کہ ان پہاڑوں میں تو مٹی یا ریت کے ذرّے نظر نہیں آتے یہ کیسے تباہ ہوں گے؟ ان کے سوالات کتنے جاہلانہ ہیں۔ یہ اتنا نہیں سوچتے کہ یہ پہاڑ، یہ زمین، یہ دریا کس نے

بنائے ہیں۔ تباہ کرنا تو بنانے کی نسبت آسان ہوتا ہے تو جس نے بنائے ہیں اس کے لیے تباہ کرنا کیا مشکل ہے؟ ایک عمارت بنانا مشکل ہوتا ہے لیکن اُسے تباہ کرنے کے لیے چار ڈائنامائٹ لگادیں تو وہ مٹی کا ڈھیر بن جائے گی۔

فرمایا: فَقُلۡ یَنۡسِفُهَا رَبِّیۡ نَسۡفًا﴿۱۰۵﴾ کہہ دو! میرا ربّ انہیں ایسا تباہ کرے گا کہ کچھ باقی نہیں رہے گا، ریت کے ذرّوں میں ڈھل جائیں گے۔

یومِ حشر کی ایک جھلک:

فرمایا: فَیَذَرُهَا قَاعًا صَفۡصَفًا﴿۱۰۶﴾ اس دن روئے زمین کو ایک چٹیل میدان بنا دیا جائے گا، سمندر بھاپ بن کر اڑ جائیں گے، دریا خشک ہو جائیں گے، چشموں کے سوتے سوکھ جائیں گے اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑ جائیں گے تو یَوۡمَ تُبَدَّلُ الۡاَرۡضُ غَیۡرَ الۡاَرۡضِ (ابراھیم: 48) زمین کو ہم دوسری زمین کی شکل دے دیں گے کہ یہ ساری زمین ایک چٹیل میدان بن جائے گی جس میں نہ کوئی دریا ہوگا نہ سمندر ہوگا۔ اس میں نہ کوئی وادی ہوگی نہ کوئی گھاٹی، نہ کوئی چٹان ہوگی نہ پہاڑ ہوگا نہ ہی کوئی درخت اور روئیدگی ہوگی۔ الغرض وہاں چھپنے کی کوئی جگہ نہیں ہوگی اور سب ہتھیلی کی طرح سامنے نظر آ رہا ہوگا۔ لَا تَرٰی فِیۡهَا عِوَجًا وَّ لَاۤ اَمۡتًا﴿۱۰۷﴾ اے مخاطب! تو اس میں کوئی ناہمواری نہ دیکھے گا نہ کوئی بلندی دیکھے گا نہ پستی، سب کچھ صاف کر کے ایک چٹیل میدان کر دیا جائے گا۔ یَوۡمَئِذٍ یَّتَّبِعُوۡنَ الدَّاعِیَ۔۔۔ پکارنے والے کی پکار پر ہر متنفس مجبور ہوگا کہ وہاں پہنچے، جہاں وہ پکار رہا ہے۔ لَا عِوَجَ لَهٗ۔۔۔ اور کوئی چھپ نہیں سکے گا نہ ہی کوئی بھاگ سکے گا۔ وہاں نہ چھپنے کی جگہ ہوگی اور نہ ہی کوئی چھپ سکے گا بلکہ ہر ایک اسی طرف بھاگتا چلا جائے گا جہاں پکارنے والا پکار رہا ہوگا۔ اس دن ساری مخلوق، آدم علیہ السلام سے لے کر اُن آخری انسانوں تک، جن پر قیامت قائم ہوگی، میدانِ حشر میں جمع ہوں گے لیکن کوئی شور نہیں ہوگا نہ بھگدڑ مچے گی۔ فرمایا: وَ خَشَعَتِ الۡاَصۡوَاتُ لِلرَّحۡمٰنِ فَلَا تَسۡمَعُ اِلَّا هَمۡسًا﴿۱۰۸﴾ اس دن اس کی بارگاہ میں آوازیں دب جائیں گی، کسی کو شور کرنے کی جرأت نہیں ہوگی۔ اگر کوئی کسی سے بات کرے گا بھی تو سرگوشی میں کرے گا۔ جیسے گزشتہ آیات میں گزر چکا ہے کہ لوگ آپس میں سرگوشی کریں گے کہ ابھی تو دس دن بھی نہیں گزرے اور قیامت قائم ہوگئی ہے، دنیا میں تو بہت ہی تھوڑا عرصہ رہے اور برزخ میں بھی زیادہ رہنا نہیں ملا لیکن یہ باتیں سرگوشیوں میں ہوں گی، ان سے شور نہیں ہوگا۔ ہر کوئی اپنے دھیان میں حاضری کے لیے بھاگا جا رہا ہوگا کہ میں حاضر ہو جاؤں۔ کسی کو شور مچانے کی فرصت نہیں ہوگی۔ دنیا میں جہاں چند لوگ جمع ہو جائیں تو شور مچ جاتا ہے، ہنگامہ ہو جاتا ہے، جھگڑے ہو جاتے ہیں لیکن اُس دن نہ شور ہوگا نہ بھگدڑ مچے گی۔

شفاعت:

وہ دن اتنا سخت ہوگا کہ بغیر اللہ کی اجازت کے کوئی کسی کی سفارش بھی نہیں کر سکے گا۔ فرمایا: يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ۔۔۔ کسی کی سفارش فائدہ نہیں دے گی، سوائے اُن لوگوں کو جن کے لیے اللہ نے اجازت بخشی ہوگی یعنی ایمان والوں کو سفارش فائدہ دے گی۔ اللہ کریم نے اپنے انبیاؑ کو، اپنے نیک برگزیدہ بندوں کو سفارش کرنے کی اجازت دی ہے۔ قرآنِ کریم، تلاوت کرنے والوں کی سفارش کرے گا، نمازیں، روزے بارگاہِ الٰہی میں ان نمازیوں اور روزے داروں کی سفارش کریں گے، جنہوں نے پورے ایمان اور یقین اور سنت کے مطابق انہیں ادا کیا ہوگا۔ معصوم بچے اپنے والدین کی سفارش کریں گے۔ سفارش اُنہی لوگوں کی ہوگی، جن کے لیے اللہ کریم اجازت دیں گے۔ کافر کے لیے اللہ نے سفارش منع کر دی ہے اور کوئی کافروں کے لیے سفارش نہیں کرے گا۔

اور وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴿۱۰۹﴾ جن کی بات کو اللہ پسند فرمائیں، یعنی حصولِ سفارش کے لیے بندہ کم از کم ایمان تو لے کر جائے تاکہ اسے کسی کی سفارش فائدہ دے سکے۔ ہمارے ہاں رواج ہو گیا ہے ہم کہتے ہیں کہ خیر ہے شفاعت ہو جائے گی اللہ بہت کریم ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سفارش فرمائیں گے، فلاں بزرگ یا پیر صاحب بخشوالیں گے۔ یہ ساری باتیں درست سہی لیکن یاد رہے کہ سفارش کی اہلیت بھی ایمان ہے کہ بندہ اس قابل تو رہے کہ اس کو سفارش فائدہ دے۔ غیر مومن کے لیے تو سفارش کی اجازت ہی نہیں ہے۔ نہ انبیاؑ و رسلؑ کو نہ ہی پیروں، ولیوں کو۔

اللہ کریم کا علم حضوری ہے:

فرمایا: يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ﴿۱۱۰﴾ اللہ کریم اپنے بندوں کے حال سے مکمل طور پر واقف ہیں۔ اللہ کریم جانتے ہیں کہ ان بندوں کے آگے کیا تھا اور پیچھے کیا تھا یعنی وہ دنیا میں کیا کرتے رہے اور جب دنیا سے رخصت ہوئے تو پیچھے کیا چھوڑ آئے۔ انہوں نے نیکی کے کام جاری کیے یا بدعات و خرافات جاری کر گئے۔ کیا اچھے دستور بنا کر آئے یا ظلم ایجاد کر کے چھوڑ آئے؟ یہ سب اللہ کریم کے علم میں ہے۔ اللہ کا علم ایسا ہے کہ کوئی اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اللہ کا علم اس کی صفت ہے اور اس کی صفات اس کی ذات کی طرح بے مثل و بے مثال ہیں، ازلی و ابدی ہیں۔ جبکہ انسان مخلوق ہے اس کی صفات بھی مخلوق ہیں اور جس نے اُسے پیدا کیا اسی نے انسان کی صفات کو بھی پیدا کیا۔ انسان کا علم اس کی صفت ہے، اور مخلوق ہے لہٰذا وہ خالق کا احاطہ نہیں کر سکتی۔

مخلوق محدود ہے، اس کی ایک ابتداء ہے، ایک انتہا ہے جبکہ خالق لامحدود ہے اس کی نہ ابتداء ہے نہ انتہا ہے۔ چنانچہ لامحدود محدود کے حصار میں نہیں آسکتا۔ سو اللہ کریم ہر بندے کے بارے میں ہر بات جانتے ہیں کہ اس کے آگے کیا تھا، اس کے والدین، اس کا خاندان کیا تھا، نیک ماحول میسر آیا یا برا اور اس نے ماحول سے کیا سیکھا اور خود کیا عمل کیا؟ اللہ کریم یہ بھی جانتے ہیں کہ کس نے پیچھے کیا چھوڑا اس لیے کہ ہر بات اس کے ذاتی علم میں ہے اور کوئی اس کے علم کی انتہا کو نہیں پہنچ سکتا۔

بقا صرف اللہ کی ذات کو ہے:

فرمایا: وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ۔۔۔ ساری مخلوق فنا کی گھاٹی سے گزر کر آئے گی، سب فانی ہیں۔ یہ پیدا ہوتے ہیں مرنے کے لیے، گھر بناتے ہیں اجڑ جانے کے لیے، بستیاں بساتے ہیں تباہ ہونے کے لیے، یہ سب کچھ وقتی ہے، ایک کھیل ہے۔ ہماری ذمہ داری اتنی ہے کہ ہم اس دنیا کی زندگی میں اللہ کی اطاعت کو کتنی دیانت داری سے اپناتے ہوئے اسے گزارتے ہیں۔ ایک دن یہ سب کچھ نہیں رہے گا، یہ حکومتیں، یہ ریاستیں، یہ زمینیں، یہ جاگیریں یہ گھر یہ مکان یہ سب نہیں رہے گا۔ یہ سب ہمارے نہیں تھے، یہ نہ جانے کس کس کے پاس سے ہو کر، کہاں کہاں سے گزر کر ہمارے پاس آئے ہیں اور پھر ہمارے پاس بھی نہیں رہیں گے۔ جب ہم چلے جائیں گے یہ سب چیزیں یہیں ہوں گی پھر نہ جانے کس کس کے کام آئیں گی۔ آج تو ہم کہتے ہیں کہ یہ میری گاڑی ہے، یہ میرا گھر ہے، یہ میری زمین ہے، کل پتا نہیں کون کہہ رہا ہوگا تو پھر کیوں نہ ہم اس سارے نظام کو اللہ کے حکم کے مطابق کریں تاکہ کل اللہ کی بارگاہ میں شرمندگی نہ ہو۔ سب فنا کی گھاٹی سے گزر کے آئیں گے، اللہ کی بارگاہ میں پہنچیں گے جو ہمیشہ باقی رہنے والا، قائم رہنے والا ہے، تو سب کے سر جھکے ہوں گے اور سب کو پتا چل جائے گا کہ ہماری حیثیت کیا ہے۔ اللہ نے بنا دیا، ہم بن گئے، اس نے مٹا دیا ہم مٹ گئے، آج پھر اس نے کھڑا کر دیا ہم آگئے، اور آج ہمیشہ قائم و دائم ہستی یعنی اللہ کی بارگاہ میں چہرے چھپائے ہوئے، سر جھکائے کھڑے ہوں گے۔ بڑے بڑے جابر حکمران اس دن سر جھکائے کھڑے ہوں گے۔ یہ بات یاد رہے کہ ہر بندے کے اندر ایک جابر حکمران ہے، یہاں تک کہ ایک گداگر کے اندر بھی ایک جابر حکمران ہے۔ جہاں تک اس کا اختیار ہے وہاں تک وہ بھی بڑا جابر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ عالی ہے: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْؤُلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ (بخاری و مسلم) کہ تم میں سے ہر شخص حکمران ہے اور ہر ایک سے سوال پوچھا جائے گا ان لوگوں کے بارے میں جو اس کے تابع ہوں گے۔ کوئی ملک پر حکمران ہے، کوئی صوبے پر کوئی ضلع پر،

کوئی شہر پر، کوئی محلے پر اور کم از کم غریب سے غریب شخص بھی اپنے گھر اپنے بیوی بچوں پر تو حکمران ہے۔ کسی نہ کسی درجے میں ہر بندے کے پاس اقتدار و اختیار ہے، جتنا جتنا ہے اتنی ہی پرسش ہوگی۔

یومِ حشر میں خسارہ اور کامرانی:

فرمایا: وَقَدْ خَابَ مَنْ حَمَلَ ظُلْمًا ﴿١١١﴾ جس نے دنیا میں رہ کر ظلم کیا، زیادتی کی وہ بہت خسارے میں رہا۔ سب سے بڑا ظلم اللہ سے شرک ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمٰن:13) اس کے بعد اللہ کی نافرمانی بہت بڑا ظلم ہے، اپنے ساتھ بہت بڑی زیادتی ہے۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ہم کسی کے ساتھ ظلم نہیں کرتے بلکہ لوگ خود اپنے ساتھ ظلم کرتے ہیں، نافرمانیاں اور گناہ کر کے خود اپنے اوپر ظلم کے پہاڑ توڑتے ہیں۔

فرمایا: وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا يَخٰفُ ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿١١٢﴾ جس نے نیک کام کیے اور وہ ایمان بھی رکھتا ہوگا تو اس کو نہ زیادتی کا خوف ہوگا اور نہ ہی کمی کا۔ انسانی مزاج ہے کہ ہر انسان جو کام کرتا ہے وہ اس کی رائے میں درست ہوتا ہے اور اس کے نزدیک عملِ صالح ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ ناحق قتل کرنے والے سے بھی اگر پوچھا جائے تو اس کے پاس بھی جواز ہوتے ہیں کہ اس کا علاج ہی یہ تھا اس لیے قتل کرنا پڑا۔ اسی طرح چور کے پاس چوری کا جواز ہوتا ہے اور ڈاکو ڈاکے کو درست خیال کرتا ہے۔ یوں ہر انسان اپنی پسند سے جس عمل کو چاہے صالح سمجھ لیتا ہے تو صلاحیت کا فیصلہ کیسے ہوگا؟ اللہ کریم نے اس کا فیصلہ فرما دیا ہے کہ ہر وہ عمل، ہر وہ طریقہ جس کی تعلیم اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے اور جو عمل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق کیا گیا ہو وہ عملِ صالح ہے۔ اگر کوئی کام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے خلاف ہے تو وہ غیر صالح ہے۔

ایک اہم نکتے کی نشاندہی:

فرمایا: وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ۔۔۔ کہ جو نیک اعمال کرے اور وہ ایمان والا بھی ہو۔ اس آیۂ کریمہ میں اللہ نے ایک عجیب انداز اختیار فرمایا ہے جو عموم سے ہٹ کر ہے۔ قرآن کریم کے اکثر مقامات میں دیکھا گیا ہے کہ ایمان مقدم ہوتا ہے اعمال پر اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ۔۔۔ (العصر:3) کہ جو ایمان لایا اور اس نے نیک کام کیے۔ یہاں چونکہ بات دنیا اور آخرت کے معاملات کی چل رہی تھی تو اللہ کریم نے اعمالِ صالحہ کو ایمان پر مقدم کر دیا۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ایمان لانا ایک بات ہے، اس کو باقی رکھنا اعمالِ صالح پر منحصر ہے۔ ایک بندے نے کلمہ پڑھ لیا، توحید اور رسالت کا اقرار کر لیا، اب اس اقرار کو حتمی طور پر باقی رکھنا اس کے

کردار پر منحصر ہے۔ اگر کردار صحیح نہیں ہوگا تو ایمان کو زک پہنچتی رہے گی، نقصان ہوتا رہے گا۔ بعض اوقات گناہ اتنے بڑھ جاتے ہیں کہ بندہ ایمان چھوڑ کر کفر میں چلا جاتا ہے۔ آج اگر دیکھا جائے تو اکثر گھرانوں میں مختلف عقائد کے حامل افراد ملتے ہیں۔ ایک ہی گھر میں تین، چار عقائد پر عمل کرنے والے موجود ہوتے ہیں۔ اب صحیح عقیدہ تو ایک ہی صحیح ہوگا پھر آخر ایک گھر میں چار چار عقیدے کیوں ہو گئے؟ باپ دادا مسلمان تھا، صحیح العقیدہ تھا، نماز روزے کا پابند تھا۔ اب بیٹا رفتہ رفتہ نجانے کہاں سے کہاں نکل گیا نئے عقائد گھڑ لیے ہیں، آخر کیوں؟ مسلمانوں کے گھر پیدا ہو کر کفر کی گود میں کیوں چلا گیا؟ یہ آیۂ کریمہ بتا رہی ہے کہ کردار صالح نہ ہو تو ایمان بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ ایمان لانے کے بعد اس کو قائم رکھنا اور اس میں ترقی کرنا اعمال پر منحصر ہے، کردار پر منحصر ہے۔ ایمان کی بقا کردار پر ہے۔ اگر کردار غیر صالح ہوگا تو ایمان بھی خطرے میں ہوگا۔

دوسری بات یہ ہے نیکی قبول ہونے کے لیے ایمان شرط ہے۔ بعض اوقات کافر لوگ بھی نیکی کے کام کرتے ہیں ہسپتال بناتے ہیں، کنویں بنوا دیتے ہیں، لوگوں کے لیے پانی پینے کا اہتمام کر دیتے ہیں یا راستے اور پل وغیرہ بنا دیتے ہیں۔ چونکہ کافر اللہ کو نہیں مانتا، نہ ہی اس کا آخرت پر یقین ہوتا ہے تو وہ اللہ کی رضا یا آخرت کے لیے کوئی کام نہیں کرتا۔ اس کا مقصد صرف دنیا کا فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ایمان کے بغیر کی گئی نیکی قیامت میں کوئی فائدہ نہیں دے گی، اس کا بدلہ اللہ اُسے دنیا میں ہی دے دیتے ہیں۔

نیکی کا اجر:

جو ایمان کے ساتھ نیکیاں کر کے میدانِ حشر میں پہنچا، فرمایا: ظُلْمًا وَّلَا هَضْمًا ﴿١١٢﴾ پھر وہ اس بات سے بالکل بے خوف ہوگا کہ کوئی اس کے ساتھ زیادتی کرے گا یا اس کے اعمال میں کمی کر دے گا۔ وہاں کمی نہیں ہوگی بلکہ اللہ کریم کی طرف سے ہر نیکی کا بدلہ کم از کم دس گنا بڑھا کر دیا جائے گا۔ اس سے زیادہ کتنا دے گا، اس کی کوئی حد مقرر نہیں، کروڑوں گنا عطا فرما دے تو اس کی عطا ہے۔ اللہ کریم اتنی رعایت فرماتے ہیں کہ کوئی شخص نیکی کا ارادہ کرتا ہے لیکن نیکی کر نہیں پاتا تو نیکی کا ارادہ کرنے پر بھی نیکی لکھی جاتی ہے اور اس کا بھی ثواب ملے گا۔ اللہ اتنے کریم ہیں کہ اگر کوئی برائی کا ارادہ کرتا ہے اور کر نہیں پاتا تو اللہ کریم اس کا ارادہ معاف کر دیتے ہیں اور اگر وہ گناہ کر گزرے تو گناہ کی سزا اتنی ہی دی جاتی ہے جتنا گناہ ہو۔ بہر حال یہ اندازہ کر لینا چاہیے کہ دنیا چند روزہ ہے اور آخرت ابدی ہے، تو پھر چند لمحوں کی لذت کے لیے یا چند سکے حاصل کرنے کے لیے اگر کوئی گناہ کرتا ہے تو گو کہ اس کی سزا تو اتنی ہی ہوگی، لیکن ابدی زندگی تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے اور اس حوالے سے سزا کتنی بڑی ہو جائے گی۔

قرآن کا نزول عربی میں ہوا:

فرمایا: وَ كَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾ اسی طرح ہم نے قرآنِ کریم کو عربی میں نازل فرمایا ہے۔ قرآن کریم وہ ہے جو عربی میں ہے، لہٰذا اگر کوئی محض ترجمہ پڑھتا ہے تو تلاوت شمار نہیں ہوگی اور پڑھنے والے کو تلاوت کا ثواب نہیں ہوگا، ہاں سمجھنے کے لیے پڑھے تو سمجھنے کا ثواب ہوگا۔ اگر کوئی سارا ترجمہ پڑھ جائے اور سمجھے کہ اس نے قرآن کا ختم کیا ہے تو یہ غلط ہے اس نے ترجمہ پڑھا ہے قرآن نہیں پڑھا کہ قرآن صرف عربی متن ہے۔ ہمارے پڑھے لکھے طبقے نے یہ عادت بنالی ہے کہ وہ صرف انگریزی تراجم میں صرف انگریزی کی عبارت پڑھتے ہیں، عربی نہیں پڑھتے اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے تلاوت کرلی۔ یاد رہے تلاوت کا ثواب صرف عربی پر ملے گا، ختمِ قرآن کا ثواب عربی پر ملے گا کہ تلاوت وہی شمار ہوگی جو عربی میں کی جائے، اس کے علاوہ کسی بھی زبان میں پڑھے گا تو سب تراجم ہوں گے، قرآن نہیں ہوگا۔

قرآن نصیحت ہے:

فرمایا: وَّصَرَّفْنَا فِيْهِ مِنَ الْوَعِيْدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾ اور اس میں طرح طرح کے ایسے ہیبت ناک اور خوفناک واقعات بیان فرمائے ہیں تاکہ انسان یہ کام نہ کرے۔ قرآن کا مقصد قصے سنانا نہیں۔ اس میں قوموں کی تباہی کے قصے، حکومتوں اور سلطنتوں کے اجڑنے کے قصے، عذابوں کے نزول کے قصے، آسمانوں سے سنگ باری اور آگ برسنے کے واقعات، زمین کے پھٹ جانے اور لوگوں کے دھنس جانے کے واقعات، پانی میں غرق ہونے کے واقعات، یہ سب بڑے بڑے ہیبت ناک قصے قرآن میں اس لیے بیان کیے گئے ہیں تاکہ انسان ایمان لائیں اور اپنے کردار کی اصلاح کریں اور ان حادثات سے دوچار ہونے سے بچ جائیں۔ یہ تو دنیا کے حادثات ہیں جبکہ آخرت میں جو عذاب انہیں ہوں گے وہ تو اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ یہ قصے اس لیے بیان فرمائے گئے ہیں: لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۔۔۔ تاکہ لوگ پرہیزگاری کا راستہ اختیار کریں، اللہ کی اطاعت کا راستہ خلوص سے اختیار کریں اور اپنے آپ کو دنیا اور آخرت میں اللہ کے عذابوں سے بچائیں۔ اَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا ﴿۱۱۳﴾ قرآن تو اس لیے ہے کہ تم میں شعور پیدا کردے، تمہاری عقل کو جلا بخشے، تمہاری خرد کو قوت عطا کردے اور تم نصیحت حاصل کرلو۔

ہم قرآن سے نصیحت حاصل کیوں نہیں کرتے؟

یہ بڑی عجیب بات ہے اور باعثِ حیرت ہے کہ ہم قرآن کی تلاوت کرتے ہیں، حافظ وقاری بھی بن جاتے ہیں، منزل بھی روز پڑھتے ہیں، پھر سود کھانے کو بھی لپکتے ہیں چوری سے باز نہیں آتے، جھوٹ بول لیتے ہیں۔ آخر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ قرآن تو سراپا ہدایت ہے اور اللہ کریم فرماتے ہیں کہ قرآن کی تلاوت اور سمجھ کر پڑھنے سے شعور پیدا ہوتا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کیوں نہیں نصیحت پاتے؟ اس کا سادہ سا جواب ہے کہ یہ چلا تب بخشے گا جب قرآن کو قرآن سمجھ کر، اللہ کو حاضر جان کر، اسے اللہ کا کلام سمجھ کر پڑھا جائے، اگر محض رسماً دہراتے رہیں گے تو اس سے یہ فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ جو لوگ قرآن بھی پڑھتے ہیں اور گناہ بھی کرتے ہیں وہ قرآن نہیں پڑھتے بلکہ ایک رسم پوری کرتے ہیں۔

قرآن کو ایمان ویقین کے ساتھ، اللہ کا کلام سمجھ کر پڑھا اور سمجھا جائے، یہ جاننے کی کوشش کی جائے کہ اس میں ہمارے پروردگار نے ہمیں کیا حکم دیا ہے اور وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں، کس بات پر راضی ہیں تو پھر کسی قدر شعور نصیب ہوتا ہے اور عقل اور خرد میں اضافہ ہوتا ہے۔

حقیقی بادشاہت صرف اللہ کی ہے:

فرمایا: فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ ۔۔۔ ایک بات یاد رکھو، حقیقتاً اللہ ہی بڑا ہے اور وہی حقیقی بادشاہ ہے۔

ایک کتاب میں مشاہیر کی موت کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس میں اسلامی تاریخ کے ایک بڑے حکمران کے متعلق یہ ملتا ہے کہ جب اس پر نزع کا عالم آیا تو وہ بستر سے فرش پر آ گیا اور سجدے کی حالت میں زمین پر سر رکھ کر کہتا تھا کہ اے وہ! جس کی سلطنت کو کبھی زوال نہیں اس پر رحم فرما جس کی بادشاہت ختم ہو رہی ہے۔ انسانی مزاج بھی عجیب ہے، ہر بندہ اپنی بڑائی میں مبتلا ہے۔ ہم سڑک پر نظر آنے والے خاکروب کے بارے میں سمجھتے ہیں کہ اس کی بھلا کیا حیثیت ہے؟ لیکن اس سے پوچھیں تو وہ دوسرے خاکروبوں کے مقابلے میں خود کو بڑا سمجھتا ہے۔ ہم گداگروں اور جھگی نشینوں کو مسکین سمجھتے ہیں لیکن اُن سے بات کریں تو وہ خود کو سب سے بڑا سمجھتے ہیں۔ بندر اور ریچھ نچانے والوں کی باتیں سنیں تو وہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ بہت بڑے ہیں یعنی اُن میں بھی ایک اَنا چھپی ہوئی ہے اور وہ خود کو بڑا خیال کرتے ہیں۔ فرمایا، یہ سب جھوٹ ہے۔ حقیقتاً صرف اللہ بڑا ہے باقی سب محتاج ہیں، سب چھوٹے ہیں، اور ایسے محتاج ہیں کہ ایک رات نیند نہ آئے تو پریشان ہو جاتے ہیں۔ انسان کے ساتھ تو احتیاج ہی احتیاج ہے، سونے جاگنے کا محتاج ہے، غذا کا محتاج، لباس کا محتاج، آنکھوں کی بینائی، کانوں کی

شنوائی، قوتِ گویائی کا محتاج ہے۔ الغرض ہر لحہ محتاج ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی بڑا ہے جو حقیقی بادشاہ ہے اور جس کی سلطنت ذاتی ہے اور لازوال ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو وحی حفظ کروانا اللہ نے اپنے ذمہ لیا:

فرمایا: وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ ۡ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾

میرے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلّم) آپ کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے جب تک جبرائیل امین ختم نہیں کر لیتے آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) اسے نہ دہرائیں اس لیے کہ آپ کے قلبِ اطہر میں نقش کرنا، آپ کے حافظۂ عالی میں اس کو ثبت کرنا یہ ہمارا کام ہے۔ سبحان اللہ!

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم پر وحی نازل ہوتی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اسے دہرانا شروع کر دیتے تو اللہ کریم فرماتے ہیں کہ آپ آرام سے سنیں۔ جب جبرائیل امین ختم کرلیں تو آپ دہرالیں، یہ ہمارا کام ہے کہ آپ کو وحی یاد ہو، آپ بالکل فکر نہ کریں آپ کو بالکل صحیح یاد ہوگی۔

انسانی علوم کی کوئی حد نہیں:

اللہ کریم نے سب سے زیادہ علوم انبیا علیہما الصلوٰۃ والسلام کو عطا فرمائے اور انبیاءؑ ورسلؑ میں سب سے زیادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو عطا فرمائے، پھر بھی انسانی علوم کی کوئی حد نہیں انسان زیادہ سے زیادہ ترقی کر سکتا ہے۔ فرمایا، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم یہ دعا کرتے رہیے رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾ اے اللہ! میرے علوم میں ترقی فرما، میرے علوم میں اضافہ فرما۔

اللہ کریم نے ساری مخلوق کو علوم عطا فرمائے۔ اُس نے تو شہد کی مکھی کو شہد بنانے کا علم عطا کر دیا، چھوٹی سے چھوٹی مخلوق کو علوم عطا کر دیے، پرندے بیاء کو گھونسلہ بُننا سکھا دیا۔ لیکن سب سے اعلیٰ علوم انسانیت کو عطا فرمائے تو سب سے بڑا علم کیا ہے؟ مادّی علوم، سائنس ہے، طِب ہے، یہ بے شمار علومِ دنیوی ہیں، ان سے اعلیٰ دینی علوم ہیں۔ سارے دینی علوم کا ماحصل معرفتِ الٰہی ہے یعنی اللہ کی پہچان ہے اور دنیا کے بھی جتنے علوم ہیں ان میں بھی اگر غور کرنا نصیب ہو تو اُن کا ماحصل بھی عظمتِ الٰہی کا ادراک ہے۔

جتنے اسرارِ الٰہی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر وا ہوئے اس میں تمام انسانوں میں کوئی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہمسر نہیں لیکن پھر بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلّم سے فرمایا جا رہا ہے کہ دعا کیجیے: رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا اے اللہ! میرے علوم میں اضافہ کیجیے۔ اس کا مطلب ہے کہ معرفتِ الٰہی کی کوئی انتہا نہیں ہے، کوئی ایسا مقام نہیں ہے کہ جہاں پہنچ کر

بندہ کہہ سکے کہ یہاں ربّ بیٹھا ہے، ایسا نہیں ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ سلوک کے مقامات اور منازل کی انتہا نہیں ہوتی۔ بلکہ اس راہ میں زندگی بھر جو چلتے ہیں اُن کی ترقی مرنے کے بعد بھی ہوتی رہتی ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جنت میں بھی ہر آن ترقی ہوتی رہے گی اور ابدالآباد جنت میں رہیں گے اور ترقی ختم نہیں ہوگی۔ کوئی ایسا مقام نہیں آئے گا کہ اب اللہ کی نعمتیں ختم ہوگئی ہیں ایسا نہیں ہوگا۔ اب ایسی جنت کو چھوڑ کر انسان دوزخ کیوں جائے! لوگ سمجھتے ہیں کہ جنت جانا مشکل ہے، حق تو یہ ہے کہ دوزخ جانا مشکل ہے۔ ہر گناہ بہت مشکل ہوتا ہے، چوری کرنا مشکل ہے، جھوٹ بولنا مشکل ہے، دھوکا دہی، قتل وغیرہ سب مشکل ہیں اور بہت محنت کر کے لوگ دوزخ جا رہے ہیں، اللہ کریم معاف فرمائیں۔ نیکی کرنا بہت آسان ہے اور جنت تو مفت میں مل جاتی ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام سے بھول ہوئی:

گزشتہ آیات میں ایمان اور کفر، اطاعت اور عدم اطاعت کی بات چل رہی تھی تو اللہ کریم نے فرمایا کہ کیوں نہ وہ بات کی جائے، جہاں سے یہ ایمان و کفر، اطاعت اور عدم اطاعت کا جھگڑا شروع ہوا۔ کیوں نہ اولادِ آدم علیہ السلام کو وہ سارا واقعہ سمجھایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ شیطان نے کب سے، کہاں سے تمہاری دشمنی مول لی اور وہ دشمنی نبھائے جا رہا ہے۔ اللہ نے تمہیں انسانیت سے سرفراز فرمایا تو تم اس کی باتوں میں کیوں آتے ہو، جبکہ وہ تمہارا دشمن ہے۔ سو قصہ شروع کرتے ہی فرمایا: وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ حضرت آدم علیہ السلام اللہ کے نبیؑ تھے اور انبیاءؑ سراپا اطاعت ہوتے ہیں اور معصوم عن الخطا ہوتے ہیں۔ اُن سے بھول ہوگئی کہ شیطان نے اُن سے دھوکا کیا۔ شیطان تو وہ ہے کہ جب ہم نے آدم علیہ السلام سے وعدہ لیا، یہاں اللہ نے سادہ لفظ عہد فرمایا ہے، چنانچہ وعدہ دنیا میں اطاعت کا وعدہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ وعدہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ اس خاص درخت سے نہ کھایئے گا۔ فَنَسِيَ۔۔۔ اُن سے بھول ہوگئی۔ اللہ کریم خود اُن کی صفائی دے رہے ہیں کہ میں نے آدم علیہ السلام سے وعدہ لیا، آدم علیہ السلام کا عہد کیا تھا؟ اُن کا وعدہ عظمتِ الٰہی سے شناسائی اور اللہ کی اطاعت کا تھا، اُس میں اللہ کریم نے آزمائش رکھ دی اور انہیں ایک خاص درخت کا پھل کھانے سے روک دیا۔ بعض مفسرین کا خیال ہے کہ وہ دانۂ گندم ہے۔ بعض نے کسی پھل کا نام بھی لکھا ہے لیکن اللہ کریم نے کوئی تعین نہیں فرمائی، کوئی پھل بھی ہو سکتا ہے بس ایک آزمائش ایک امتحان ہو سکتا ہے کہ آپؑ جنت کے میوے کھائیں لیکن یہ پھل آپؑ نہیں کھایئے گا۔ سورۂ اعراف میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ شیطان نے حضرت آدم علیہ السلام اور اماں حواؑ کو قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ یہ پھل

بہت مفید ہے، اس کو کھانے سے آپ ہمیشہ یہیں رہیں گے اور آپ کو دوام مل جائے گا۔ آدم علیہ السلام جو ابھی وقت تخلیق ہوئے تھے، جن کا دل عظمتِ باری سے معمور تھا اُن کے پاس یہ تصور بھی نہیں تھا کہ کوئی جھوٹ پر بھی اللہ کی قسم کھا سکتا ہے۔ چنانچہ آدم علیہ السلام نے پھل کھا لیا۔ یہ پہلی دشمنی تھی جو ابلیس نے آدم علیہ السلام سے کی، اور اللہ کریم نے فرمایا فَنَسِيَ۔۔۔اُن سے بھول ہوگئی، یہ نہیں فرمایا کہ انہوں نے گناہ کیا۔ فرماتے ہیں وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ میں گواہ ہوں کہ ان کے دل میں میری نافرمانی کا کوئی ارادہ نہ تھا۔ اللہ کریم گواہی دے رہے ہیں کہ یہ کوئی نہ سمجھے کہ آدم علیہ السلام نے میری نافرمانی کی، اُن کے دل میں اس کا شائبہ تک نہیں تھا۔

یہ الگ بات ہے کہ جس ہستی کو جتنا قرب نصیب ہوتا ہے، اس کی ادنیٰ سی بھول بھی بڑی سخت شمار ہوتی ہے اور اس پر گرفت بھی اس حساب سے کی جاتی ہے۔ مگر یاد رہے یہ اللہ اور اللہ کے نبیؑ کا معاملہ ہے اور اُن کا احترام اور عظمت اپنی جگہ ہے۔ لوگوں کو اپنی رائے دیتے وقت انتہائی محتاط ہونا چاہیے۔

ایک غیر اسلامی نظریہ:

یہ عام مسلمانوں کا خیال ہے کہ آدم علیہ السلام کو بطورِ سزا جنت سے نکالا گیا تھا، اور لوگ حضرت آدم علیہ السلام پر معترض ہوتے ہیں کہ اگر وہ گندم نہ کھاتے تو زمین پر نہ آتے اور ہم بھی جنت میں ہی رہتے۔ برصغیر کے ایک نامور شاعر نے بھی اپنے ایک شعر میں یہ رائے دی ہے کہ آدم علیہ السلام کو بے آبرو کر کے جنت سے نکالا گیا تھا۔ یہ سراسر غیر اسلامی نظریہ ہے اور اسلامی عقائد سے لاعلمی کی دلیل ہے۔ ہمارے ہاں ایک عجیب رواج ہو گیا ہے کہ جو شاعر یا ادیب شعائرِ اسلامی کی جتنی تضحیک کرے وہ اتنا ہی اعلیٰ پائے کا شاعر و ادیب مانا جاتا ہے اور یہ اس لیے ہوتا ہے کہ لوگوں کا مزاج اس قدر مسخ ہو چکا ہے۔

قرآن کریم کا اندازِ تخاطب بتاتا ہے کہ یہ صرف اس شخص کو دانش مند یا صاحبِ خرد مانتا ہے جو اللہ پر ایمان لے آتا ہے، اللہ کے انبیاءؑ و رسلؑ پر ایمان لاتا ہے اور دنیا کے ساتھ آخرت کو چلانا جانتا ہے۔ جسے اللہ پر ایمان نصیب نہ ہو، وہ چاہے دنیا کے کتنے ہی علوم حاصل کر لے، قرآن کریم اُسے جاہل کہتا ہے۔ خواہ ایک شخص ماہرِ تعلیم ہو، پڑھا لکھا قادر الکلام دانشور ہو، شاعر و ادیب ہو، موجد ہو، لیکن وہ اللہ پر ایمان نہ لائے تو قرآن کریم کی نظر میں وہ جاہل ہے۔

ہمارے معاشرے کا بہت بڑا المیہ ہے کہ جو شخص ساری عمر کلمہ تک نہیں پڑھتا، نماز نہیں پڑھتا، شعائرِ اسلامی سے نا آشنا ہے، اور اس کا حلیہ اور رہن سہن سب اغیار کا ہے۔ وہ خود نہیں جانتا کہ وہ کس قوم سے مشابہت رکھتا ہے، اس کے شب و روز میں نماز روزے کی گنجائش نہیں ہے، دین کی بات کا مذاق اڑاتا ہے اور ہمارا معاشرہ اُسے دانشور،

شاعر اور ادیب مانتا ہے جبکہ قرآن ایسے شخص کو جاہل کہتا ہے۔

انسان کو پیدا ہی زمین پر نیابتِ الٰہی کے لیے کیا گیا:

حضرت آدم علیہ السلام پیدا ہوئے تو چونکہ پہلے انسان تھے، وہ نہیں جانتے تھے کہ انسانی ضرورتیں کیا ہیں کھانا پینا، گرمی سردی کیا ہے لہٰذا اللہ کریم نے انہیں اور اماں حوا کو کچھ عرصہ جنت میں ٹھہرایا۔ آدم علیہ السلام اور اماں حوا کو جس جنت میں ٹھہرایا گیا وہ برزخ میں ہے اور جو جنت آخرت میں حساب کتاب کے بعد بطور رہائش عطا ہوگی، وہ الگ ہے۔ آخرت میں عطا ہونے والی جنت میں خلود ہے یعنی ہمیشہ کے لیے رہنا نصیب ہوگا، اس میں دخول ہے، خروج نہیں ہے۔ جو بھی اس جنت میں داخل ہوگا وہ وہاں سے کبھی نہیں نکالا جائے گا۔ اللہ کریم نے آدم علیہ السلام اور اماں حوا کو برزخ کی جنت میں ٹھہرایا اور ایک آزمائش بھی رکھ دی لیکن انہیں آنا زمین پر ہی تھا۔ اللہ کریم کا ارشاد ہے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً (البقرہ:30) کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، جو زمین پر میرے احکامات کو نافذ کرے گا۔ گویا نسلِ انسانی کو زمین پر ہی پہنچنا تھا اور وہ جنت آدم علیہ السلام کا عارضی ٹھکانہ تھا۔ شیطان نے انہیں دھوکا دیا اور اللہ کریم فرماتے ہیں کہ اچھا ہے کہ زمین پر جانے سے پہلے شیطان کی دشمنی کا تجربہ ہو گیا اور تم جان گئے کہ یہ تمہارا دشمن ہے، اب زمین پر جا کر اس سے دوستی نہ کرنا، اس کی بات نہ سننا۔

اگر دیکھا جائے تو دو ہی طاقتیں ہیں، ایک دعوت الی اللہ ہے، جس کے مدعی اللہ کے انبیاؑ ہیں اور دوسری اللہ کی مخالفت کی دعوت ہے، جس کا مدعی شیطان ہے۔ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت نہیں کرتا وہ دراصل شیطان کی اطاعت کرتا ہے۔ اگر انسان نیکی کی طرف نہیں جاتا تو چاہے وہ مانے یا نہ مانے، وہ شیطان کی پیروی کر رہا ہوتا ہے اس لیے کہ دو ہی راستے ہیں، تیسرا راستہ کوئی نہیں ہے۔

سورۃ طٰہٰ رکوع 7 آیات 116 تا 128

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ فَقُلْنَا
يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾
اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى ﴿۱۱۹﴾
فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ
لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا
مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۫ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ
عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿۱۲۲﴾ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ فَاِمَّا
يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۙ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَلَا يَشْقٰى ﴿۱۲۳﴾ وَمَنْ
اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾ قَالَ
كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾ وَكَذٰلِكَ
نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَلَمْ يُؤْمِنْۢ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ؕ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ
وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾ اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ يَمْشُوْنَ فِيْ
مَسٰكِنِهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾

اور جب ہم نے فرشتوں سے فرمایا کہ آدم (علیہ السلام) کے سامنے سجدہ کرو سو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے انکار کیا﴿۱۱۶﴾ تو ہم نے فرمایا

اے آدم (علیہ السلام)! یقیناً یہ آپ کا اور آپ کی بیوی کا دشمن ہے سو کہیں تم دونوں کو
جنت سے نہ نکلوا دے پھر تم مصیبت میں پڑ جاؤ ﴿۱۱۷﴾ بے شک یہاں آپ (کو
یہ آسائش ہوگی) نہ بھوکے رہیں گے اور نہ ننگے ﴿۱۱۸﴾ اور یہ کہ آپ کو یہاں نہ
پیاس لگے اور نہ دھوپ لگے گی ﴿۱۱۹﴾ پھر ان کو شیطان نے بہکایا (اور) کہنے لگا
اے آدم (علیہ السلام) کیا میں آپ کو ایسا درخت بتاؤں جو ہمیشہ کی زندگی (دینے)
کی خاصیت رکھتا ہو اور ایسی بادشاہی کہ جس میں کبھی کمزوری نہ آئے ﴿۱۲۰﴾ تو
دونوں نے اس میں سے (درخت کا پھل) کھا لیا تو ان پر ان کے ستر کھل گئے اور
(اپنا بدن ڈھانپنے کے لیے) دونوں اپنے اوپر جنت کے (درختوں کے) پتے
چپکانے لگے اور آدم (علیہ السلام) نے اپنے پروردگار کے حکم کے خلاف کیا تو غلطی
میں پڑ گئے ﴿۱۲۱﴾ پھر ان کو (جب انہوں نے معذرت کی) ان کے پروردگار نے
(زیادہ) مقبول بنا لیا تو ان پر توجہ فرمائی اور راہ (راست) پر قائم رکھا ﴿۱۲۲﴾
ارشاد ہوا تم دونوں کے دونوں اس (جنت) سے اترو (دنیا میں) تم میں سے بعض
بعض کے دشمن ہوں گے پھر اگر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آئے تو جو
شخص میری ہدایت کا اتباع کرے تو وہ نہ (دنیا میں) گمراہ ہوگا اور نہ (آخرت
میں) دکھ اٹھائے گا ﴿۱۲۳﴾ اور جو میرے ذکر (ہدایت) سے منہ پھیرے گا تو یقیناً
اس کے لیے (دنیا میں) تنگی کی زندگی ہوگی اور قیامت کے دن ہم اس کو (قبر سے)
اندھا کر کے اٹھائیں گے ﴿۱۲۴﴾ وہ کہے گا اے میرے پروردگار! آپ نے مجھ
کو اندھا کر کے کیوں اٹھایا میں تو (دنیا میں) دیکھتا تھا ﴿۱۲۵﴾ ارشاد ہوگا ایسا ہی
(چاہیے تھا) تیرے پاس ہماری آیتیں آتی تھیں تو تُو نے ان کا کچھ خیال نہ کیا اور اسی
طرح آج تیرا کچھ خیال نہ کیا جائے ﴿۱۲۶﴾ اور اسی طرح ہم (ہر) اس شخص کو سزا
دیں گے جو حد سے نکل گیا اور اپنے پروردگار کی آیات پر ایمان نہ لایا اور آخرت کا
عذاب بڑا سخت ہے اور بڑا دیر پا ہے ﴿۱۲۷﴾ سو کیا ان لوگوں کو اس سے بھی

ہدایت نہیں ہوئی کہ ہم ان سے پہلے بہت سے گروہوں کو ہلاک کر چکے ہیں جن کے
بسنے کے مقامات میں یہ چلتے پھرتے ہیں (آنا جانا ہوتا ہے) بے شک اس میں عقل
والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں ﴿۱۲۸﴾

تفسیر و معارف

اللہ کریم نے چاہا کہ اولادِ آدمؑ کو بتایا جائے کہ ایمان و کفر، اطاعت اور عدمِ اطاعت کا جھگڑا کہاں سے شروع ہوا۔ ابلیس اور ابلیس کی اولادِ آدمؑ سے دشمنی کا ذکر ہوتا ہے۔ ابلیس جنات میں سے تھا۔ اس نے اتنی عبادت اور ریاضت کی اور ترقی کرتے کرتے اللہ کریم نے اُسے آسمانوں پر فرشتوں میں جگہ دے دی۔ بلکہ خاص موقعوں پر بعض فرشتوں کا حاکم بھی رہا۔ مولانا محمد خان رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ لکھتے ہیں کہ تخلیقِ آدم علیہ السلام سے پہلے زمین پر جنات آباد تھے اور جب وہ زمین پر فساد کرتے تو اللہ کریم اُن کی اصلاح کے لیے کچھ فرشتے مامور کرتے۔ تو اُن فرشتوں کا انچارج یہی ابلیس ہوا کرتا تھا۔ اس ضمن میں وہ ایک شعر نقل کرتے ہیں:۔

زراہِ تفاخر بفوجِ ملک
گہے برزمین بود گاہ فلک

یعنی ابلیس بڑے فخر کے ساتھ فرشتوں کی فوج لیے ہوئے کبھی زمین پر وارد ہوتا تھا اور کبھی آسمان پر جاتا تھا۔

فرشتوں کی فوج کے ساتھ بحیثیت کمانڈر آتا اور سرکش جنات کو قتل کرتا، کسی کو سزا دیتا اور اُن کی اصلاح کر کے واپس چلا جاتا۔ چونکہ اسے فرشتوں میں جگہ مل گئی تھی اسی لیے جب فرشتوں کو حکم ملا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو یہ بھی اس میں شامل کیا گیا اور فرشتوں میں اس کا شمار کیا گیا۔ اللہ کی ذات علیم وخبیر ہے اور اللہ کریم فرماتے ہیں کہ ابلیس تھا ہی کافر، علمِ الٰہی میں تھا کہ یہ کافر ہے اور بالآخر کفر پر جائے گا۔ ابلیس جتنی عبادت کرتا رہا، اُس کو ترقی درجات ملتی رہی اور جب تک اس سے کفر کا صدور نہیں ہوا تب تک اسے کفر کی سزا نہیں ملی۔ جب کفر کا صدور ہوا تو سب کچھ سلب ہو گیا اور مردود ہو گیا۔

یہ سوال اکثر پوچھا جاتا ہے کہ کوئی شخص بہت سال کسی شیخ کی صحبت میں رہتا ہے پھر چھوڑ کر کیوں چلا جاتا ہے؟ تو یہی اُن کے سوال کا جواب ہے کہ ابلیس تب مردود ہوا جب اس نے گناہ کیا۔ دنیا میں جب کوئی قتل کرتا ہے تو سزا پاتا ہے لیکن اگر ارادہ قتل محض اس کے دل میں تھا اور اس نے قتل کا ارتکاب نہیں کیا تو اُسے سزا نہیں ہوتی۔ جب

کوئی شخص کسی شیخ کے ساتھ اللہ اللہ کرتا ہے اُس کو توجہ ملتی رہتی ہے، اس کے مراقبات ہوتے رہتے ہیں اور تعمیر ہوتی رہتی ہے لیکن جب وہ انکار کرتا ہے تو پھر شیطان کی طرح صدیوں کی، برسوں کی محنت ایک لمحے میں سلب ہو جاتی ہے۔

فرمایا: وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىِٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى ﴿۱۱۶﴾ جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم (علیہ السلام) کو سجدہ کرو تو وہ فوراً سجدے میں گر گئے سوائے ابلیس کے۔ یہ بھی وہیں تھا لیکن سجدے میں نہیں گیا بلکہ اَبٰى۔۔۔ سجدے سے انکار کر دیا کہ 'میں نہیں کروں گا' یعنی نافرمانی کی انتہا تک پہنچ گیا۔ فرشتوں کو جب حکم دیا گیا تو فَسَجَدُوْٓا۔۔۔ فوراً سجدے میں گر گئے۔ یہاں 'ف' استعمال ہوئی ہے اور 'ف' سے مراد ہوتی ہے تعمیلِ ارشاد میں کوئی تاخیر نہیں کی گئی۔ ابلیس نے نہ صرف انکار کیا بلکہ اعلان کر دیا کہ میں آدم (علیہ السلام) کو سجدہ نہیں کروں گا۔

ابلیس انسان کا ازلی دشمن:

اللہ کریم اولادِ آدم کو سمجھا رہے ہیں کہ تم اللہ کے نبی کی بات نہیں مانتے اور شیطان کی پیروی کرتے ہو جبکہ شیطان نے تمہارے جدِ امجد کو دھوکا دیا اور وہ تمہارا ازلی دشمن ہے۔ جو اس کی پیروی میں کفر و بے دینی اختیار کرتا ہے یہ اس کا بھی دوست نہیں بنتا بلکہ دشمنی ہی نبھاتا ہے اور یہی کوشش کرتا ہے کہ وہ مزید گمراہی میں مبتلا ہو کر جہنم کی مزید گہرائی میں گرے۔

فرمایا: فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَلِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى ﴿۱۱۷﴾ ہم نے اس وقت آدم (علیہ السلام) کو فرمایا کہ اے آدم! یہ دشمن ہے اور ہمیشہ آپ سے دشمنی ہی کرے گا۔ یہ آپ کا اور آپ کی اہلیہ کا دشمن ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ دھوکا دے کر آپ کو جنت سے نکلوا دے اور پھر آپ مشقت میں پڑ جائیں۔ جنت میں جب تک رہیں گے، ہر نعمت مفت میں مل رہی ہے، کھانا پینا، لباس سب کچھ مل رہا ہے۔ جنت سے جب زمین پر جائیں گے تو زندگی محنت و مشقت سے گزرے گی۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ:

اس آیہء مبارکہ نے یہ قانون ارشاد فرما دیا کہ زمین پر زندگی محنت اور مشقت سے گزارنی پڑتی ہے۔ کچھ لوگوں کا طرزِ عمل اور نظریہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی وظیفہ پڑھو تو مصلے کے نیچے سے روپے نکل آئیں گے۔ ایسا عمل کرنے والے لوگ جان لیں کہ یہ پیسے حرام ہوتے ہیں اور ان کی حقیقت یہ ہوتی ہے کہ جنات اور شیاطین دوسروں کے پیسے اٹھا کر ایسے لوگوں کے مصلوں کے نیچے رکھ دیتے ہیں۔ جن لوگوں سے چوری ہوتے ہیں وہ روتے پھرتے ہیں اور

شیاطین اور جنات لے اڑتے ہیں اور مصلے کے نیچے رکھ جاتے ہیں۔ ورنہ مصلوں کے نیچے کوئی نوٹوں کا کارخانہ نہیں ہوتا۔ یاد رہے کہ جنت سے باہر مفت نعمتوں کا کوئی تصور نہیں ہے اور اصول یہ ہے کہ زندگی میں محنت و مشقت کرنا پڑتی ہے۔ اللہ کے حکم کے مطابق دنیا میں محنت کی جائے تو وہ بھی عبادت شمار ہوتی ہے اور آخرت میں اجر ملتا ہے۔ حصولِ رزق کے صرف چار معروف ذرائع ہیں اور کوئی پانچواں ایسا ذریعہ نہیں ہے جو حلال ہو۔ یہ چار معروف ذرائع تجارت، ملازمت، مزدوری اور کاشتکاری ہیں۔ ان کے علاوہ جو بینکوں میں پیسے بڑھتے رہتے ہیں، وہ حرام ہیں چاہے اس کا نام منافع رکھ لیا جائے یا کچھ اور رکھ لیا جائے۔ ایسے ہی جوئے یا لاٹری سے پیسے حاصل کرنا بھی حرام ہے۔

معروف ذرائع میں بھی شریعت کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے، محنت کرنا پڑتی ہے۔ مثلاً جہاں ملازمت کی جائے وہاں جس کام کی تنخواہ لی جائے وہ کام سو فیصد کیا جائے۔ جہاں مزدوری کی جائے تو جس کام کی اجرت لے، وہ کام پوری دیانتداری سے کرے۔ جو لوگ حلال کماتے ہیں، اُن کی محنت اور مشقت بھی عبادت شمار ہوتی ہے کیونکہ حلال روزی کمانا فرضِ عین ہے۔ جس طرح مومن کو نماز کے فرائض ادا کرنے سے ثواب ملتا ہے، اسی طرح حلال روزی کمانے کا بھی اجر ملتا ہے۔

خاندان کا کفیل مرد ہے:

علمائے حق فرماتے ہیں کہ اللہ کریم نے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمادیا کہ جنت سے باہر نکلو گے تو روزی کمانے کے لیے مشقت اٹھانی پڑے گی حالانکہ نکلنے میں تو اماں حوا بھی ساتھ تھیں، لیکن جب مشقت کی بات آئی تو انہیں مشقت میں شریک نہیں کیا۔ اس کا مطلب ہے کہ فطری اصول یہ ہے کہ مرد کمائی کرے اور عورت اور خاندان کا نان نفقہ مہیا کرنے کا بوجھ اٹھائے کہ یہاں اماں حوا پر بوجھ نہیں ڈالا گیا۔ میدانِ عمل میں نکلنا، کاروبار کرنا، ملازمت کرنا، کاشتکاری کرنا، محنت مزدوری کرنا رزق کما کر لانا مرد کی ذمہ داری ہے۔ عورت کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ گھر کو سنبھالے، بچوں کی پرورش اور اچھی تربیت کرے۔

فرمایا: اِنَّ لَکَ اَلَّا تَجُوْعَ فِیْهَا وَلَا تَعْرٰی ﴿۱۱۸﴾ وَاَنَّکَ لَا تَظْمَؤُا فِیْهَا وَلَا تَضْحٰی ﴿۱۱۹﴾ جنت میں تو یہ مزے ہیں کہ آپ دونوں یہاں بھوکے نہیں رہیں گے اور یہاں نہ آپ کو پیاس لگے گی اور نہ ہی کوئی گرمی یا سردی محسوس ہوگی۔ موسم بھی خوشگوار ہوں گے اور کھانا پینا، لباس اور رہائش بھی مفت میسر ہوگی۔ علمائے حق فرماتے ہیں کہ مرد کے ذمے جو بیوی بچوں کا نان نفقہ ہے اس کی تفصیل قرآن نے ان چار چیزوں سے کی ہے، رہائش، لباس اور کھانا پینا یہ مرد کی ذمہ داری ہے کہ اُن کی حفاظت بھی کرے اور انہیں زمانے کی گرمی و سردی سے بھی بچائے۔

ابلیس کا وسوسہ:

فرمایا: فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ﴿۱۲۰﴾

لیکن شیطان نے انہیں وسوسہ ڈالا، دھوکا دیا۔ وہ وسوسہ کیا تھا؟ کہنے لگا، اے آدمؑ میں آپ کو ایسا درخت بتاتا ہوں جس کا پھل کھانے سے آپ ہمیشہ یہیں رہیں اور جنت میں جو آپ کو عیش و آرام اور بادشاہی نصیب ہے اس کو دوام مل جائے۔ یہ پہلی دشمنی تھی جو ابلیس نے آدم علیہ السلام سے کی۔ ابلیس چونکہ مردود ہو چکا تھا اور وہ جنت خواہ برزخ میں تھی، مگر جنت تو تھی وہاں نہیں جاسکتا تھا۔ علمائے تفسیر فرماتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت تک ابلیس اور جنات کا آسمانوں تک آنا جانا لگا رہتا تھا۔ سورۂ جن میں جنات کی یہ بات نقل فرمائی گئی ہے کہ وہ آسمانوں میں چھپ کر بیٹھ جاتے تھے اور فرشتوں کی باتیں سن لیتے اور کچھ نہ کچھ سن گن لے آتے اور کاہنوں اور جوتشیوں کو بتاتے تھے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثتِ عالی کے بعد اب اگر ہم آسمانوں کے قریب جائیں تو شہابِ ثاقب لپکتا ہے اور ہم پر آگ برسائی جاتی ہے، ہم پر آسمانوں کے دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ گویا نزولِ آدم علیہ السلام سے لے کر حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثتِ عالی تک جنات کی رسائی بھی آسمانوں تک تھی خواہ آسمان اوّل کے قریب پہنچ جاتے ہوں اور کہیں اپنی جگہ بنا کر بیٹھ جاتے ہوں گے۔ مفسرین فرماتے ہیں ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام سے آسمان سے بات کی اور انہیں یقین دلایا کہ یہ پھل کھانے سے انہیں جنت میں دوام مل جائے گا۔

یہ سوال اکثر پوچھا جاتا ہے کہ ہمیں بہت وساوس آتے ہیں تو اس کا جواب یہی ہے کہ اگر حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں وسوسہ آ گیا تو ہم کس کھیت کی مولی ہیں کہ ہمیں زمین پر وسوسہ نہ آئے؟

وساوس کا علاج:

اللہ کریم نے بطفیلِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم اس اُمت پر یہ آسانی فرمائی ہے کہ وسوسہ آنا گناہ نہیں ہے البتہ وسوسہ لانا گناہ ہے، یعنی اس وسوسے کو سوچنے لگ جانا گناہ ہے۔

شرعی قاعدہ یہ ہے کہ وسوسہ آئے تو اسے ردّ کر دیا جائے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کے ایک ارشادِ عالی کا مفہوم ہے کہ وسوسہ ردّ کرنے والے کو جہاد کا ثواب ملتا ہے۔ ایک شمشیر بکف مجاہد کو اللہ کی راہ میں جہاد کا ثواب ملتا ہے، ویسا ہی ثواب وسوسہ ردّ کرنے والے کو ملتا ہے۔

وسوسے کا واحد علاج یہی ہے کہ اسے سوچنا نہ شروع کریں بلکہ ردّ کر دیں اور اپنی سوچ کو دوسری طرف لے جائیں کہ انسانی دماغ بیک وقت دو باتیں نہیں سوچ سکتا، یہ فطرتِ انسانی کا تقاضا ہے۔ اگر دورانِ صلوٰۃ وسوسہ آتا ہے

تو کم از کم صلوٰۃ میں پڑھے جانے والی سورتوں کے معنی ہی یاد کر لیے جائیں اور جب صلوٰۃ کی ادائیگی کر رہے ہوں تو اس کے معنی پر غور کرتے جائیں۔ چونکہ دماغ دو طرف نہیں سوچ سکتا لہٰذا معنی کی طرف مصروف ہو جائے گا یہ علاج اکثر علمائے کرام نے تجویز کیا ہے۔

لیکن افسوس کہ لوگ نماز کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ اتنا تردّد بھی نہیں کرتے کہ کسی قاری سے یا مولوی صاحب سے الفاظ کی اصلاح ہی کرالیں۔ وہی جو نانی یا دادی نے بچپن میں سکھا دیے اسی پر رہتے ہیں۔ ساری زندگی الفاظ کی اصلاح نہیں کرتے تو معنی یاد کرنا تو دور کی بات ہے۔

ہمارا المیہ:

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمیں اس کی قدر و قیمت کا شعور نہیں ہے، اس کی عظمت کا شعور نہیں ہے۔ جب کسی چیز کی قیمت کا علم نہ ہو تو انسان اس کی پروا نہیں کرتا، اُسے فرق ہی نہیں پڑتا کہ اس چیز کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔

اگر ہمیں صلوٰۃ کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جائے تو ہمارا کوئی لمحہ نماز سے باہر نہ گزرے اور دل یہی چاہے کہ ہمہ وقت نماز ہی پڑھتے رہیں۔ اللہ کریم نماز کی عظمت کا شعور عطا فرمائیں۔

ایک غلط فہمی کی تصحیح:

شیطان نے وسوسہ ڈالا اور کہنے لگا کہ اے آدمؑ! میں آپ کو ایسا درخت بتاتا ہوں جس کا پھل کھانے سے آپؑ ہمیشہ یہیں مقیم رہیں گے۔ اس نے اس بات پر اللہ کی قسمیں بھی کھائیں۔

لوگوں میں یہ ایک قصہ بن گیا ہے کہ وہ پھل اماں حوا نے کھایا اور آدھا کاٹ کر حضرت آدم علیہ السلام کے لیے رکھ لیا اور پھر انہیں مجبور کیا کہ وہ بھی کھائیں، چنانچہ انہوں نے کھا لیا۔ یہ محض قصے کہانیاں ہیں جبکہ قرآن کریم میں اللہ کریم فرماتے ہیں کہ دونوں نے کھا لیا یہ نہیں فرمایا کہ صرف اماں حوا نے کھا لیا اور پھر آدم علیہ السلام کو کھلایا۔ فَاَكَلَا۔۔۔ کے معنی یہ ہیں کہ بیک وقت دونوں نے کھا لیا۔

حیا فطرتِ انسانی ہے:

فرمایا: فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؗ وَعَصٰٓى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿١٢١﴾ شیطان کے وسوسے میں آ کر جیسے ہی دونوں نے وہ پھل کھایا، پہلی بات یہ ہوئی کہ جنت کا لباس فوری طور پر اتر گیا، جس نے دونوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ بعض علما نے لکھا ہے کہ ہمارے ناخن اس لباس کی نشانی رہ گئی ہے، پہلے سارا وجود اسی طرح کا سنہری تھا اور باپردہ تھا۔

جب وہ پھل کھایا تو اس کے اثر سے اُن کا لباس اتر گیا، ستر ظاہر ہو گئے، اعضاو جوارح ظاہر ہو گئے تو آدم علیہ السلام اور اماں حوا کا فوری اور پہلا ردِ عمل یہ تھا کہ انہوں نے درخت کے بڑے بڑے پتے توڑ کے اپنے ستر کو ڈھانپ لیا۔ گویا یہ مزاج انسانی ہے، فطرتِ انسانی ہے کہ ستر کو ڈھانپ کر رکھا جائے، ورنہ آدم علیہ السلام ابھی نبیؑ مبعوث نہیں ہوئے تھے اور وہاں کوئی شرعی حکم نہیں آیا تھا۔ لیکن جیسے ہی ستر کھلے دونوں نے بڑے بڑے پتوں سے اپنے ستر ڈھانپ لیے اس لیے کہ یہی فطرتِ انسانی ہے۔ تہذیب مغرب میں عریانی کیسے آئی، اگر اُن سے پوچھیں تو کہتے ہیں کہ جب سارے جانور ویسے ہی رہتے ہیں جیسے پیدا ہوئے تھے تو ہم بھی جیسے پیدا ہوئے تھے، ویسے ہی نظر آئیں گے، ہم کیوں لباس پہنیں۔ گویا آج جس تہذیب کی دنیا دیوانی ہو رہی ہے، اس نے یہ عریانی جانوروں سے، کتوں، خنزیروں سے حاصل کی ہے۔ جبکہ انسانی فطرت کا خاصہ سترِ عورت ہے۔

ایک انتہائی نازک معاملہ:

فرمایا: وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ آدم علیہ السلام سے اللہ کے حکم کے خلاف صادر ہو گیا اور وہ غلطی میں پڑ گئے۔ اللہ کریم نے یہ ارشاد فرمانے سے پہلے اُن کی صفائی دی وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ﴿۱۱۵﴾ کہ ہم نے اُن کے دل میں گناہ کا ارادہ نہیں پایا، شیطان نے وسوسہ ڈالا اور آدم علیہ السلام اس کے دھوکے میں آ گئے۔

مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ یہ شان صرف اللہ کریم کی ہے کہ وہ آدم علیہ السلام کو یہ بات کہیں کہ وَعَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ﴿۱۲۱﴾ صرف اللہ ہی کہہ سکتے ہیں، ہم نہیں کہہ سکتے۔ ہم تلاوت تو کر سکتے ہیں لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ آدم علیہ السلام عاصی تھے تو ایسا کہنا حرام ہوگا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی بیٹی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے والد سے کہا: يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ۔۔۔ (القصص: 26) کہ انہیں اجیر رکھ لیں، یہ مضبوط اور دیانتدار ہیں۔ اب اگر کوئی فاعل بنا کر موسیٰ علیہ السلام کو اجیر کہے تو ایسا کہنا حرام ہے۔ اللہ کریم کہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ اُن کے نبیؑ ہیں لیکن کوئی انسان نہیں کہہ سکتا۔

اسی طرح یونس علیہ السلام نے خود فرمایا: لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (الانبیآء: 87) 'اے اللہ تیرے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے تو پاک ہے میں ظالموں میں سے ہوں' اس آیہ مبارکہ کی تلاوت کرنے سے ثواب ہوگا۔ لیکن اگر کوئی یونس علیہ السلام کو ظالم کہے تو یہ حرام ہوگا اور وہ گناہگار ہوگا۔ یہ معاملہ اللہ اور اس کے نبیؑ کے درمیان ہے۔ جو اللہ کریم فرما سکتے ہیں، وہ اس کی شان کے لائق ہے، وہ اُن کا معبود ہے، اللہ جانے اللہ کے نبیؑ جانیں، ہم ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔ ہمیں اپنی حیثیت پہچاننی چاہیے اور جب

انبیاؑ کی بارگاہ کی بات ہو تو اس کا ادب ملحوظ رکھنا چاہیے۔

بعض مترجمینِ قرآن نے اس آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے کہ آدم علیہ السلام نے اللہ کی نافرمانی کی اور گمراہ ہو گئے۔ یہ ترجمہ درست نہیں ہے، ایسا نہیں کہنا چاہیے، یہ صحیح نہیں ہے۔ اکرم التراجم میں اس آیت کے ترجمے میں بہت احتیاط کی گئی ہے اور الحمد للہ، اللہ کی توفیق سے بزرگانِ دین کے تراجم دیکھ کر اُن کو جمع کیا گیا ہے اور لکھا ہے ''اور آدم (علیہ السلام) نے اپنے پروردگار کے حکم کے خلاف کیا تو غلطی میں پڑ گئے۔''

اللہ کریم نے خود اتنی احتیاط فرمائی کہ آدم علیہ السلام سے جو کوتاہی ہوئی اس کا تذکرہ کرنے سے پہلے اُن کی صفائی دی کہ اُن کے دل میں گناہ کا ارادہ نہیں پایا تھا، تو پھر کسی بندے کی کیا حیثیت ہے کہ وہ اعتراض کرے۔

فرمایا: ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى ﴿١٢٢﴾ پھر اللہ کریم نے اُنہیں قبول کر لیا، منتخب کر لیا اور اُن پر پوری رحمت اور توجہ مبذول کر دی اور انہیں نیک سیدھے راستے پر قائم کر دیا۔ یعنی جو بھول ہونی تھی وہ ہو گئی، اللہ کریم نے ان پر پوری توجہ فرمائی، انہیں اپنا زیادہ مقبول بنا لیا اور آئندہ کے لیے انہیں ہدایت پر قائم کر دیا۔

زمین پر نزول:

فرمایا: قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا ۔۔۔ یہ جنت تو عارضی ٹھکانہ تھا، آپؑ کو دوست دشمن کی تمیز کرانی تھی اور زندگی کا تجربہ کرانا تھا، تو اب یہاں سے سب زمین پر چلے جاؤ اور! اُسے آباد کرو۔ اے آدم (علیہ السلام)! ہم نے آپ کو یہاں تجربہ کروا دیا کہ شیطان نے آپ (علیہ السلام) کو دھوکا دے کر کہاں پہنچا دیا، تو اب یہ بھی یہاں نہیں رہ سکتا۔ آپ علیہ السلام زمین پر زندگی بسر کریں اور یاد رکھیں: بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۔۔۔ انسان اور شیطان آپس میں دشمن ہیں اور یہ انسان کا ازلی دشمن ہے۔ قرآن کریم بتا رہا ہے کہ اے انسانو! یہ تمہارا دشمن ہے، کہاں سے دشمنی پر کاربند ہوا اور قیامت تک دشمنی کرتا چلا جائے گا تو اس کی بات مت مانو۔ تم میں سے بعض بعض کے دشمن ہیں، یعنی انسان اور شیطان میں ہمیشہ دشمنی رہے گی۔

اللہ کریم کا احسان:

فرمایا: فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۔۔۔ ہاں اے آدم (علیہ السلام) ہم اپنی رحمت سے آپ کی اولاد کو محروم نہیں رکھیں گے اور ہماری طرف سے ہدایات آتی رہیں گی۔ مفسرین کرام لکھتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کے عہد میں کھیتی باڑی کرنا، فصل سنبھالنا، زراعت کرنا یہی عبادت تھی اور یہ نماز، روزے کے قائم مقام تھے۔ انسان کو سکھایا جا رہا تھا کہ روزی کیسے پیدا کرنی ہے۔ کاشتکاری وہ پہلا ہنر ہے جو انسان کو سکھایا گیا۔ جبرائیل امین نے آدم علیہ السلام کو

یہ ہنر سکھایا۔ اس کے بعد جوں جوں انسانیت بالغ ہوتی گئی، لباس بدلتے گئے افراد بڑھتے گئے، معاشرت بڑھتی گئی اور معاملات بڑھتے گئے۔ کاروبار اور تجارت کا سلسلہ شروع ہوئی اور آپس کی لین دین اور معاملات شروع ہوئے، لوگ ایک دوسرے کے کام آنے لگے اور انسانیت بلوغت کی طرف چلتی رہی۔ جتنی بلوغت انسانیت میں تھی، اس معیار کے مطابق اللہ کریم کے انبیاؑ اللہ کی ہدایات لے کر تشریف لاتے رہے۔ جب انسانیت بالغ ہو گئی تو اللہ کریم کے وہ نبیؐ تشریف لائے صلی اللہ علیہ وسلم جس کے بعد نہ انسانیت اس بلوغت سے آگے جا سکتی ہے، نہ اسے نئے نبیؐ کی ضرورت ہے۔ ایک سوال جو اکثر پوچھا جاتا ہے کہ اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امام الانبیاءؑ بنانا تھا تو آخر میں کیوں مبعوث کیا، شروع میں کیوں نہیں کیا گیا؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ سوال پوچھنے والا اپنی حیثیت بھول جاتا ہے اور اللہ پر سوال کر رہا ہے کہ اللہ نے ایسا کیوں کیا حالانکہ وہ اللہ کے سامنے جوابدہ ہے، نہ کہ اللہ اس کے سامنے۔ اس سوال کا جواب یہ تھا کہ مشکوٰۃ شریف میں ایک حدیث مبارکہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کا مفہوم ہے کہ نبوت ایک خوبصورت عمارت تھی جس کی دیوار میں ایک خلا باقی تھا۔ یعنی اگر کوئی اس خوبصورت عمارت کو دیکھنے آئے اور اس عمارت کے گرد گھومے اور چکر لگائے اس کی بلندی چمک دمک اور حسن کو دیکھ کر مسحور ہو اور اسے دیوار میں ایک جگہ خالی نظر آئے، وہ سوچے کہ یہاں ایک بڑا پتھر ہونا چاہیے تھا، یہاں ایک سِل ہونی چاہیے تھی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، وہ پتھر یا سِل میں ہوں۔ جب میں (صلی اللہ علیہ وسلم) مبعوث ہو گیا تو وہ جو خلا تھا نبوت کی عمارت میں وہ پُر ہو گیا اور عمارت مکمل ہو گئی۔ ہم اسے ختمِ نبوت کہتے ہیں تو اس سے مغالطہ لگتا ہے، اگر اسے تکمیل نبوت کہا جائے تو غلط فہمی دور ہو جائے کہ نبوت مکمل ہو گئی۔ اب اس میں کسی نئے نبیؐ کی گنجائش ہی نہیں ہے۔ کتنی خوبصورت مثال دی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو سوال کرنے والے کے لیے یہی جواب تھا کہ تکمیل کا آخری پتھر ہمیشہ آخر میں ہی لگتا ہے۔ کبھی کسی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ گھر بنایا ہے تو یہ پتھر آخر میں کیوں لگایا ہے شروع میں لگایا ہوتا پھر عمارت بنتی رہتی؟ ایسے فضول سوال نہیں سوچنے چاہئیں، بلکہ اللہ کے روبرو اپنی جوابدہی کی تیاری کرنی چاہیے۔

آج دنیا کو GLOBAL VILLAGE کہا جاتا ہے جبکہ آج سے چودہ صدیاں قبل اللہ کریم کی طرف سے گلوبل ہدایات آنا شروع ہو گئیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس وقت کھڑے ہو کر پوری دنیا کی انسانیت کو پکارا اور فرمایا: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا (الاعراف:158) اے اولادِ آدم! میں تم سب کے لیے اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہوں۔

وعدۂ الٰہی:

اللہ کریم نے آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ اللہ اُن کی اولاد کی طرف ہدایات بھیجتے رہیں گے، انبیاؑ آتے رہیں

گے کتابیں آتی رہیں گی اور ساتھ یہ اصول بھی ارشادفرمایا: فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَلَا یَشْقٰی ﴿۱۲۳﴾ کہ جوان ہدایات کوقبول کر کے ان کی پیروی کرے گا، وہ نہ تو گمراہ ہوگا اور نہ ہی بد بخت ہوگا۔ گویا اللہ کریم نے یہ ضمانت دے دی کہ یہاں تو شیطان نے دھوکا دے دیا لیکن جب آدم علیہ السلام کی اولاد زمین پر بسے گی اور اُن کے پاس اللہ کی طرف سے ہدایات آئیں گی تو جو اُن احکامات کی پیروی کرے گا اُسے شیطان گمراہ نہیں کر سکے گا۔ یہ بہت بڑی ضمانت ہے جواللہ کریم نے عطا کر دی ہے۔

ایک خوفناک وعید:

فرمایا: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰی ﴿۱۲۴﴾ اور جس نے میری نصیحت سے اعراض کیا، اس سے توجہ ہٹالی، اس پر غور ہی نہ کیا تو اسے دنیا میں سکھی نہیں رہنے دوں گا، اس کی روزی تنگ ہو جائے گی اور وہ قیامت کے روز اندھا کر کے اٹھایا جائے گا۔

روزی تنگ ہونے سے کیا مراد ہے؟

کیا روزی تنگ ہو جانے سے مراد ہے کہ اسے کم روزی ملے گی؟ نہیں ایسا نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد ہے کہ اس کی بھوک نہیں مٹے گی اور دیکھا جائے تو زیادہ غریب تو وہ ہیں جن کے پاس کھربوں روپیہ ہے اس کے باوجود ہر وقت اسی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں کہ ادھر سے بھی لوٹ لیں اُدھر سے بھی لوٹ لیں۔ یہ عذاب الٰہی ہے اُن کی روزی تنگ کر دی گئی ہے۔ اُن کے مکان سونے سے بھرے پڑے ہیں، نوٹوں سے بھرے پڑے ہیں پھر بھی یہی چاہتے ہیں کہ کسی غریب کے پیسے چھین لیں، ملازموں کی تنخواہ میں سے کچھ پیسے کاٹ لیں تو یہ ہوتی ہے: مَعِیْشَةً ضَنْكًا۔۔۔تنگ روزی کہ اربوں کے مالک ہوتے ہیں لیکن بھوکے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ جب اربابِ اختیار بنتے ہیں تو غریب عوام کو زندگی کے وسائل مہیا نہیں کرتے، نہ ہی اُن کے جان، مال اور آبرو کی حفاظت کرتے ہیں بلکہ اُن کا حصہ اور مال بھی غصب کر لیتے ہیں۔ جب معیشت تنگ کر دی جائے تو کھاتے پیتے لوگ سارا دن کھاتے ہیں پھر بھی بھوکے ہی رہتے ہیں۔ دولت جمع کر کے مکان سونے اور پیسوں سے بھر لیتے ہیں اور پھر مزید لوٹنے کے چکر میں ہوتے ہیں۔ یہ حقیقی مفلس ہوتے ہیں اور پھر اللہ کی طرف سے ایسی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کچھ کھا پی نہیں سکتے یا کپڑے سے الرجی ہو جاتی ہے کہ اگر اس طرح کا کپڑا پہنیں تو جسم پر چھالے پڑ جاتے ہیں۔ ہر چیز گھر میں رکھی ہوتی ہے کھا پی نہیں سکتے۔ جب بندہ کوئی چیز استعمال نہیں کر سکتا تو اس کے لیے اس چیز کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ معیشت کا تنگ ہو جانا یہ ہے کہ دولت کے انبار لگے ہوں لیکن بندے کو ہوس کھا رہی ہے۔ وہ بھاگ رہا ہے کہیں سے، کسی سے

چھین لے حتیٰ کہ ملازموں کی تنخواہیں تک ہڑپ کر جاتے ہیں۔ تنخواہ سے ہزار کاٹ لیتے ہیں۔ فرمایا، ایسے لوگوں کو وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾ قیامت کے روز اندھا اٹھایا جائے گا، ان کی بینائی نہیں ہوگی۔

اللہ کریم فرما رہے ہیں: وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ۔۔۔ جو میری یاد سے منہ پھیرے گا، میری نصیحت کو خاطر میں نہیں لائے گا، اس کی روزی تنگ کر دوں گا اور قیامت کو جب اُٹھے گا تو میں اُسے اندھا اٹھاؤں گا۔ ذکر کیا ہے؟ ذکر سے مراد نصیحت بھی ہے، ان معنوں میں قرآن کریم ذکر ہے۔ قرآن کریم کی تفسیر جو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمائی یعنی حدیث شریف ذکر ہے۔ اللہ کی ذات کا ذکر کرنا، ذکر اسم ذات ذکر ہے۔ اللہ کو یاد رکھنا، ہر کام کرتے وقت ہر موقعہ پر یہ یاد رکھنا کہ اس کام کو کرنے کا اللہ نے کون سا طریقہ ارشاد فرمایا ہے تو یہ ذکر ہے یعنی ذکر سے مراد ہے یاد رکھنا۔

اعراض:

اعراض کا لفظی معنی ہے منہ پھیر لینا اور منہ پھیر لینے سے مراد یہ ہے کہ ہم اس طرف متوجہ ہی نہیں ہونا چاہتے۔ ہمیں اس کی پرواہ ہی نہیں ہے، ہم اُسے دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔ فرمایا جب قیامت کو ہم ان اعراض کرنے والوں کو اٹھائیں گے تو وہ اندھے ہوں گے، ان کی بینائی نہیں ہوگی۔ تو وہ عرض کریں گے: قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾ اللہ آپ نے مجھے اندھا کیوں کر دیا؟ میں جب مرا تھا تب تک تو میری بصارت ٹھیک تھی، میری نظر ٹھیک تھی تو دنیا سے تو میں نظر لے کے آیا تھا اور آپ نے حشر میں مجھے اندھا کھڑا کر دیا۔ ارشاد ہوگا: قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا کہ دنیا میں دین، ہمارے احکامات، ہماری نصیحتیں، زندگی گزارنے کا سلیقہ تمہارے پاس پہنچا تھا لیکن فَنَسِيْتَهَا۔۔۔ تم نے اس کی پرواہ ہی نہ کی، تم نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں تو تمہیں نظر کی کیا ضرورت ہے؟ جب تم نے حق کی طرف دیکھنے کا تکلف بھی گوارا نہیں کیا، کبھی بیٹھ کر یہ سوچا تک نہیں، کبھی اتنا وقت بھی نہیں نکالا کہ حق و باطل کا فرق دیکھ لیا جائے اور حق کی ضرورت کا ادراک اور اُسے اپنانے کی کوشش کی جائے۔ جب تم نے بینائی سے وہ کام ہی نہیں لیا جس کے لیے عطا ہوئی تھی اور اپنی ہوس ہی پوری کرتے رہے اور حق کو نہیں پہچانا تو پھر تمہیں اندھا ہی ہونا چاہیے۔ جیسے تم نے نصیحت بھلا دی، میری یاد سے منہ پھیر لیا ویسے ہی: وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾ آج ہم نے تمہیں بھلا دیا ہے، یعنی تمہیں ایسا کر دیا ہے جس طرح کسی چیز کی پرواہ نہیں ہوتی کہ وہ کہاں جاتی ہے، کہاں گرتی ہے، ٹوٹ جاتی ہے یا کوئی لے جاتا ہے، کہاں ہلاک ہوتی ہے۔ دنیا میں جب تم نے ہماری آیات، ہمارے احکامات، ہمارے رسولؐ اور رسولؐ کے ارشادات، ہماری یاد،

ہماری عظمت کی کبھی پروانہیں کی تو آج ہمیں تمہاری کوئی پروانہیں ہے کہ کہاں ہلاک ہوتے ہو، کیا انجام ہوتا ہے۔

جب اللہ کریم کی طرف اس طرح کے افعال منسوب ہوتے ہیں جیسے تُنْسٰی۔۔۔ کہ ہم نے تمہیں بھلا دیا تو اس سے معنیٰ بعید مراد ہوتا ہے۔ ہر لفظ کے دو معنی ہوتے ہیں، ایک فوری معنی جو سمجھ آتا ہے جیسے یہاں یہ سمجھ آتا ہے کہ بُھلا دیا، یاد نہیں رہا۔ دوسرا معنی بعید ہوتا ہے یہ ہے کہ جس چیز کو ہم بھول جاتے ہیں، اس کی پرواہی نہیں رہتی کہ وہ کہاں گئی، کس حال میں کہاں پڑی ہے، ٹوٹ گئی ہے یا گرد آلود ہے۔ جب یاد ہی نہیں رہی تو پروا کیونکر ہوگی؟ جب اللہ کی طرف ایسے اوصافِ منسوب کیے جائیں تو مراد معنیٰ بعید ہوتا ہے کہ اللہ کی ذات پاک ہے، قابلِ حمد وثنا ہے، اور اس کا علم حضوری ہے، وہ بھول نہیں سکتا۔ جو اس کے احکامات اور ذکر کو بھلا دیتا ہے تو اللہ بھی اس کی پروانہیں کریں گے کہ وہ کیا انجام بھگتے گا اور کہاں ہلاک ہوگا۔

اسراف کیا ہے؟

فرمایا: وَ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ۔۔۔ جو حد سے گزر جاتے ہیں ان کو یہی بدلہ دیا جاتا ہے۔ اَسْرَفَ جو حد سے گزر گیا، جو بے پروا ہو گیا اور جو دل میں آیا کر گزرا، جو شیطان نے کہا، جو نفس نے کہا وہ کر گزرا اور اللہ کے احکام کی پروا نہ کی تو ایسے حد سے گزرنے والوں کو ان کے اعمال کا ایسا ہی بدلہ دیا جاتا ہے۔ اسی سے اسراف بھی ہے یعنی بے جا خرچ کرنا، حد سے زیادہ خرچ کرنا۔

یاد رہے کہ خطا کا ہو جانا انسانی کمزوری ہے۔ بشری کمزوری سے غلطی ہو جاتی ہے لیکن بندے کو احساس ہوتا ہے کہ اُسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا تو وہ رجوع الی اللہ کرتا ہے اور اپنی غلطی کا اقرار کرتا ہے، توبہ کرتا ہے اور اپنی اصلاح کرتا ہے۔

اسراف یہ ہوتا ہے کہ بندے کو پرواہی نہ ہو کہ اللہ کا حکم کیا ہے، شریعت کیا ہے، اس کی حدود کیا ہیں اور وہ کہاں جا رہا ہے؟ فرمایا جو اسراف کرتا ہے وہ: وَلَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ۔۔۔ اللہ کے احکام پر ایمان ہی نہیں رکھتا کیونکہ ایمان تو اسی اعتبار اور یقین کا نام ہے جو ان احکامات کو حق سمجھتے ہوئے پیروی کی قوت عطا کرتا ہے۔ جو ایمان رکھتا ہو وہ تو پیروی کی کوشش کرتا ہے تو پھر جو پرواہی نہیں کرتا اور من مانی کرتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کا ایمان ہی نہیں ہے، اُسے یقین ہی نہیں ہے۔ اور پھر یہ تو دنیا اور میدانِ حشر کی رسوائیاں ہیں جبکہ: وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَاَبْقٰى ﴿۱۲۷﴾ آخرت کا عذاب، جس کا فیصلہ حشر میں ہوگا اور جس میں ایسے لوگ داخل ہوں گے، وہ بہت شدید ہوگا اور مصیبت یہ ہے کہ وَاَبْقٰى وہ ہمیشہ رہنے والا ہے۔ یعنی آخرت میں جو عذاب ملے گا، وہ نہ صرف یہ کہ بہت شدید ہوگا

بلکہ اس کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ رہے گا، اس سے جان نہیں چھوٹ سکے گی۔

دعوتِ فکر:

فرمایا: اَفَلَمْ يَهْدِ لَهُمْ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنَ الْقُرُوْنِ۔۔۔ کیا ان لوگوں کو اس بات سے کوئی سبق نہیں ملتا کہ ان سے پہلے دنیا میں کتنے لوگ آئے اور ہلاک ہوئے۔ کیا یہ بات ان کی ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے؟ کیا سمجھنے کے لیے یہ بات کم ہے کہ ان سے پہلے کتنی قومیں ہلاک کردی گئیں، سلطنتیں اُلٹ گئیں، حکومتیں الٹ گئیں، شہر الٹ گئے، آسمان سے آگ برسی، طوفان میں غرق ہوئے۔ اُن ویران بستیوں کے آثار موجود ہیں اور يَمْشُوْنَ فِيْ مَسٰكِنِهِمْ۔۔۔ آج کے لوگ ان کے آثار میں چلتے پھرتے ہیں، اُن کی اجڑی ہوئی ویران بستیوں کو دیکھتے ہیں، کیسے کیسے محلات کے کھنڈرات ان کے سامنے ہیں۔ یہ دیکھتے ہیں کہ کیسے عظیم لوگ تھے جنہوں نے یہ محل بنائے جو اُن کی کاریگری کا شاہکار ہیں تو وہ آخر کہاں چلے گئے؟ کتنے طاقتور حکمران تھے کتنی عظیم عمارتیں انہوں نے تعمیر کروائیں، اُن کے محل تو محل ہیں اُن کے مقبرے بھی یادگار ہیں۔ جب لوگ وہاں چلتے پھرتے ہیں اُن کے قلعوں اور رہائش گاہوں، اُن کے مقبروں میں اُن کے ویران شدہ کھنڈرات میں، تو یہ نہیں غور کرتے کہ یہ سب کہاں چلے گئے، ان کے ساتھ کیا ہوا؟ یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ یہ سب بھی دنیا سے رخصت ہو کر اللہ کے حضور جا چکے اور ہمیں بھی اللہ کے حضور جانا ہے۔ فرمایا: اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾ ان آثار اور قرآن میں اُنہی لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو دانشور ہیں، عقل مند ہیں۔ ہم تو اس کو دانش مند سمجھتے ہیں جو دنیا کے معاملات سمجھتا ہو لیکن عند اللہ دانشور وہ ہے، جو دنیا کو دیکھ کر آخرت کا اندازہ کر لے، اور احوالِ دنیا کو دیکھ کر آخرت پر پختہ یقین ہو جائے کہ مجھے بھی اللہ کے روبرو جانا ہے اور یہ فکر دامن گیر ہو کہ میں نے وہاں کے لیے آگے کیا بھیجا ہے؟ کیا وہاں میں نے اپنے لیے گھر بنایا ہے؟ گھر بنایا جا سکتا ہے، کیا وہاں اپنے لیے لباس اور خوراک کا بندوبست کیا جا سکتا ہے؟ اگر ایسا کیا جا سکتا ہے تو کیسے کیا جاتا ہے؟ دنیا میں تو بچپن والدین کے سہارے گزر گیا، جوانی محنت مزدوری کرتے گزر گئی اور بڑھاپا اولاد کے آسرے پر گزر گیا بات ختم ہوگئی۔ وہاں تو زندگی کبھی ختم ہی نہیں ہوگی لہٰذا وہاں تو ایسا گھر چاہیے جو ہمیشہ رہنے والا ہو، وہاں ایسا رزق چاہیے جو کبھی ختم نہ ہو اور ہمیشہ ملتا رہے۔ وہاں نہ والدین کچھ دیں گے نہ ہی اولاد دے گی، نہ کوئی پوچھنے والا ہوگا نہ دینے والا ہوگا، وہاں تو ابدالآباد یکہ وتنہا اسی توشۂ آخرت پر گزارہ کرنا ہے جو اپنے لیے یہاں سے کمایا ہے، لہٰذا عقلمند وہ ہے، جو یہ فکر کرے کہ اس نے اس حیاتِ ابدی کے لیے کیا سامان کیا ہے۔ ہم ساری زندگی دنیا میں گھر بنانے کے لیے ایک ایک اینٹ کے لیے سرمایہ جمع کرتے رہتے ہیں تو کچھ اینٹیں وہاں بھی لگانی چاہئیں۔ اسی

طرح ساری عمر یہاں کے لیے روزی تلاش کرتے رہتے ہیں، تو کچھ رزق وہاں کے لیے بھی جمع ہونا چاہیے۔ تو جن کی عقل سلامت ہوتی ہے وہ سوچتے ہیں کہ مرنے والے کی شان و شوکت اور دبدبہ کیا ہوگا۔ جس کی قبر بھی محل نما ہے، پھر وہ اب کہاں چلا گیا ہے؟ اب کیا کر رہا ہے وہاں؟ کیا وہاں اس کے پاس کوئی سلطنت ہے؟ کیا اس کے پاس اب کوئی محل ہے، لاؤ لشکر ہے یا خود قیدی بنا ہوا ہے؟ کیا یہ غور و فکر نصیب ہوا ہے کہ میں نے ایک دن جانا ہے اور میں نے کیا کیا؟ فرمایا: لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۱۲۸﴾ جن کی عقل سلامت ہے، اُن کے لیے تو اس میں بڑی نشانیاں اور دلیلیں ہیں اور جن کی عقل ہی ماری گئی ہے، وہ صرف دنیا کے پیچھے لگ گئے ہیں اور آخرت کو بھولے ہوئے ہیں۔ دنیوی کمالات کو قرآن دانش نہیں کہتا، یہ کمالات بھی فانی ہیں، چیزیں بھی فانی ہیں تو پھر ان سے کیا حاصل؟ دانش یہ ہے کہ اس دنیا کی چیزوں سے تعمیرِ آخرت کا سبق لے اور وہاں اپنا گھر بنائے، جگہ بنائے، یہاں سے جائے تو وہاں اپنے گھر میں چلا جائے، بہترین گھر ہو وہاں بستر ہوں، لباس ہوں کھانا پینا ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

ایک روایت ہے کہا جاتا ہے کہ اہل اللہ مرتے نہیں ہیں۔ گھر سے دوسرے گھر میں منتقل ہو جاتے ہیں یعنی موت ایسی ہو کہ بندہ ایک گھر سے دوسرے گھر میں چلا جائے۔ ایسی تیاری کرنے والے کو اللہ کریم دانش مند کہتے ہیں کہ اس نے اپنی عقل اور شعور کو صحیح استعمال کیا۔ جو ایسا نہیں کرتے، وہ عقل کے ہوتے ہوئے پاگل ہوتے ہیں۔ اور یہ کتنی عجیب بات ہے۔ ایک تو وہ پاگل ہے جس کے حواس مختل ہو جائیں اور ایک یہ پاگل ہے کہ حواس درست ہیں لیکن انہیں استعمال پاگلوں کی طرح کر رہا ہے۔ یہ فانی چیزیں اکٹھی کر رہا ہے اور اسی کے لیے تگ و دو کرتا ہے اور باقی رہنے والی زندگی کے لیے کچھ کرنے کا خیال ہی نہیں ہے۔ دنیا کمانے سے اللہ کریم نے منع نہیں کیا صرف یہ قید لگا دی کہ حلال اور جائز طریقے سے کمائی جائے۔ ایسا کرنے سے دنیا بھی ملے گی اور ساتھ تعمیرِ آخرت بھی ہوگی۔ جائز وسائل سے گھر بناؤ تو دنیا کے ساتھ ساتھ آخرت میں بھی گھر بن رہا ہوگا، حلال وسائل سے سواریاں خریدو، لباس پہنو، تو یہ سب آخرت میں بھی بن رہا ہوگا، کیونکہ یہ سب اتباعِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں کیا گیا۔ لیکن اگر انسان صرف دنیا میں ہی محو ہو جائے اور ہر جائز و ناجائز طریقے سے مال سمیٹنے لگے، تو اللہ کریم اُسے ایسی بھوک چمٹا دیتے ہیں کہ بھوکا ہی مر جائے گا خواہ کھرب پتی ہو، اس کی ہوس ہی نہیں مٹے گی۔

ایک حیرت انگیز حقیقت:

یہ بات گزر چکی کہ عہدِ رفتہ کی اقوام کے آثار بھی انسان کی ہدایت کا سامان بن سکتے ہیں کہ بڑے بڑے محلات، کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے۔ اگر غور کیا جائے تو سمجھ آتی ہے کہ اُس دور کے لوگ بھی مادی ترقی میں بہت آگے

تھے اور انہیں سائنسی ترقی اور عیاشی نے اس قدر مبہوت کر دیا تھا کہ احکامِ الٰہی کی طرف انہوں نے توجہ ہی نہیں دی۔
حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کا قصہ قرآن کریم میں ارشاد ہوتا ہے کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام کی باتوں کی پروا نہیں کرتے تھے اور بالآخر غرق ہو گئے۔ عموماً ایک تصور بنا ہوا ہے کہ وہ جاہل یا اجڈ لوگ تھے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ وہ لوگ TECHNOLOGY میں اتنے آگے تھے کہ آج کی دنیا بھی وہاں تک ابھی نہیں پہنچ پائی۔ ابھی حال ہی میں ایسے پتھر ملے ہیں جو حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے کے ہیں۔ تحقیق کرنے پر پتا چلا ہے کہ اس قوم نے ایک ایسا محلول (LIQUID) بنا لیا تھا جو ان خاص قسم کے پتھروں پر مل دینے سے وہ پتھر نرم ہو جاتے۔ پھر ان کو آٹے کی طرح گوندھ کر مختلف شکلیں بنا دیتے۔ جب دھوپ میں رکھتے تو وہ ساری روشنی جذب کر لیتے۔ یہ پتھر پھر ساری رات روشنی دیتے، تو اُن لوگوں نے ان پتھروں کی STREET LIGHTS رکھی تھیں اپنی گلیوں اور سڑکوں پر۔ جب اندھیرا ہوتا تو از خود روشن ہو جاتے اور جب سورج نکلتا تو CHARGE ہونا شروع ہو جاتے۔ ہماری آج کی SOLAR TECHNOLOGY ابھی وہاں نہیں پہنچی کہ اس کے لیے بیٹری اور تاریں اور بہت سے لوازمات چاہیں۔ لیکن قوم نوح نے پتھر کو ہی ایسا بنا دیا کہ وہ خود روشن ہو جاتا اور خود ہی RECHARGE ہو جاتا تھا۔ اہل مغرب کو اس قوم کے آثار سے ایک بوتل ملی، جس میں ایک تیل سا آمیزہ تھا لیکن وہ اُن سے ٹوٹ گئی اور وہ آمیزے پر تحقیق نہ کر سکے۔

جب حضرت نوح کشتی بنا رہے تھے تو اُن کی قوم کے امراء اور رؤسا وہاں سے گزرتے تو اُن کا مذاق اڑاتے تھے کہ بڑے میاں ریت پر کشتی چلائیں گے؟ قرآن کریم نے امرا اور رؤسا کا لفظ استعمال کیا ہے اس کا مطلب ہے کہ قوم میں بہت سے لوگ امیر، رئیس اور وسائل رکھنے والے تھے اور اُن کے پاس بہت اعلیٰ TECHNOLOGY تھی۔ وہ اس زعم میں تھے کہ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں، پھر انہیں کسی کی بات ماننے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ کہتے تھے کہ ہم اتنے ترقی یافتہ لوگ ہیں اور یہ ہمیں پھر سے پیچھے لے جانے کی باتیں کرتے ہیں کہ تم یوں پیدا ہوئے اور تمہیں عبادت کرنی چاہیے تو یہ سب تو جہالت کی باتیں ہیں۔

آج بھی یہی رویہ عام ہے کہ کسی سے دین کی بات کرو، نماز، روزے کی بات کرو تو کہتے ہیں یہ قدامت پسندی ہے۔ آج ہم سمجھتے ہیں کہ ہم بہت ترقی یافتہ ہیں لیکن موہنجوڈارو کے آثارِ قدیمہ کو دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ وہاں جو انسانی تہذیب آباد تھی، وہ بہت ترقی یافتہ تھی۔ اُن کے آثار سے پانی کے استعمال اور نکاسی کا مکمل نظام ملتا ہے اور یہ پتا چلتا ہے کہ وہ جاہل یا جنگلی لوگ نہیں تھے۔ اس زمانے میں بھی وہ جانتے تھے، گھر کیسے بنانے ہیں اور اُن کو کیسے پانی اور دیگر سہولیات دینی ہیں۔

ہمارے پاس مغل بادشاہوں کے آثار ہیں اور اگر اُن کی عمارتوں کو دیکھا جائے تو انہوں نے اُس دور میں

ایسا مصالحہ استعمال کیا کہ صدیاں اُسے پرانا نہیں کرسکیں۔ اُن دیواروں کی جو سفیدی کی گئی تھی وہ آج بھی سفید ہے۔ اُن پر جو کتابت کی گئی ہے آیات قرآنی کی یا اشعار کی یا نقشہ ونگاری کی گئی ہے، پانچ صدیوں کے بعد بھی اُن کا رنگ میلا نہیں ہوا۔ حالانکہ بارش اور دھوپ سے محفوظ نہیں ہیں۔ بادشاہی مسجد میں محراب پر آیات لکھی ہوئی ہیں اور وہ محراب بہت اونچا ہے تو کاتب نے اتنی مہارت سے اوپر سے نیچے تک آیات لکھی ہیں کہ وہ آیات کو جتنا اوپر لے کر جاتا گیا اتنا ہی حروف کو موٹا کرتا گیا کہ نیچے والے حروف کے برابر نظر آئیں یعنی اس نے انسانی نظر کو فاصلے سے کتنا فرق پڑتا ہے اس کا حساب اور اندازہ جانتے ہوئے کتابت کی تھی۔ یہ معمولی بات نہیں ہے۔ یہ فن آج کے ترقی یافتہ دور میں کسی کے پاس نہیں ہے کہ وہ اتنی گہرائی تک جائے۔ بادشاہی مسجد اور شاہی قلعہ دریا کے ایک طرف اور دریا کے دوسری طرف بادشاہ کا مقبرہ ہے، درمیان میں میلوں کا فاصلہ ہے۔ مسجد کے بھی چار مینار ہیں اور مقبرے کے بھی چار ہیں۔ اگر مسجد کے مینار سے مقبرے کو دیکھا جائے تو تین مینار نظر آتے ہیں، اسی طرح اگر مقبرے کے مینار سے مسجد کو دیکھیں تو تین مینار نظر آئیں گے، دو ایک لائن میں آجائیں گے اور پچھلا نظر نہیں آئے گا اور ذرا شائبہ نہیں ہوتا کہ پیچھے مینار ہے۔ یہ دو عمارتیں میلوں کے فاصلے پر بنی ہیں لیکن دیکھیں کہ ان میں کس قدر GEOMETRICALLY مہارت سے اندازہ رکھا گیا ہے۔ یہ بہت ہی عجیب بات ہے۔

جب ہم ان عمارات میں چلتے پھرتے ہیں تو غور کرنا چاہیے کہ یہ کیسے طاقتور حکمران تھے، کیسے عجیب لوگ تھے۔ اس قلعے سے بیٹھ کر پورے برصغیر پر حکومت کرتے تھے۔ انہی حکمرانوں میں سے ایک حکمران نے چند مہینوں میں برصغیر کے ایک شہر سے وطن عزیز کے شمال تک ایک عظیم شاہراہ تعمیر کی تھی۔ اس نے ایسی عمدہ منصوبہ سازی کی کہ آدھے آدھے میل کے ٹکڑے اُن آبادیوں کے مزدوروں سے بنوائی، جہاں جہاں سے وہ سڑک گزرتی گئی۔ یوں ایک دم ساری سڑک تیار ہوگئی اور پھر سڑک کے ساتھ سرائیں بنائی گئیں اور وہاں سرکاری سوار اور چوکیدار بھی رہتے تھے۔

سورۃ طٰہٰ رکوع 8 آیات 129 تا 135

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾ فَاصْبِرْ عَلٰى
مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ
وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى ﴿۱۳۰﴾ وَلَا تَمُدَّنَّ
عَيْنَيْكَ اِلٰى مَا مَتَّعْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ
لِنَفْتِنَهُمْ فِيْهِ ۭ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ﴿۱۳۱﴾ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ
عَلَيْهَا ۭ لَا نَسْــَٔـلُكَ رِزْقًا ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾ وَقَالُوْا
لَوْلَا يَاْتِيْنَا بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ اَوَلَمْ تَاْتِهِمْ بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى ﴿۱۳۳﴾
وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْلَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا
رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾ قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ
فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿۱۳۵﴾

اور اگر ایک بات آپ کے پروردگار کی طرف سے پہلے صادر اور (جزائے اعمال کے لیے) معیاد مقرر نہ ہو چکی ہوتی تو وہ (عذاب کا نزول) لازم ہو جاتا ﴿۱۲۹﴾ سو جو کچھ یہ کہتے ہیں اس پر صبر کیجیے اور اپنے پروردگار کی حمد کے ساتھ (اس کی) تسبیح کیجیے سورج نکلنے سے پہلے اور اس کے غروب ہونے سے پہلے اور رات کے اوقات میں بھی (اس کی) تسبیح کیجیے اور دن کے اول و آخر میں بھی (اس میں تمام نمازیں بھی آجاتی ہیں) تاکہ آپ (اس کی برکات سے) خوش ہو جائیں ﴿۱۳۰﴾ اور ہرگز ان چیزوں کی طرف اپنی آنکھیں اٹھا کر نہ دیکھیں (پروا نہ کریں) جن سے ہم نے ان

(کفار) کے طرح طرح کے لوگوں کو ان کی آزمائش کے لیے بہرہ مند کیا ہے کہ وہ (محض) دینوی زندگی کی رونق ہے۔ آپ کے پروردگار کی عطا کی ہوئی روزی (بہت) بہتر اور باقی رہنے والی ہے ﴿۱۳۱﴾ اور اپنے گھر والوں کو (متبعین کو) نماز کا حکم کرتے رہیے اور اس پر (خود بھی) قائم رہیے ہم آپ سے روزی نہیں چاہتے (بلکہ) آپ کو روزی ہم دیتے ہیں اور نیک انجام پرہیزگاروں کا ہے ﴿۱۳۲﴾ اور کہتے ہیں یہ (پیغمبر) اپنے پروردگار کی طرف سے ہمارے پاس کوئی نشانی (معجزہ) کیوں نہیں لاتے کیا ان کے پاس پہلی کتابوں میں نشانی نہیں پہنچی؟ ﴿۱۳۳﴾ اور اگر ہم ان کو (پیغمبر کے بھیجنے سے) پہلے عذاب سے ہلاک کر دیتے تو یہ لوگ ضرور کہتے کہ اے ہمارے پروردگار! آپ نے ہمارے پاس کوئی پیغمبر کیوں نہ بھیجا سو ہم ذلیل و خوار ہونے سے پہلے آپ کے کلام (احکام) کی پیروی کرتے ﴿۱۳۴﴾ فرما دیجیے کہ ہر کوئی (اعمال کے نتیجہ کے لیے) انتظار کر رہا ہے سو تم بھی انتظار کرو پس عنقریب تم کو (بھی) معلوم ہو جائے گا کہ راہِ راست والے کون ہیں اور کون ہے جو (منزلِ) مقصود تک پہنچا ﴿۱۳۵﴾

تفسیر و معارف

گناہوں پر فوری گرفت نہ کرنا، اللہ کا احسان ہے:

گزشتہ آیات میں یہ بات زیر بحث تھی کہ اللہ کے ذکر سے اعراض اور اعمال میں حد سے گزر جانے پہ آخرت میں اور دنیا میں کیا سزائیں مرتب ہوتی ہیں۔ یہ بھی ارشاد فرمایا گیا کہ لوگ اپنے سے پہلے گزری ہوئی قوموں کا حشر دیکھتے ہیں، اُن کی اجڑی ہوئی بستیوں میں سے گزرتے ہیں تو نصیحت کیوں نہیں حاصل کرتے؟

فرمایا: وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَكَانَ لِزَامًا وَّاَجَلٌ مُّسَمًّى ﴿۱۲۹﴾ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پروردگار کی طرف سے یہ طے نہ کر دیا گیا ہوتا کہ انسانوں کو ایک مدت تک مہلت ملے گی تو اللہ کی نافرمانی اتنا بڑا جرم ہے کہ ان پر فوراً عذاب نازل ہو جاتا۔ انسان یہ سمجھتا ہے کہ خیر ہے اگر چھوٹا سا گناہ ہو گیا، معمولی سی بات ہے، ایک وقت کی نماز قضا ہو گئی تو کوئی بڑی بات نہیں، چند روزے چھوڑ دیے تو خیر ہے۔ اللہ کریم

فرماتے ہیں کہ اللہ کی اطاعت نہ کرنا اتنا بڑا جرم ہے کہ پہلے جرم پر ہی عذاب وارد ہو جاتا یعنی انسان کو بار بار نافرمانی یا انکار کرنے کی فرصت ہی نہ ملتی۔ یہ اللہ کریم کا طے شدہ پروگرام ہے کہ اس نے لوگوں کو ایک خاص مدت تک کے لیے مہلت دے دی اور اس کا احسانِ عظیم ہے کہ اس نے توبہ جیسی نعمت عطا کر دی۔ انسانوں کو دعوت دی جا رہی ہے کہ تم کتنی خطائیں بھی کر چکے ہو تو کم از کم پہلی قوموں کے آثار دیکھ کر، اُن کے انجام سن کر، اُن کا کردار اور اس پر نازل ہونے والے عذاب کا سن کر توتوبہ کر لو اور اللہ کے عذابوں سے بچا جاؤ۔ یہ اللہ کا احسان ہے ورنہ سزا دینے کے لیے گناہ پر مہلت دینا ضروری نہیں تھا۔ جب کوئی گناہ کرتا اس پر عذاب نازل ہو جاتا لیکن وہ ایسا کریم ہے کہ اس نے انسانوں کو مہلت دی۔

دنیا میں دیکھا جا سکتا ہے کہ کوئی سرکاری ملازم اگر غلطی کرتا ہے تو اس پر اسی وقت گرفت ہو جاتی ہے۔ یہ کوئی نہیں سوچتا کہ اسے مہلت دو کہ دو غلطیاں اور کر لے۔ اسی طرح ذاتی ملازمین کو بھی غلطی کرنے پر ہم یہ مہلت نہیں دیتے کہ خیر ہے دو چار غلطیاں اور کرنے دو، ایسا کوئی نہیں کرتا۔

یہ اللہ کا احسان اور کرم ہے کہ وہ انسانوں کے گناہوں پر فوری گرفت نہیں فرماتے بلکہ ایک طے شدہ وقت تک مہلت عطا فرماتے ہیں کہ شاید یہ توبہ کر لیں۔

مشرکین و کفار کا ایک جرم تو کفر و شرک تھا اور دوسرا آپ صلی اللہ علیہ وسلّم پر طعن و تشنیع کرنا۔ وہ کہتے تھے کہ اگر گناہوں پر عذاب ہوتا ہے جیسا کہ (آپ صلی اللہ علیہ وسلّم) فرماتے ہیں تو پھر ہم تو گناہ اور شرک کر رہے ہیں ہم پر عذاب کیوں نہیں ہوتا؟ حتیٰ کہ اہلِ مکہ نے بیت اللہ کے پردے تھام کر دعا کی تھی کہ اگر یہ حق ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلّم) فرما رہے ہیں تو اے اللہ تُو ہم پر پتھر برسا دے یا اس سے بھی بڑا عذاب بھیج دے۔ اگر اللہ کریم کی طرف سے یہ فیصلہ نہ ہو چکا ہوتا کہ ایک مدت تک مہلت دی جائے گی تو گناہوں پر فوراً عذاب نازل ہو جاتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی نافرمانی کے ساتھ اُن پر تنقید کرنا دوہرا جرم ہے۔ نبیؐ اور اُمتی کا تعلق یہ ہے کہ اُمتی کے لیے ایک ہی دلیل کافی ہے کہ یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمائی ہے۔ اس کی تحقیق ضروری ہے اور کی جانی چاہیے کہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہی ہے اور جب ثابت ہو جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ہے تو کسی دوسری دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔

آج مسلمانوں کا حال:

کفار تو مذاق اڑاتے تھے لیکن مسلمانوں کا عجیب حال ہے کہ کسی تک حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد پہنچے اور پھر وہ اس میں وجہ تلاش کرے کہ ایسا حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے کیوں فرمایا تو ایسا کرنا جرم بن جاتا ہے۔ آج ہماری یہ

عادت بن چکی ہے کہ ہر بات کی وجہ تلاش کرنے لگ جاتے ہیں یہاں تک کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی بارگاہ عالی پر بھی سوال کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ایسا کیوں فرمایا۔ یہ بڑا نازک مقام ہے۔ نبیؐ اور امتی کا تعلق: سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا۔۔۔ ہونا چاہیے کہ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشادِ عالی سنا اور ہم نے مکمل اطاعت کر لی۔

طعن و تشنیع سے حفاظت کا نسخہ:

کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلّم پر طعن و تشنیع بھی کرتے تھے اور مذاق بھی اڑاتے تھے اس کے جواب میں اللہ کریم آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کو ارشاد فرما رہے ہیں: فَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ۔۔۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ان کی باتوں پر صبر کیجیے اور: وَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ قَبۡلَ طُلُوۡعِ الشَّمۡسِ وَقَبۡلَ غُرُوۡبِہَا ۚ وَمِنۡ اٰنَآیِٔ الَّیۡلِ فَسَبِّحۡ وَاَطۡرَافَ النَّہَارِ لَعَلَّکَ تَرۡضٰی ﴿۱۳۰﴾ سورج کے طلوع ہونے سے پہلے، یعنی دن شروع ہونے سے پہلے، اور سورج کے غروب ہونے سے پہلے یعنی رات کے شروع ہونے سے پہلے بھی اپنے پروردگار کی تسبیح کیجیے۔ گویا ان اوقات میں فجر اور عصر آ گئے، اور اٰنَآیِٔ الَّیۡلِ۔۔۔ رات کی تنہائیوں میں بھی، رات کے اوقات میں بھی فَسَبِّحۡ وَاَطۡرَافَ النَّہَارِ۔۔۔ اور دن کے اطراف میں بھی اللہ کریم کی تسبیح بیان کیجیے، اللہ کی پاکی اور عظمت بیان کیجیے۔ لَعَلَّکَ تَرۡضٰی۔۔۔ تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم خوش ہو جائیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طبیعت بشاش رہے لہٰذا یہ بات یقینی ہے کہ دنیوی رنج والم لوگوں کی طعن و تشنیع آمیز باتیں، اُن کے اعتراضات اور خرافات سے پیدا ہونے والی پریشانی سے محفوظ رہنے کے لیے ذکر اللہ کیا جائے، اللہ کی حمد و ثنا کی جائے، نماز بروقت ادا کی جائے تو یہ اس پریشانی اور تکلیف سے بچا لیتی ہے اور دل پریشان نہیں ہوتا۔ لوگوں کی تو عادت ہوتی ہے بے جا اعتراضات کرنے کی، تو کرتے رہیں، اُن کی باتوں پر توجہ دینے کی بجائے اللہ کو یاد کرے۔ فرمایا جب آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) اللہ کا ذکر کرتے ہیں صبح شام اللہ کو یاد کرتے ہیں، دن کے شروع ہونے سے پہلے، رات کے شروع ہونے سے پہلے اور رات کی تنہائیوں میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں، اللہ کی بارگاہ میں سربسجود ہوتے ہیں تو یہ اس ساری تھکن کو اتار دیتا ہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کی طبیعت کو بشاش کر دیتا ہے۔ اس سے آپ (صلی اللہ علیہ وسلّم) کے قلب پر تازگی آ جاتی ہے اور لوگوں کے طعن و تشنیع اُسے زخمی نہیں کرتے، اس لیے کہ اس کے سامنے ذکرِ الٰہی ڈھال بن جاتا ہے۔

علماء اسی آیہ مبارکہ سے نماز پنجگانہ کی ترتیب ثابت کرتے ہیں، اور اس ترتیب سے نہ دن ذکر سے خالی رہتا ہے نہ رات ذکر سے خالی رہتی ہے اور ان کی برکت سے انسان کا دل پریشان نہیں ہوتا اور اس پر بشاشت آ جاتی ہے۔ جو اعتراضات، طعن و تشنیع کرتے ہیں اُن کا مقصد تو پریشان کرنا ہوتا ہے لہٰذا ان کا وار خالی جاتا ہے اس کا مطلب ہے کہ

نمازیوں کو۔۔۔تو چڑچڑا نہیں ہونا چاہیے، خوش اخلاق اور ہر وقت خوش باش ہونا چاہیے۔ چڑچڑاپن تو تب آتا ہے جب لوگوں کے طعنے اور اعتراض طبیعت پر اثر انداز ہو جاتے ہیں اُن کے اثر سے مزاج میں چڑچڑاپن آجاتا ہے۔

آج کے نمازیوں کا حال:

آج ہماری مصیبت یہ ہے کہ الحمد للہ ہم نماز پنجگانہ ادا کرتے ہیں، تہجد بھی ادا کرتے ہیں، اذکار بھی کرتے ہیں لیکن پریشانی ختم نہیں ہوتی اور وہ بشاشت جس کا وعدہ قرآن کریم فرما رہا ہے وہ دلوں پر نہیں آتی۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ بشاشت ہمیں کیوں نصیب نہیں ہوتی؟ دراصل ہماری یہ عادت ہے کہ ہم ہر کام کو Routine بنا لیتے ہیں جیسے ایک ورزش ہو۔ اگر ورزش (Excercise) کو بھی Routine بنا لیا جائے تو وہ بھی موثر نہیں رہتی۔ مثلاً اگر آپ ایک ورزش کا عمل دس مرتبہ روزانہ کرتے ہیں اور اس کو Routine بنا لیں کہ دس مرتبہ ہی روزانہ کریں تو پھر اس کا فائدہ نہیں ہوگا، کیونکہ بدن اس کا عادی ہو جائے گا۔ اس لیے بہتر یہ ہوگا اگر کسی دن آٹھ مرتبہ کر لیا جائے کسی دن دس یا بارہ مرتبہ کر لیں اُسے Routine نہ بننے دیں۔ ہمارا رویہ نمازوں کے ساتھ بھی یہی ہے کہ ہم انہیں Routine بنا لیتے ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم نماز کو Routine نہ بنائیں، ہر نماز پورے دھیان اور پوری یکسوئی سے ادا کریں کبھی کسی نماز کے ساتھ دو چار رکعت نفل زیادہ ادا کر لیں، کسی نماز کے ساتھ تلاوت کا اہتمام کر لیں۔ اگر کبھی تھک گئے ہیں تو نوافل چھوڑ دیں لیکن فرائض و واجبات اور سنن کا اہتمام رکھیں۔ ہم نماز کو یکسوئی سے ادا کر نہیں پاتے کیونکہ Routine نائی ہوتی ہے، عادت بنا لیتے ہیں اس لیے سوچ کچھ رہے ہوتے ہیں اور سجدے بھی کرتے رہتے ہیں۔ جب نماز بطور نماز ادا کریں گے تو وہ طعن و تشنیع سے ڈھال بن جائے گی اور طبیعت کو بھی خوش کر دے گی۔ اس کا علاج یہ ہے کہ نماز جب ادا کریں تو اس طریقے سے ادا کریں کہ یہی میری پہلی نماز ہے اور یہی میری آخری نماز بھی ہو سکتی ہے، لہٰذا نماز با قاعدہ ادا کی جائے۔ یہ سمجھا جائے کہ آج تک جو نمازیں پڑھیں کیا پتا وہ قبولیت کے قابل تھیں بھی یا نہیں تو آج نئے سرے سے توبہ کر کے نئے سرے سے نماز ادا کرتا ہوں۔ پھر یہ بھی خیال آئے کہ شاید اگلی نماز سے پہلے زندگی ہی ساتھ چھوڑ دے اور یہ میری زندگی کی آخری نماز ہو۔ جبکہ Routine کی نماز میں انسان جلدی جلدی میں وضو بھی صحیح نہ کرے اور نماز کے ارکان بھی ایسے ادا کرے کہ رکوع میں جا کر قیام کی طرف نہ لوٹے اور دھڑام سے سجدے میں جا گرے، پھر مرغ کی طرح چونچیں مارے، جلسہ بھی پورا نہ کرے اور جلدی جلدی ختم کر کے مسجد سے نکل جائے۔ مسجد کے باہر خواہ آدھا گھنٹہ کسی سے گپ لگا لے۔ نماز عادتاً نہیں بلکہ با قاعدہ ادا کی جانی چاہیے اور اپنے قلب کو جانچتے رہنا چاہیے کہ کیا ہماری نماز سے، تلاوت اور اذکار سے اس میں بشاشت آ رہی ہے؟

دنیوی دولت واقتدار کفار کے لیے آزمائش ہیں:

فرمایا: وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴿١٣١﴾ ان چیزوں کی طرف آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نگاہ نہ کیجیے جو ہم نے ان کفار کو یا نافرمانوں کو دنیوی دولت، عہدے یا جاہ حشم دے رکھی ہیں، یہ سب تو: زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۔۔۔ظاہری زندگی کی چیزیں ہیں اور یہ دنیاداروں کو اس لیے دی جاتی ہیں: لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ کہ یہ ان سب کی آزمائش اور امتحان ہیں کہ اتنے وسائل پا کر وہ ان وسائل کو اللہ کے حکم کے مطابق، اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں یا اپنی من مانی کرتے ہیں۔ان کی پروانہ کیجیے۔البتہ: وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ﴿١٣١﴾ جو رزق آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو پروردگار نے دیا ہے، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بہت بہتر ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے۔

حلال رزق باقی رہنے والا ہے:

دنیا میں جسے بھی رزقِ حلال میسر ہوتا ہے اور اس سے وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے تو اس کے اثرات اور نتائج تو قیامت میں بھی اس کے کام آئیں گے، تو یہ دائمی رزق ہو گیا۔ بندۂ مومن کو جو حلال اور جائز وسائل سے رزق ملتا ہے، وہ تھوڑا ہو یا زیادہ یعنی تھوڑا بھی مل سکتا ہے اور زیادہ بھی، لیکن جس کو جتنا ملے، اُسے اس پر راضی اور خوش رہنا چاہیے کہ اللہ کریم نے جو جائز وسائل سے رزق دیا ہے وہ ہمیشہ رہنے والا ہے۔ جائز اور حلال ذرائع سے جو رزق حاصل ہوا وہ جائز اور حلال امور پر خرچ ہوا تو یہ ایک دائمی رزق کیونکہ یہ صرف دنیا کا رزق نہ رہا بلکہ یہ تو آخرت بھی سنوار گیا اور آخرت میں آرام دے گیا۔ جو دولتِ دنیا ناجائز ذرائع سے آتی ہے وہ دنیا میں تو شاید آرام پہنچاتی ہو، مال ودولت، عہدہ مل گیا لیکن جب اس پر نتائج مرتب ہوں گے تو آخرت میں وبالِ جان بن جائے گا۔

مومن کو جو حلال رزق ملتا ہے اس پر اُسے قناعت کرنی چاہیے کہ یہ اللہ کی مرضی ہے وہ کتنا عطا کرتا ہے۔ وہ خالق ہے اور وہی بدن کے ایک ایک ذرّے کو زندہ رکھنے والا ہے، ہماری ضروریات سے بھی آگاہ ہے اور اس کی بارگاہ میں کوئی کمی بھی نہیں ہے۔ اللہ کریم کے اندازے ہمیشہ صحیح ہوتے ہیں اور وہ اپنے اندازے سے دیتا ہے جبکہ ہمارے اندازے ہمارے اوہام ہوتے ہیں جو غلط ہوتے ہیں اس لیے کہ ہمارا علم یقینی نہیں ہوتا۔ ہمارا علم محض ایک وہم ہوتا ہے کہ ایسا نہ ہو جائے یا ویسا نہ ہو جائے، تو بہتر ہے حلال ذرائع اختیار کیے جائیں اور محنت سے کمائیں اور اللہ سے دعا کریں کہ آسانیاں دے کہ یہ بھی عبادت ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ جتنا رزق اللہ کی طرف سے ملے اس پر شاکر رہیں کہ وہ دونوں جہانوں میں خیر بھی ہے اور ہمیشہ رہنے والا بھی ہے۔

اہلِ خانہ کی تربیت گھر کے سربراہ کی ذمہ داری ہے:

فرمایا: وَأْمُرْ أَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔۔۔اپنے اہل کو بھی نماز کا حکم دیجیے، نماز پر کاربند کیجیے۔ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا۔۔۔اور پہلے خود اس پر کاربند ہو جائیے۔ جو بزرگ خود نماز ادا نہیں کرتے اور بچوں کو جھڑکتے رہتے ہیں کہ نماز پڑھو، وہ بچے کبھی متاثر نہیں ہوتے۔ قرآن کریم نے یہ اصول بتایا ہے کہ جو نیکی بچوں کو تعلیم کرنا چاہتے ہو، اس پر خود قائم رہو، خود عبادت کرو، نمازیں باقاعدگی سے ادا کرو کہ اگر کوئی کام آپ خود نہیں کرتے وہ صرف آپ کے کہنے سے نہیں ہوگا۔

اہل خانہ کون ہیں؟

اہل سے مراد وہ افرادِ خانہ ہیں، جن کے اخراجات کا مدار اس بندے پر ہو۔ جیسے بیوی بچے ہیں یا گھر کے بزرگ ہیں جن کا مدار اس پر ہے، جس کی کمائی سے وہ پلتے ہیں۔ یہ سب اہل میں شامل ہیں۔

اللہ کریم بے نیاز ہے:

فرمایا: لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا ۖ نَحْنُ نَرْزُقُكَ۔۔۔اللہ کریم آپ سے کوئی دولت نہیں چاہتے کہ آپ بہت سی دولت کمائیں اور اُسے اللہ کی راہ میں خرچ کریں تو پھر اللہ کا کوئی مقصد پورا ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کو کسی کے رزق کی ضرورت نہیں نہ ہی اس کی راہ میں خرچ کرنے والا اس پر کوئی احسان کرتا ہے اس لیے کہ اللہ تو خود سب کا رازق ہے آج کل مسلمانوں نے بھی یہ روش اپنالی ہے جو کبھی کافروں کی تھی کہ فلاحی کاموں میں حصہ لیتے ہیں۔ ہسپتال بنوا دیتے ہیں، کنواں یا سڑکیں بنا کر سمجھتے ہیں کہ یہ اعمال کا متبادل ہو گیا۔ وطنِ عزیز میں ابھی تک ہندوؤں اور عیسائیوں کے بنائے گئے ہسپتال موجود ہیں تو کافر بھی یہ کوشش کرتے ہیں کہ وہ ایمان نہیں لائے تو کیا ہوا اپنا پیسہ تو اللہ کی راہ میں خرچ کر دیں۔ اللہ کریم فرماتے ہیں کہ اللہ کو ان چیزوں کی ضرورت نہیں، وہ تمہارے رزق کا محتاج نہیں وہ تو خود تمہیں رزق دینے والا ہے۔ تم اُسے رزق دے کر کیا راضی کرو گے؟ پہلے اپنا عقیدہ اور کردار درست کرو پھر تمہاری خیرات بھی نیکی شمار ہوگی۔ ہمیں تمہاری دولت کی ضرورت نہیں ہے روزی تو تمہیں ہم دیتے ہیں، تم ہم پر کون سا احسان کر رہے ہو؟ آج ہمارے ہاں بھی یہ بات عام ہے کہ فرائض کی پروا نہیں کی جاتی اور نوافل پر سارا زور رکھا جاتا ہے۔ حج کے فریضے کو ہی لیجیے کہ اگر صاحبِ استطاعت ہو تو پہلے حج ادا کرے کہ یہ فرض ہے جبکہ عمرہ نفل ہے اور اگر حیثیت یا استطاعت ہو تو جتنے چاہے عمرے ادا کرے۔ اب لوگوں نے حج چھوڑ دیا ہے اور صرف عمرے ادا کرتے رہتے ہیں اور اگر اُن سے پوچھا جائے کہ حج کا کیا ہوا، تو کہتے ہیں کہ اس کی فرصت نہیں ہے۔ گویا فرض ترک کر رکھا ہے اور نفل ہر سال ادا

کرتے ہیں۔ عمرہ کرنے سے استطاعتِ حج ثابت ہوگئی کہ حرم تک آنے جانے کے وسائل ہیں، صحت بھی ہے اور فرصت بھی، لیکن فرض ادا نہیں کرتے۔

اسی طرح یہ رواج ہوگیا ہے کہ لوگوں نے نماز، روزہ، زکوٰۃ ترک کررکھا ہے اور سود کھالیتے ہیں، حج نہیں کرتے، عمرے کرآتے ہیں کہ یہ خانہ پُری ہوگئی اور اللہ بھی راضی ہوگیا۔ اللہ کریم فرماتے ہیں ہیرا پھیری مت کرو، میری راہ میں خرچ کرکے مجھ پر احسان نہ کرو کہ تمہارے پاس جو دولت ہے، جو صحت و فرصت ہے، جتنے بھی وسائل ہیں وہ تو خود میں نے تمہیں عطا کیے ہیں۔ مجھے تمہاری دولت نہیں چاہیے اور تم دولت دے کر، ہسپتال بنا کر، یہ نہ سمجھو کہ یہ تمام اعمال کا متبادل ہوگیا۔

آخرت کا گھر متقین کے لیے ہے:

اللہ کی بارگاہ میں خلوص سے کی ہوئی اطاعت ہی قبول کی جاتی ہے، فرمایا: وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴿۱۳۲﴾ انجامِ کار اللہ کی اطاعت ہی کام آئے گی، جو پورے خلوصِ دل کے ساتھ کی گئی ہوگی۔ تقویٰ ایک کیفیت ہے، جو اطاعتِ الٰہی میں پائی جاتی ہے۔ جب بندہ اطاعت کرتا ہے تو اس میں جتنا اس کا خلوص شامل ہوتا ہے، جتنی کیفیت ہوتی ہے تو از خود اس کے دل پر مسرت سی چھا جاتی ہے کہ وہ اتباعِ نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) میں اللہ کی اطاعت کررہا ہے۔ یہ خیال کہ میں وہ کام کررہا ہوں، جو مجھے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کرنے کا حکم دیا ہے، اتنا خوش کن ہے کہ دل فوراً تشکر کے جذبات سے لبریز ہوجاتا ہے کہ اللہ کریم نے چودہ صدیوں کے بعد بھی مجھ تک میرے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشادِ عالی پہنچا دیا۔ اللہ کا مجھ پر کتنا احسان ہے کہ پھر مجھے توفیقِ عمل بھی دی اور میں اس پر عمل کررہا ہوں۔ اس سے دل پر بشاشت اور خوشی آتی ہے۔ آخرت کی کامیابی اس خلوص پر مرتب ہوگی جو اطاعتِ الٰہی میں کسی کو نصیب ہوگی۔ تقویٰ اس نسبت کا نام ہے جو دل کو اللہ سے نصیب ہوجائے اور انسان کام کرنے سے پہلے یہ فکر کرے کہ کہیں ایسا کرنے سے میرا تعلق میرے اللہ سے بگڑ تو نہیں جائے گا، اور پورے خلوص سے کام اس لیے کرے کہ اس سے اللہ مجھ سے راضی ہوں گے۔ اس دلی نسبت کو تقویٰ کہتے ہیں۔ فرمایا آخرت، دنیوی۔۔۔ دولت، عہدے یا آسائشوں پر مرتب نہیں ہوگی بلکہ صرف تقویٰ پر نصیب ہوگی۔ دولتِ دنیا، اقتدار اور مرتبے یہ دنیا کی آزمائش ہے اور جنہیں حکومت و سلطنت ملتی ہے انہیں بظاہر تو بڑی شان و شوکت ملتی ہے لیکن جب حساب ہوگا تو روزِ محشر اللہ کی بارگاہ میں ایک ایک شہری کے حقوق کے متعلق جوابدہ ہونا پڑے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دورِ خلافت میں چھبیس لاکھ مربع میل علاقہ فتح ہوا اور دس برس حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حکومت کی۔ انہوں نے ایسا مثالی عدل اور انصاف کیا کہ ان دس برسوں میں اسلامی

ریاست کے طول وعرض سے کسی کافر عورت کی بھی چیخ سنائی نہیں دیتی، کسی کافر بچے کے آنسو دکھائی نہیں دیتے نہ ہی کسی کافر بوڑھے کی آہ سنائی دیتی ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے جو عمل بھی کیا ہے، جتنی عبادت کی ہے، جتنا جہاد اور جتنا عدل کیا ہے، اس سارے کا اللہ مجھے کوئی اجر نہ دے اور مجھ سے حکمرانی کے بارے جواب طلبی نہ کرے تو میں راضی ہوں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ وہ ہستی ہیں جن کے عدل کی مثال دی جاتی ہے اور کتابوں میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ جب مسجد میں فجر کے وقت آپ رضی اللہ عنہ پر حملہ ہوا، اور آپ رضی اللہ عنہ زخمی ہو گئے اور پھر شکمِ مبارک پھٹ گیا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک یہودی جراح کو لینے کے لیے گئے اور اس کے پاس پہنچے تو اُسے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ وہ اپنی سواری تیار کرتا بلکہ کہا کہ وہ فوراً علاج کا سامان اٹھائے اور اُن کے ہی گھوڑے پر پیچھے سوار ہو جائے۔ تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ نے گھوڑا روک لیا اور اُسے کہا کہ اتر جاؤ اور واپس چلے جاؤ، اب تمہاری ضرورت نہیں۔ وہ جراح بہت حیران ہوا کہ پہلے آپ نے مجھے سواری بھی نہیں لینے دی اور اب کہہ رہے ہیں کہ واپس چلے جاؤ، آخر ماجرا کیا ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا وہ بکریاں دیکھ رہے ہو؟ وہ کسی اور کی ہیں اور جس کھیت میں چر رہی ہیں اس کا مالک کوئی اور ہے، اس کا مطلب ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو چکا ہے۔

اس آیہ مبارکہ میں یہی فرمایا گیا ہے کہ یقیناً آخرت کا گھر متقین کے لیے ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثتِ عالی بہت بڑا معجزہ ہے:

کفار کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کوئی ایسا معجزہ، ایسی نشانی ہمیں کیوں نہیں دکھاتے جس سے ہم مطمئن ہو جائیں۔ فرمایا: وَقَالُوا لَوْلَا يَأْتِينَا بِآيَةٍ مِّن رَّبِّهِ۔۔۔ کافر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم اُن کو مطمئن کرنے کے لیے کوئی نشانی کیوں نہیں لاتے تو فرمایا: أَوَلَمْ تَأْتِهِم بَيِّنَةُ مَا فِي الصُّحُفِ الْأُولَىٰ ﴿١٣٣﴾ یہ اعتراض تو کرتے ہیں لیکن کیا پہلی آسمانی کتابوں میں یہ نشانی موجود نہیں تھی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث ہوں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت ہی اس معجزے کے اثبات کے لیے کافی نہیں ہے؟ حالانکہ یہ سب کسی نہ کسی کی پیروی کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں، اگر چہ کرتے کفر ہیں۔ عرب کہتے تھے کہ ہم ملتِ ابراہیمی پر ہیں، یہودی کہتے ہم موسیٰ علیہ السلام کے پیروکار ہیں۔ عیسائی کہتے، ہم عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے ہیں تو ان سے پوچھا جائے کہ جو کتابیں ان انبیاؑ پر نازل ہوئیں کیا اُن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ذکرِ خیر نہیں تھا؟ اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ان کے سامنے مبعوث ہو بھی گئے تو اب اس سے بڑا معجزہ کیا ہوگا کہ صدیوں پہلے نازل ہونے والی کتابوں میں جو نشانیاں آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق دی گئیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلّم ان کے مطابق دنیا میں جلوہ گر ہوئے، مبعوث ہوئے تو کیا بعثتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلّم سب سے بڑی نشانی نہیں؟

حضرت مجددالفِ ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ:

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک افغانی آیا اور دو سال اُن کے پاس ٹھہرا رہا۔ ایک دن اُس نے واپس جانے کی اجازت مانگی تو انہوں نے فرمایا کہ تم دو سال رہے لیکن تم نے اپنے آنے کا مقصد بھی بیان نہیں کیا۔ فرماتے ہیں کہ میں نے پوچھنا مناسب نہیں سمجھا کہ کہیں تم یہ نہ کہو کہ مہمان داری سے اکتا گئے ہیں اس لیے پوچھ رہے ہیں۔ اب جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ مگر اپنے آنے کی وجہ بتاتے جاؤ۔ وہ کہنے لگا: میں اس لیے آیا تھا کہ میں نے سنا تھا کہ آپ بہت اللہ والے ہیں اور میں آپ سے اللہ اللہ سیکھوں گا۔ یہاں آ کر میں نے فیصلہ کیا کہ آپ کی کوئی کرامت دیکھوں گا پھر آپ سے سیکھوں گا۔ دو برس رہنے کے بعد میں نے کوئی کرامت نہیں دیکھی لہٰذا میں آپ سے رخصت چاہتا ہوں۔ آپ (رحمۃ اللہ علیہ) نے فرمایا کہ تم دو برس میرے ساتھ رہے، اور دو برس بڑا لمبا عرصہ ہوتا ہے تو اس عرصے میں کیا تم نے میری کوئی بات خلافِ سنت دیکھی ہے؟ اگر ہے تو مجھے بتاؤ تاکہ میں اس کی اصلاح کرلوں۔ وہ کہنے لگا کہ دو سال میں تو میں نے کوئی خلافِ سنت کام نہیں دیکھا تو وہ فرمانے لگے کہ تم اور کس بات کو کرامت کہتے ہو؟ سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ کوئی اتباعِ رسالت پناہی کے سانچے میں ڈھل جائے، اس سے بڑی کرامت کیا ہوگی!

بعثتِ عالی کے بعد کفار کے پاس انکار کا کوئی عذر نہیں:

فرمایا: وَلَوْ اَنَّآ اَهْلَكْنٰهُمْ بِعَذَابٍ مِّنْ قَبْلِهٖ لَقَالُوْا رَبَّنَا لَوْ لَآ اَرْسَلْتَ اِلَيْنَا رَسُوْلًا فَنَتَّبِعَ اٰيٰتِكَ مِنْ قَبْلِ اَنْ نَّذِلَّ وَنَخْزٰى ﴿۱۳۴﴾ یہ عجیب لوگ ہیں اگر ہم ان کے کفر و شرک پر ان کو پکڑ لیتے تو میدانِ حشر میں آ کر انہوں نے چیخنا تھا کہ اللہ آپ نے کیوں ہماری طرف کوئی نبیؑ یا رسولؑ نہیں بھیجا کہ ہم اس کا اتباع کر کے اس ذلت و خواری سے بچ جاتے اور آپ کی رضا کو پا لیتے۔ گویا اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلّم مبعوث نہ کیے جاتے تو پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر قیامت تک یہ دورِ فترت رہتا اور یہ سارے کافر پھر یہی چلاتے کہ اللہ آپ نے کوئی رسولؑ تو بھیجا نہیں عیسیٰ علیہ السلام کے دنیا سے جانے کے بعد، پھر ہم کس سے راہنمائی لیتے۔ اب جب اللہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کو بھیج دیا تو انہیں نئے اعتراض سوجھ رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت نے ان کا عذر ختم کر دیا ہے اور اب ان کے پاس قیامت میں یہ بہانہ نہیں رہا کہ اللہ کریم نے کوئی رسولؑ نہیں بھیجا۔ اب ان کے پاس بچنے کا کوئی راستہ ہی نہیں رہا، کوئی دلیل نہیں رہی، اب تو سوائے خلوصِ دل سے اتباع کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہیں رہا۔ قرآنِ کریم نے کتنا خوبصورت جواب دیا ہے، کہ یہ اللہ کا کلام ہے اور اس کی شان کو ایسا ہی زیبا ہے۔ فرمایا کہ

آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات والاصفات سرتاپا معجزہ ہے، اللہ کی نشانی ہے اور جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ کریم میں معجزہ نظر نہیں آتا، اس کے لیے پھر اور کوئی معجزہ بھی ہدایت کا سبب نہیں بن سکتا۔

آج ہم بھی نعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلّم کہنے کی سعادت حاصل کرتے ہیں لیکن ہم کیا اور ہماری کوشش کیا، ہم بھلا کیا تعریف کر سکتے ہیں؟ کسی چیز کی تعریف یا تنقید کے لیے اُسے کماحقہ سمجھنا پڑتا ہے۔ کہاں ذاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور کہاں آج کا انسان، ہماری تو سوچیں شل ہو جاتی ہیں۔ نعت تو اللہ کریم نے ارشاد فرمائی۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذات سے بڑا معجزہ کون سا ہوگا؟ جن کی ہر ادا ایک معجزہ ہے، جن کا وجودِ عالی جن کا رخِ انور، جن کی نشست و برخاست، جن کی گفتگو، ہر ایک معجزہ ہے اور صدیوں سے اللہ کی کتابیں ان کے بارے میں خبر دیتی آ رہی ہیں۔ اب اس سے بڑا معجزہ کیا چاہتے ہو؟ سورج طلوع ہونے پر تم شمع جلانے کا مطالبہ کر رہے ہو تو اگر تمہیں سورج کی روشنی نظر نہیں آتی تو پھر شمع کیا کرے گی؟

موت فیصلہ کر دے گی:

فرمایا: قُلْ كُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا ۚ فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحٰبُ الصِّرَاطِ السَّوِيِّ وَمَنِ اهْتَدٰى ﴿١٣٥﴾ فرما دیجیے کہ ہر شخص اپنے کام کا نتیجہ پانے کا انتظار کرتا ہے۔ اگر کوئی تجارت کرتا ہے، کہیں سرمایہ لگاتا ہے تو اس سے حاصل ہونے والے نفع و نقصان کا انتظار کرتا ہے۔ تم بھی انتظار کرو اس پھل کا جو تمہاری سوچوں اور فکروں نے کاشت کیا ہے۔ بہت جلد یہ فیصلہ بھی ہو جائے گا کہ کون راہ راست پر تھا اور منزلِ مقصود پر پہنچا، اور کون بھٹک گیا اور گمراہ ہو کر تباہ ہوا۔ یہ کوئی لمبا وقفہ نہیں ہے، موت کو آنے دو۔ قبر میں جانے سے پہلے ہی مرنے والے کو پتا چل جائے گا۔ اگر تم میرا اتباع نہیں کرتے، میری بات نہیں مانتے تو پھر انتظار کر لو، جب موت آئے گی تو پتا چل جائے گا۔

بڑی سادہ سی بات ہے کہ زندگی نام ہے اتباعِ رسالت کا، جب جب ہم سے دامانِ رسالت صلی اللہ علیہ وسلّم چھوٹ جاتا ہے تو یہ زندگی نہیں، موت بھی نہیں بلکہ موت سے بھی بدتر حالت ہوتی ہے۔ موت کم از کم کوئی برائی تو نہیں کراتی، زندگی کو ختم کر دیتی ہے یہ تو موت سے بھی زیادہ بُری چیز ہے۔ اللہ کریم توفیقِ عمل عطا فرمائیں۔

بے شمار لوگوں کی اصلاح کا سبب بننے والی قرآن تفسیر

حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کی

اردو تفسیر آڈیو، وڈیو اور لکھی ہوئی تینوں طرح کی دیکھیں، سنیں یا ڈاؤن لوڈ کریں۔

پنجابی تفسیر وڈیوز دیکھیں ڈاؤن لوڈ کریں۔ قرآن کا اردو ترجمہ اور کتابیں ڈاؤن لوڈ کریں۔

قرآنِ کریم کی تلاوت اور حضرت صاحب کا اردو ترجمہ آڈیو۔ کمپیوٹر اور موبائل پر سننے کے لیے ڈاؤن لوڈ کریں۔ حضرت جی کا کلام حمد اور نعتیں آڈیو وڈیو سنیں اور ڈاؤن لوڈ کریں۔

دلچسپ سوال جواب پر مشتمل ٹی وی پروگرام اَلمرشد کی تمام 125 اقساط کی وڈیوز دیکھیں

www.QuranTafseer.net

حضور نبی پاکؐ کے حضور آج بھی روحانی طور پر حاضری ممکن ہے اور ہزاروں مرد و خواتین یہ سعادت رکھتے ہیں۔ لیکن کیسے؟

تصوف تزکیہ روحانیت ، ذکر، روحانی سلسلہ ،روح، کشف، بیعت ان تمام موضوعات کو سمجھنے کے لیے حضرت مولانا اکرم اعوان مدظلہ العالی کے وڈیو بیانات اور کتابیں موجود۔

طریقۂ ذکر جس سے دل سے لے کر جسم کا ہر باڈی سیل اللہ اللہ ذکر کرنے لگ جائے۔

حضور نبی پاک ﷺ کے حضور روحانی طور پر حاضری کی سعادت۔

یہ سب کچھ سمجھنے کے لیے اور مکمل رہنمائی کے لیے ویب سائیٹ وزٹ کریں۔

اس پوسٹ کو زیادہ سے زیادہ شیئر کر کے آپ بھی اس نیک کام کا حصہ بنیں۔